اُردو کا کلاسیکی ادب

کُلّیاتِ نظمِ حالی

جلد اوّل

از

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

مرتبہ

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

مجلسِ ترقّی ادب ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : جولائی ۱۹۶۸ع

تعداد : ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : ایس - ایم - شفیق

مطبع : شفیق پریس ۲۵ کبیر سٹریٹ لاہور

سرورق : مطبعِ عالیہ ۱۲۰/۵ ٹمپل روڈ ، لاہور

قیمت : [redacted]

بعونِ صناعِ مکین و مکان بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

۸۲

اردو کا کلاسیکی ادب

کلیاتِ نظمِ حالی

جلد اول

مرتبہ

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

ناشر

مجلسِ ترقیِ ادب ۲- نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

اِنتساب

به قبله گاهِ ادب، حضرتِ وقار عظیم
سزد که نذر کنم کُلّیاتِ حالی را
که اُو زسادگی و دردمندی و اخلاص
فروغ داد، چو شعرش، صفاتِ حالی را

نیازمند

ترتیب

کلیات نظم حالی

جلد اول :

۱ - فہرست مشمولات جلد اول
۲ - مقدمہ از مرتب
۳ - ترجمۂ حالی (خود نوشت سوانح عمری) از مولانا حالی
۴ - دیباچہ مسدس مد و جزر اسلام ,,
۵ - مکتوب سرسید (بنام مولانا حالی)
۶ - دیباچہ ضمیمۂ مسدس از مولانا حالی
۷ - دیباچہ دیوان حالی ,,
۸ - دیباچہ مجموعۂ نظم حالی ,,
۹ - فصل اول ـــ غزلیات
۱۰ - فصل دوم ـــ قطعات و رباعیات
۱۱ - فصل سوم ـــ قصائد و منظومات مدحیہ ، سپاسیہ ، وداعیہ وغیرہ
۱۲ - فصل چہارم ـــ مراثی
۱۳ - فصل پنجم ـــ جدید شاعری (درسی ، اخلاق ، مناظراتی نظمیں)
۱۴ - فصل ششم ـــ بچوں کی نظمیں

جلد دوم :

۱ - فہرست مشمولات جلد دوم
۲ - فصل ہفتم ـــ ہمدردیِ نسواں
۳ - فصل ہشتم ـــ قومی و ملی نظمیں
۴ - فصل نہم ـــ تعلیمی و اصلاحی نظمیں (متعلق بہ علی گڑھ تحریک)
۵ - فصل دہم ـــ تراجم

۶ - فصل یازدہم۔متفرقات و تبرکات حالی (غیر مدون و غیرمطبوعہ کلام)
۷ - ضمیمہ (۱)۔۔۔دیباچہ ضمیمہ آردو کلیات نظم حالی۔۔۔از مولانا حالی
۸ - ضمیمہ (۲)۔۔۔کلام فارسی
۹ - ضمیمہ (۳)۔۔۔کلام عربی
۱۰ - ضمیمہ (۴)۔۔۔کتابیات

★

فہرست

مشمولات جلد اول

مقدمہ : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ۲۱ تا ۷۸
ترجمۂ حالی (خود نوشت سوانح عمری) مولانا الطاف حسین حالی ۱
دیباچہ مسدس مد و جزر اسلام ،، ۲۰
مکتوب سرسید بنام مولانا حالی سرسید احمد خاں ... ۲۸
دیباچہ ضمیمۂ مسدس مولانا الطاف حسین حالی ... ۳۰
دیباچہ دیوان حالی ،، ... ۳۴
دیباچہ مجموعۂ نظم حالی ،، ... ۵۱

فصل اول ـــ غزلیات ۵۵ تا ۱۷۰

(الف) غزلیات قدیم (۱۸۶۳ تا ۱۸۷۴ع)

ماخذ : دیوان حالی طبع اول ۱۸۹۳ع) ۵۷ تا ۸۵

ردیف الف

۱ - پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا ... ۵۷
۲ - خلوت میں تری صوفی گر نور صفا ہوتا ... ۵۸
۳ - پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا ... ۵۹
۴ - رنج اور رنج بھی تنہائی کا ... ۶۰
۵ - اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا ... ۶۱
۶ - دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا ... ۶۲
۷ - قلق اور دل میں سوا ہو گیا ... ۶۳
۸ - سنگ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا ... ۶۳

ردیف ب

۹ - مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب ... ٦۴

ردیف ت

۱۰ - بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت ... ٦۵

ردیف ز

۱۱ - عہد وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز ... ٦٦

ردیف م

۱۲ - آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم ... ٦٦

ردیف ن

۱۳ - ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ... ٦۷
۱۴ - پیا ہم نے نہ جام بے کدورت بزم دوراں میں ... ٦۸
۱۵ - اب وہ اگلا سا التفات نہیں ... ٦۹
۱٦ - کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غم ہجراں میں نہیں ... ۷۰
۱۷ - غم فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں ... ۷۱
۱۸ - میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں ... ۷۲
۱۹ - کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ... ۷۳

ردیف و

۲۰ - مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو ... ۷۳

ردیف ہ

۲۱ - حقیقت محرم اسرار سے پوچھ ... ۷۴

ردیف ی

۲۲ - حق وفا کے جو ہم جتانے لگے ... ۷۵

۲۳ - حشر تک یاں دل شکیبا چاہیے ... ۷۶
۲۴ - جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے ... ۷۷
۲۵ - جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے ... ۷۸
۲۶ - کر دیا خوگر جفا تو نے ... ۷۹
۲۷ - کرکے بیمار دی دوا تو نے ... ۸۰
۲۸ - دل کو درد آشنا کیا تو نے ... ۸۰
۲۹ - نہ واں پرسش نہ یاں تاب سخن ہے ... ۸۲
۳۰ - دھوم تھی اپنی پارسائی کی ... ۸۴

(ب) غزلیات جدید (۱۸۷۴ تا ۱۸۹۳ع)

ماخذ : دیوان حالی طبع اول ۸۶ تا ۱۶۱

ردیف الف

۱ - قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا ... ۸۶
۲ - کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا ... ۸۷
۳ - ربڑ میں دشت جنوں کی تیرے عجب مزاخوش‌گوار دیکھا ... ۸۸
۴ - یا ملکی‌الصفات یا بشری القوی ... ۸۹
۵ - اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا ... ۹۱
۶ - دیکھ اے امید کیجو ہم سے نہ تو کنارا ... ۹۲
۷ - رونا نہ ہوگا حالی شاید یہ کم تمھارا ... ۹۳
۸ - وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا ... ۹۴
۹ - جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا ... ۹۵
۱۰ - ہو عزم دیر شاید کعبے سے پھر کر اپنا ... ۹۶
۱۱ - معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا ... ۹۷
۱۲ - نفس دعوی بے گناہی کا سدا کرتا رہا ... ۹۷
۱۳ - کہیں الہام منوانا پڑے گا ... ۹۸
۱۴ - سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا ... ۹۹
۱۵ - کب تک اے ابر کرم ترسائے گا ... ۱۰۰

۱۶ - واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا ... ۱۰۱
۱۷ - کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا ... ۱۰۲
۱۸ - راحت کا جہاں میں یونہی اک نام ہے گویا ... ۱۰۳

ردیف ب

۱۹ - درد دل کو دوا سے کیا مطلب ... ۱۰۳

ردیف پ

۲۰ - یہ ہیں واعظ سب پہ منہ آتے ہیں آپ ... ۱۰۴

ردیف ت

۲۱ - گو جوانی میں تھی کج رائی بہت ... ۱۰۵
۲۲ - اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت ... ۱۰۶

ردیف ٹ

۲۳ - تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ ... ۱۰۷

ردیف ث

۲۴ - باپ کا ہے جبھی پسر وارث ... ۱۰۸
۲۵ - بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث ... ۱۰۹

ردیف ج

۲۶ - بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج ... ۱۰۹
۲۷ - تلخیٔ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج ... ۱۱۰

ردیف چ

۲۸ - بزم مے اچھی ہے، گو دنیا ہے اے مےخوار ہیچ ... ۱۱۱

ردیف ح

۲۹ - کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح ... ۱۱۲

ردیف خ

۳۰ - مے، مغاں کا ہے چسکا اگر برا اے شیخ ... ۱۱۳

ردیف د

۳۱ - شادی کے بعد غم ہے ، فقیری غنا کے بعد ... ۱۱۳
۳۲ - کبھیں خوف اور کبھیں غالب ہے رجا اے زاہد ... ۱۱۴

ردیف ذ

۳۳ - پیاس تیری بوے ساغر سے لذیذ ... ۱۱۵

ردیف ر

۳۴ - ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر ... ۱۱۵
۳۵ - کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر ... ۱۱۶
۳۶ - ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر ... ۱۱۷

ردیف ڑ

۳۷ - گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ ... ۱۱۸

ردیف ز

۳۸ - جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز ... ۱۱۹
۳۹ - رنجش و التفات و ناز و نیاز ... ۱۲۱

ردیف س

۴۰ - جاذب رحمت ہے مقناطیس عصیاں اپنے پاس ... ۱۲۴

۴۱ - چھیڑ اب نہ اے تصور مژگان یار بس ... ۱۲۴

ردیف ش

۴۲ - اک ہم کو مہم بر سر ایام ہے درپیش ... ۱۲۵

ردیف ص

۴۳ - ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص ... ۱۲۶
۴۴ - درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص ... ۱۲۶

ردیف ض

۴۵ - عشق کو ترک جنوں سے کیا غرض ... ۱۲۷
۴۶ - دوست کا ناروا نہیں اعراض ... ۱۲۷

ردیف ط

۴۷ - رات گزری ہو چکا دور نشاط ... ۱۲۹

ردیف ظ

۴۸ - چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ ... ۱۲۹

ردیف ع

۴۹ - اے بہار زندگانی الوداع ... ۱۳۰

ردیف غ

۵۰ - کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ ... ۱۳۰

ردیف ف

۵۱ - حق نہ ملّا نے کچھ بتایا صاف ... ۱۳۱

ردیف ق

۵۲ - نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لائق ... ۱۳۱

ردیف ک

۵۳ - دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک ... ۱۳۲

ردیف گ

۵۴ - عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ ... ۱۳۳
۵۵ - صلح ہے اک مہلت سامان جنگ ... ۱۳۴

ردیف ل

۵۶ - ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل ... ۱۳۵

ردیف م

۵۷ - مدرسے میں دہر کے رو بر قفا بیٹھے تھے ہم ... ۱۳۶
۵۸ - خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم ... ۱۳۷

ردیف ن

۵۹ - یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں ... ۱۳۸
۶۰ - جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں ... ۱۳۹
۶۱ - کی تو ہیں ہم نے بھی حالی کوچ کی تیاریاں ... ۱۴۰
۶۲ - راز دل کی سر بازار خبر کرتے ہیں ... ۱۴۱
۶۳ - دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں ... ۱۴۲
۶۴ - بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں ... ۱۴۳
۶۵ - پھونکا ہے فصل گل نے صور آکے پھر چمن میں ... ۱۴۴
۶۶ - وحشت میں تھا خیال گل و یاسمن کہاں ... ۱۴۶

ردیف و

۶۷ - حکم ہے پیر مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ ... ۱۴۶

ردیف ہ

۶۸ - درِ فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ ... ۱۴۸

۶۹ - بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ ... ۱۴۸

ردیف ی

۷۰ - ہے اُن کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی ... ۱۵۰

۷۱ - کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے ... ۱۵۱

۷۲ - کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے ... ۱۵۲

۷۳ - ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے ... ۱۵۲

۷۴ - بری اور بھلی سب گزر جائے گی ... ۱۵۳

۷۵ - سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاق ... ۱۵۴

۷۶ - اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی ... ۱۵۴

۷۷ - رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی ... ۱۵۵

۷۸ - وصل کا اس کے دل زار تمنائی ہے ... ۱۵۶

۷۹ - اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے ... ۱۵۷

۸۰ - تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی ... ۱۵۷

۸۱ - جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تف کیجیے ... ۱۵۸

۸۲ - فکر فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی ... ۱۵۹

۸۳ - سعی سے بہتر تن آسانی مری ... ۱۵۹

۸۴ - پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے ... ۱۶۰

۸۵ - کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے ... ۱۶۰

۸۶ - ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے ... ۱۶۱

(ج) غزلیات دور آخر (۱۸۹۳ تا ۱۹۱۴ء)

ماخذ : جواہرات حالی (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) ۱۶۲ تا ۱۷۰

۱ - کہاں فکر میں اب وہ جولانیاں ... ۱۶۲

۲ - نفس کی فرماں روائی ہو چکی ... ۱۶۴

۳ - مستیِ جہل میں غفلت کا نشا اور سہی ... ۱۶۶

۴ - نہ عیش کیخسروی رہے گا، نہ صولت بہمنی رہے گی ... ۱۶۶

۵ - کہنے کی بات ہو تو اسے کہہ سنائیے ... ۱۶۸
۶ - وصف چمن قفس میں سنو عندلیب سے ... ۱۶۸
۷ - تیر پیہم لگائے جاتا ہے ... ۱۷۰

فصل دوم ۔ قطعات و رباعیات

(۱) قطعات (۱۸۷۴ تا ۱۸۹۳ع)

ماخذ : دیوان حالی ۱۷۳ تا ۲۱۵

(الف) تنقیدی :

۱ - شعر کی طرف خطاب ... ۱۷۳
۲ - مشاعرے کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر ... ۱۷۴
۳ - نکتہ چینی ... ۱۷۵
۴ - بے تمیزی ابنائے زماں ... ۱۷۵
۵ - چھوٹوں کا بڑا بن جانا ... ۱۷۶
۶ - دلی کی شاعری کا تنزل ... ۱۷۷
۷ - شعرا کو سلطنت میں دخل دینا ... ۱۷۸

(ب) سیاسی :

۸ - پولیٹیکل اسپیچیں ... ۱۷۹
۹ - آزادی کی قدر ... ۱۸۰
۱۰ - انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی ... ۱۸۰
۱۱ - نیشن کی تعریف ... ۱۸۱
۱۲ - کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان ... ۱۸۱
۱۳ - قانون ... ۱۸۲
۱۴ - تدبیر قیام سلطنت ... ۱۸۳
۱۵ - قوم کی پاس داری ... ۱۸۳

(ج) معاشرتی و اصلاحی :

۱۶ - بیٹیوں کی نسبت ... ۱۸۴
۱۷ - یقین ... ۱۸۵
۱۸ - استفادہ ... ۱۸۶

۱۹ - لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں	...	۱۸۶
۲۰ - عقل اور نفس کی گفتگو	...	۱۸۷
۲۱ - عادت کا غلبہ عقل پر	...	۱۸۸
۲۲ - حملۂ نفس	...	۱۸۹
۲۳ - جس قوم میں افلاس ہو اس میں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف	...	۱۸۹
۲۴ - برکت اتفاق	...	۱۹۰
۲۵ - بُعد صوری مانع قربِ معنوی نہیں	...	۱۹۰
۲۶ - امرا اور عقلا	...	۱۹۱
۲۷ - خوشامد کے معنی	...	۱۹۱
۲۸ - مغرور کی پہچان	...	۱۹۲
۲۹ - کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد	...	۱۹۲
۳۰ - اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا	...	۱۹۲
۳۱ - فضول خرچی کا انجام	...	۱۹۳
۳۲ - اختلاف مذاہب رفع نہیں ہو سکتا	...	۱۹۳
۳۳ - انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ مورد آفات ہے	...	۱۹۴
۳۴ - چنڈو بازی کا انجام	...	۱۹۴
(د) طنزیہ و مزاحیہ :		
۳۵ - تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر	...	۱۹۵
۳۶ - سید احمد خاں کی تکفیر	...	۱۹۵
۳۷ - قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت	...	۱۹۶
۳۸ - سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ	...	۱۹۸
۳۹ - قحط اہل اللہ	...	۱۹۸
۴۰ - سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید	...	۱۹۸
۴۱ - لوگ کسی کی خوبیاں سن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اس کے عیب سن کر	...	۱۹۹

۴۲ - اسراف ... ۲۰۰
۴۳ - پاس نیک نامی ... ۲۰۰
۴۴ - غرور نیک نامی ... ۲۰۰
۴۵ - خود ستائی ... ۲۰۱
۴۶ - رؤسائے عہد کی فیاضی ... ۲۰۲
۴۷ - ایمان کی تعریف ... ۲۰۳
۴۸ - شادی قبل از بلوغ ... ۲۰۴
۴۹ - حرص ... ۲۰۴
۵۰ - عصمت بی بی از بے چادری ... ۲۰۴
۵۱ - سچ کہاں ہے ... ۲۰۴
۵۲ - اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا ... ۲۰۵
۵۳ - بے اعتدالی ... ۲۰۵
۵۴ - طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے ... ۲۰۶

(ھ) حکایات و مطائبات :

۵۵ - ایک خود پسند امیر زادے کی تضحیک ... ۲۰۶
۵۶ - بدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی ... ۲۰۸
۵۷ - نوکروں پر سخت‌گیری کرنے کا انجام ... ۲۰۸
۵۸ - صفائی نہ رکھنے کا عذر ... ۲۱۰
۵۹ - سخن سازی ... ۲۱۰
۶۰ - شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ ... ۲۱۰
۶۱ - ناصح مخلص اور اہل غرض میں تمیز ... ۲۱۱
۶۲ - خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں ... ۲۱۲
۶۳ - خوشامد کرنے کی ضرورت ... ۲۱۲
۶۴ - رعیت پر نااہل کو مسلط کرنا ... ۲۱۳
۶۵ - رشک ... ۲۱۴
۶۶ - مرد اور عورت کی حکومت کا فرق ... ۲۱۵
۶۷ - گدائے مبرم ... ۲۱۵

(۲) رباعیات

ماخذ : رباعیات حالی (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) ۲۱۶ تا ۲۵۲

(الف) رباعیات قدیم (۱۸۶۳ع تا ۱۸۷۴ع) ۲۱۶ تا ۲۱۷
عدد ۱ تا ۷

(ب) رباعیات جدید (۱۸۷۴ع تا ۱۸۹۳ع) ۲۱۸ تا ۲۳۰
عدد ۸ تا ۱۰۸

(ج) رباعیات دور آخر (۱۸۹۳ع تا ۱۹۱۴ع) ۲۳۱ تا ۲۵۲
عدد ۱۰۹ تا ۱۶۰

فصل سوم ـ قصائد و منظومات مدحیہ ، سپاسیہ ، وداعیہ وغیرہ

۲۵۵ تا ۳۲۳

(الف) قصائد

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ		صفحہ
۱ ـ قصیدۂ نعتیہ	۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴-۶۵ع)	قصیدہ	دیوان	...	۲۵۵
۲ ـ قصیدۂ نعتیہ (رائیہ)	۱۲۸۷-۸۸ھ (۱۸۷۰-۷۱ع)	"	"	...	۲۵۸
۳ ـ قصیدۂ نا تمام (در مدح نواب کلب علی خاں)	۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ع)	"	"	...	۲۶۵
۴ ـ قصیدۂ نا تمام (در مدح سید احمد خاں)	۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ع)	"	"	...	۲۶۸
۵ ـ قصیدۂ جشن جیوبلی	۱۸۸۷ع	"	مجموعہ نظم حالی		۲۷۰
۶ ـ قصیدۂ تہنیت عیدالفطر (بہ حضور نواب سر آسمان جاہ)	۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ع)	"	دیوان	...	۲۷۲

۷ - قصیده در شکر و سپاس ۱۳۰۹ھ
نظام دکن و اعیان سلطنت (۱۸۹۱ع) قصیده دیوان ... ۲۷۶

۸ - قصیده تہنیت بہ حضور ۱۳۲۳ھ
نظام دکن (۱۹۰۵ع) " جواہرات ... ۲۸۲

(ب) منظومات مدحیہ ، سپاسیہ ، وداعیہ وغیرہ ۲۸۷ تا ۳۲۳

۱ - خمسۂ نعتیہ ۱۲۷۲ھ
(۱۸۵۶ع) مخمس جواہرات ... ۲۸۷

۲ - مبارک باد ۱۸۷۵ع قطعہ کلیات
(مرتبہ اسماعیل جلد اول) ۲۹۰

۳ - مژدہ قدوم ۱۸۷۵-۷۶ع
حضور شاہزادہ ویلز قطعہ دیوان ... ۲۹۱

۴ - شکریہ تشریف آوری ۱۸۸۲ع
سر چارلس ایچی سن ترجیع بند جواہرات ... ۲۹۲

۵ - قطعہ بہ جناب ۱۳۰۵ھ
نواب سر آسمان جاہ (۱۸۸۸ع) قطعہ دیوان ... ۲۹۳

۶ - شکریہ حضور لفٹنٹ ۱۸۸۹ع
گورنر بہادر ترجیع بند جواہرات ... ۲۹۶

۷ - قطعہ در تہنیت ۱۳۰۸ھ
ولادت فرزند ارجمند (۹۱-۱۸۹۰ع) قطعہ دیوان ... ۲۹۸

۸ - قطعہ در شکر و معذرت ۱۳۰۹ھ
(۱۸۹۱ع) قطعہ " ... ۳۰۰

۹ - قطعہ در شکر اضافۂ وظیفہ ۱۳۰۹ھ
(۱۸۹۱ع) " " ... ۳۰۱

۱۰ - شکریہ عطائے مدرسہ ۱۸۹۱-۹۲ع
نواب غازی الدین مرحوم ترجیع بند " ... ۳۰۲

۱۱ - اشعار مدحیہ بحضور سرڈینس فٹز پیٹرک	قبل ۱۸۹۳ء	قطعہ	دیوان	... ۳۰۴
۱۲ - شکریہ مسٹر برور	قبل ۱۹۰۰ء	قطعہ	جواہرات	... ۳۰۶
۱۳ - مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت	۱۹۰۴ء	ترکیب بند	”	... ۳۰۷
۱۴ - مسٹر ماریسن کی روانگی ولایت	۱۹۰۵ء	”	”	... ۳۱۲
۱۵ - خطاب بہ حاذق‌الملک	۱۹۰۸ء	قطعہ	”	... ۳۱۵
۱۶ - افتتاح ندوۃ‌العلماء	۱۹۰۸ء	مخمس	”	... ۳۱۶
۱۷ - تہنیت مسند نشینی حضور نظام	۱۹۱۱ء	قطعہ	”	... ۳۱۸
۱۸ - شہر حیدر آباد	۱۹۱۲ء	”	”	... ۳۲۱
۱۹ - شکریۂ مساعی جمیلہ ظفر علی خاں	۱۹۱۳ء	”	”	... ۳۲۱

فصل چہارم - مراثی ۳۲۷ تا ۳۶۲

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ	صفحہ
۱ - مرثیۂ غالب	۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء)	ترکیب بند	دیوان	... ۳۲۷
۲ - مرثیۂ مہین برادر جناب خواجہ امداد حسین صاحب	(۱۳۰۳ھ) (۱۸۸۵-۸۶ء)	قطعہ	”	... ۳۳۵
۳ - مرثیہ حکیم محمود خاں دہلوی	۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء)	مسدس	”	... ۳۳۷

۴ - مرثیہ ملکۂ معظمہ وکٹوریا	۱۹۰۱ع	ترکیب بند	جواہرات...	۳۴۹
۵ - نوحۂ قیصرۂ ہند	۱۹۰۱ع	قصیدہ	" ...	۳۵۶
۶ - سرسید کے دو رفیق	۱۹۰۵ع	قطعہ	" ...	۳۵۷
۷ - مرثیہ محسن الملک	۱۹۰۷ع	ترکیب بند	" ...	۳۶۱

فصل پنجم - جدید شاعری (درسی، اخلاقی اور مناظراتی)

۳۶۵ تا ۵۰۹

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ	صفحہ
۱ - جواں مردی کا کام	۱۸۷۲ع	مثنوی	مجموعہ نظم حالی	۳۶۵
۲ - برکھا رت	۱۸۷۴ع	"	" ...	۳۷۱
۳ - نشاط امید	۱۸۷۴ع	"	" ...	۳۸۴
۴ - حب وطن	۱۸۷۴ع	"	" ...	۳۹۱
۵ - مناظرۂ رحم و انصاف	۱۸۷۴ع	"	" ...	۴۱۱
۶ - تعصب و انصاف	۱۸۸۲ع	"	" ...	۴۲۱
۷ - کلمۃ الحق (راست گوئی)	۱۸۸۳ع	"	" ...	۴۳۹
۸ - مناظرۂ واعظ و شاعر	۱۸۸۳ع	قطعہ	" ...	۴۴۹
۹ - پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ	۱۸۸۷ع	مثنوی	" ...	۴۶۲
۱۰ - دولت اور وقت کا مناظرہ	۱۸۸۷ع	"	دیوان ...	۴۷۵
۱۱ - حقوق اولاد	۱۸۸۸ع	"	مثنویات حالی...	۴۷۹
۱۲ - ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے	......	"	دیوان ...	۵۰۸

فصل ششم۔ بچوں کی نظمیں

(زمانۂ تصنیف ۱۹۰۴ع تا ۱۹۰۸)

عنوان	ہیئت	ماخذ	صفحہ
۱ - خدا کی شان	مثنوی	جواہرات	... ۵۱۳
۲ - بڑوں کا حکم مانو	مربع	"	... ۵۱۴
۳ - مرغی اور اس کے بچے	مثنوی	"	... ۵۱۶
۴ - بلی اور چوہا	قطعہ	"	... ۵۱۷
۵ - شیر کا شکار	مسدس	"	... ۵۱۸
۶ - پیشے	مثنوی	"	... ۵۱۹
۷ - گھڑیاں اور گھنٹے	مسدس	"	... ۵۲۷
۸ - دھان بونا	مثنوی	"	... ۵۲۹
۹ - روٹی کیوں کر میسر آتی ہے	"	"	... ۵۳۰
۱۰ - موچی	مخمس	"	... ۵۳۶
۱۱ - چٹھی رساں	قطعہ	"	... ۵۳۷
۱۲ - سپاہی	مثنوی	"	... ۵۳۹
۱۳ - ایک چھوٹی بچی کے خصائل	"	"	... ۵۴۰
۱۴ - نیک بنو نیکی پھیلاؤ	مسدس	بچوں کا اخبار لاہور	... ۵۴۳

★

مقدمہ

از

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

مقدمہ

حالی کی زندگی میں مسدس کے علاوہ اُن کے کلام کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے: مجموعہ نظم حالی (۱۸۹۰ع) اور دیوان حالی (۱۸۹۳ع) ۔ ان سے پہلے کی تین مشہور نظمیں: مناجات بیوہ، مثنوی حقوق اولاد اور شکوۂ ہند، کثرت اشاعت کی وجہ سے ان مجموعوں میں شامل نہیں کی گئیں۔ ۱۸۹۳ع کے بعد کا سارا کلام غیر مدون رہ گیا، البتہ مذکورہ بالا نظموں کی طرح چند مشہور نظمیں مثلاً تحفۃالاخوان، فلسفۂ ترقی، چپ کی داد وغیرہ متفرق طور پر چھپتی رہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں مولانا حالی کو اپنے بکھرے ہوئے کلام کی شیرازہ بندی کا خیال آیا۔ چنانچہ مختلف جسمانی عوارض اور خانگی تفکرات کے باوجود انھوں نے کلیات نظم کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کردیا۔ اس سلسلے میں پہلے فارسی و عربی نظم و نثر کا مجموعہ ''ضمیمۂ اُردو کلیات نظم حالی'' کے نام سے مرتب کیا جو ان کے انتقال سے صرف پانچ ماہ پہلے، اگست ۱۹۱۴ع میں[1] شائع ہوگیا۔ کلیات کا ضمیمہ تو چھپ گیا لیکن موت نے کلیات کی ترتیب و اشاعت کی مہلت نہ دی۔

حالی کی وفات کے بعد مسدس اور متفرق نظموں کے علاوہ دیوان حالی کے مختلف اجزا بھی، رباعیات حالی اور قطعات حالی کے نام سے علیحدہ علیحدہ شائع ہوتے رہے لیکن

---

۱ ۔ دیباچہ کلیات نظم حالی: جلد اول (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی) صفحہ ۴ ۔

خود دیوان کے دوسرے ایڈیشن کی برسوں نوبت نہ آئی ۔ کلیات کی اشاعت میں بھی چند خاص رکاوٹیں حائل تھیں ۔ حالی نے کچھ نظموں کا حق اشاعت بعض قومی اداروں کو دے دیا تھا ۔ مثلاً اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ کو دو مشہور قومی نظموں (تحفۃالاخوان ، اور ترقی و تنزل یا فلسفۂ ترقی) کے حقوق حاصل تھے ۔ ان اداروں کا مطالبہ یہ تھا کہ ''ان کا حق محفوظ رہنا چاہیے کیوں کہ وہ ایک خیر جاریہ ہے ۔''[۱] اسی طرح لاہور کے تاجران کتب قومی ، ملک فضل الدین وغیرہ نے بھی چند نظموں (مثلاً ننگ خدمت ، شکوۂ ہند وغیرہ) کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا لیے تھے ۔ کچھ اور بیوپاری بھی اجارہ‌داری کے مدعی تھے ۔ ۱۹۲۲ع میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ایک مجموعہ ''جواہرات حالی'' کے نام سے شائع کیا ۔ اس نام سے انتخاب کلام کا مغالطہ ہوتا ہے لیکن دراصل یہ مجموعہ باقیات حالی پر مشتمل ہے ۔ تاہم اس میں بھی حالی کا تمام غیر مدون کلام شامل نہیں ۔ بعد ازاں شیخ صاحب نے کلیات نظم حالی کی تدوین کا بیڑا اٹھایا اور ۱۹۲۴ع میں دیوان اور جواہرات میں شائع شدہ کلام کو اصناف وار مرتب کرکے کلیات کی دو جلدیں شائع کر دیں ۔ تیسری اور چوتھی جلد کی ترتیب و اشاعت کا منصوبہ تشنۂ تکمیل رہ گیا ۔ جس اسلوب سے یہ مجموعے مرتب اور شائع ہوئے ، اس کے پیش نظر اس سلسلے کا ادھورا رہ جانا چنداں افسوس ناک امر نہیں لیکن قوم کی اس بے حسی و بے اعتنائی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے

---

۱ ۔ تذکرۂ حالی : (بشیر پاشا سیریز) مرتبہ محمد امین زبیری ، صفحہ ۴۴ ۔

کم ہے کہ مولانا حالی کی وفات کو نصف صدی سے زیادہ مدت گزر گئی ، اب تک کسی ادارے یا انجمن کو کلیات حالی شائع کرنے کی توفیق نہ ہوئی ۔

مولانا حالی ، اردو ادب کے چند بزرگ ترین معماروں اور محسنوں میں سے ہیں ۔ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر اور نظم جدید کے پیشوا تھے ۔ ان کی شعری تخلیقات کا دائرہ معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع اور جملہ اصناف سخن پر محیط ہے ۔ انھوں نے غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، مرثیہ (شخصی) ، قطعہ ، رباعی ، غرض ہر صنف سخن کو زمانے کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ۔ حالی کے ہمہ گیر تجدیدی اور انقلابی کارناموں کا جائزہ لیجیے تو میر انیس کے بارے میں خود انھی کا ایک مشہور قول یاد آ جاتا ہے ، لیکن حالی نے نہ صرف اردو شاعری کے ''ماء راکد'' میں بلکہ ایک بے حس و حرکت قوم کی زندگی میں بھی تموج اور تلاطم پیدا کر دیا ۔ حالی کی نظموں نے سب سے پہلے ہمارے قومی و ملی شعور کو بیدار کیا اور ان عظیم اقدار کا احساس دلایا جن پر ہماری تہذیب کی عمارت قائم ہے ۔ قومی وجود کے تحفظ اور ماضی و حال کے تسلسل کے لیے کلام حالی آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کل تھا ۔

مدت دراز سے دیوان حالی اور مسدس ، مختلف امتحانوں کے نصاب اردو میں داخل ہیں لہٰذا ان کے برے بھلے نسخے بہ سہولت دست یاب ہو جاتے ہیں ، لیکن کلام حالی کے دیگر مجموعوں اور کئی مشہور نظموں کی کم یابی کا یہ عالم ہے کہ کتب فروشوں کی دکانیں تو کیا ، کتب خانوں کی الماریوں میں بھی ان کا سراغ نہیں ملتا ۔ اس کم یابی

بلکہ نایابی کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو ادب کے طلبہ اور عام قارئین کے علاوہ بیش تر اساتذہ ، ناقدین اور مصنفین بھی حالی کی شعری خدمات سے کماحقہ آگاہ نہیں ۔ چنانچہ ان کے مطالعے کی سطحیت ناقص تنقیدی آراء کی صورت میں اکثر ظاہر ہو جاتی ہے ۔ مثلاً اردو ادب کے ایک فاضل استاد اور مشہور مصنف کی یہ رائے ملاحظہ ہو جو اُن کی مستند کتاب ''اردو مثنوی کا ارتقا'' سے منقول ہے :

''حالی کی مثنویاں ، برکھا رت ، شکوۂ ہند ، چپ کی داد وغیرہ مظاہر فطرت کا عکس ہیں ۔''[1]

شکوۂ ہند اور چپ کی داد ، حالی کی شاہکار نظمیں ہیں اور اپنے موضوع ، ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے ایسی منفرد ہیں کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی سخن شناس کی نگاہ سے گزری ہوں تو وہ انھیں بھولے سے بھی ''مثنویاں'' اور ''مظاہر فطرت کا عکس'' نہیں کہہ سکتا ۔ لیکن جب حالی کا نصف سے زائد کلام ناقدین اور مصنفین کی دست رس سے باہر ہو تو ظن و تخمین اور فقرے بازی سے کام چلانے کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے ؟ زندہ قومیں دنیا بھر کے ادبی شہ پاروں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر انھیں بہتر سے بہتر شکل میں پیش کرتی ہیں ؛ ہم خود اپنے بزرگوں کا نام و نشان مٹانے پر تلے بیٹھے ہیں ۔ گزشتہ سال ڈاکٹر عبادت بریلوی ، صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی ، کے نام ایک مغربی محقق کا خط آیا جس میں اس نے محمد شاہی دور کے بعض معروف و غیر معروف شعراء کے دواوین کی تلاش میں پاکستان آنے کا

---

۱ - اردو مثنوی کا ارتقا : مصنفہ پروفیسر عبدالقادر سروری - (طبع جدید ، کراچی ۱۹۶۶ع) صفحہ ۱۵۰

ارادہ ظاہر کیا تھا اور اسی سلسلے میں کچھ استفسارات بھی تھے۔ صدر شعبہ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا تو مغربی محقق کے ہر سوال کا جواب نفی میں تھا۔ اس غریب کو کیا خبر کہ جس قوم نے اپنے اُن اکابر کے کلام کو طاق نسیاں میں رکھ دیا، جن کی نوائے درد ابھی کل تک اس کے لیے سرمایۂ حیات تھی، وہ بھلا صدیوں کے گڑے مردوں سے کیا سروکار رکھے گی۔ یہاں تو اگر کوئی ادارہ کلاسیکی ادب کے سرمایے کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اُسے بار بار اپنے اس اقدام کا جواز ثابت کرنا پڑتا ہے!

★

کلیات کی ترتیب میں جن مجموعوں سے مدد لی گئی ہے، اُن میں دیوان حالی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ متداول نسخوں کے علاوہ مجھے ابتدا ہی میں دیوان کے دو بہتر نسخے مل گئے: طبع سوم (مطبوعہ انوار المطابع، لکھنؤ) اور طبع چہارم (مطبوعہ الناظر پریس، لکھنؤ)۔ بعد میں دیوان حالی، طبع اول سے بھی مکمل استفادے کا موقع ملا۔ دیوان کا یہ ایڈیشن مع مقدمۂ شعر و شاعری ۱۸۹۳ع میں مطبع انصاری دہلی میں تین قسم کے کاغذ پر چھپا تھا۔ پیش نظر نسخہ قسم اول ہے (''کاغذ ولایتی، لوح مینا کاری بر کاغذ چرمی'')۔ کتاب کے پہلے حصے میں ۲۲۸ صفحے تک مقدمہ اور دوسرے حصے میں ۲۳۲ صفحات پر مشتمل دیوان چھپا ہے۔ کتابت دیدہ زیب ہے اور اگر دو معمولی نقائص کو نظر انداز کر دیا جائے تو صحتِ متن کے اعتبار سے بھی یہ نسخہ لاجواب ہے۔ پہلا نقص یہ ہے کہ قدیم طرزِ کتابت کے مطابق کئی الفاظ ملا کر لکھے گئے

ہیں ۔ اس نسخے میں لفظوں کے جوڑ توڑ کی عجیب و غریب صورتیں نظر آتی ہیں ۔ مثلاً بیچراغ (بے چراغ) ، بھولگئے (بھول گئے) ، بارانسے (باران سے) ، پھندیسے (پھندے سے)، لیگئی (لے گئی) وغیرہ ۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ کاتب نے ''یاں'' ، ''واں'' کو بالالتزام ''یہاں'' ، ''وہاں'' لکھا ہے ۔ دیوان میں جہاں کہیں یہ الفاظ آئے ہیں ہر جگہ یہی صورت نظر آئے گی ۔ مثلاً :

یہاں دے چکی جواب امید جواب خط
وہاں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز

دیوان حالی کے دوسرے ایڈیشن (شائع کردہ الناظر بک ایجنسی ، لکھنؤ) میں طبع اول کے نقائص بجنسہ موجود تھے ۔ ۱۹۲۲ع میں جب اسی ادارے کی طرف سے دیوان کا تیسرا ایڈیشن چھپا تو مولانا ظفرالملک علوی نے اُن نقائص کو دور کرنے کی طرف خاص توجہ دی ''جو سابقہ ایڈیشن میں محض طبع اول کے نسخے کی مجبورانہ تقلید کے باعث رہ گئے تھے ۔''[۱] دیوان حالی کا چوتھا ایڈیشن (مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ) کتابت و طباعت کے لحاظ سے طبع سوم سے بہتر ہے ۔ ابتداءً متن کی تصحیح میں یہی دو نسخے میرے پیش نظر رہے اور بہ ظاہر اُن پر اعتماد کیا جا سکتا تھا ۔ لیکن کلیات مرتب کرنے کے بعد جب طبع اول کا نسخہ ہاتھ آیا اور میں نے از اول تا آخر اس سے مقابلہ کیا تو کئی جگہ فرق نکلا ۔ بعض اشعار میں لفظوں کی ترتیب طبع اول سے مختلف ہے ، کہیں کوئی لفظ بدلا ہوا ہے ، کہیں کوئی شعر حذف ہو گیا ہے ۔ متداول نسخے بالعموم طبع سوم

۱ - ''حقیقت حال'' : ابتدائیہ دیوان حالی، طبع سوم ، صفحہ ۱ ۔

پر مبنی ہیں - اُن میں طبع سوم کی تحریفات کے علاوہ، حسب توفیق کا تبوں کے نو بہ نو اضافے بھی ہیں - چونکہ طبع سوم (انوارالمطابع ایڈیشن) اور طبع چہارم (الناظر ایڈیشن) کے نسخے عموماً مستند سمجھے جاتے ہیں اس لیے حواشی میں اُن کے اختلافات درج کر دیے گئے ہیں -

دیوان کے طبع اول اور بعد کے نسخوں میں ایک نہایت اہم فرق یہ ہے کہ قدیم غزلوں کی نشان دہی میں عموماً بے احتیاطی کی گئی ہے - طبع اول میں ۳۰ غزلوں پر قدیم کا نشان (ق) درج ہے لیکن طبع سوم میں نشان زدہ غزلیں صرف ۲۱ ہیں - طبع چہارم میں اس سے کچھ زائد ہیں لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ بعض جدید غزلیں بھی سہواً قدیم ظاہر کی گئی ہیں - متداول نسخوں میں یہ فرق اور نمایاں ہو گیا ہے، حتیٰ کہ بعض نسخوں (مثلاً تاج بک ڈپو ایڈیشن) میں سرے سے قدیم و جدید کا امتیاز ہی ختم کر دیا گیا - چونکہ تمام نسخوں میں قدیم و جدید غزلیں، بہ ترتیب ردیف ملی جلی چھپتی رہی ہیں اس لیے یہ اختلاف کسی کو محسوس نہیں ہوتا - عام قارئین کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں لیکن اگر قدیم و جدید کا امتیاز باقی نہ رہے تو حالی کے ذہنی و فنی ارتقا کو سمجھنے میں سخت دشواری پیش آئے گی - مرتبین کی بے احتیاطی سے بعض فاضل محققین بھی مغالطے کا شکار ہو گئے - مثلاً ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے قدیم غزلوں کی تعداد ۱۷[1] اور سید مرتضیٰ حسین فاضل نے ۲۰، ۲۱ بیان کی ہے[2] - زیر نظر کلیات میں قدیم و جدید غزلیات اسی لیے علیحدہ علیحدہ مرتب

---

۱ - حالی بحیثیت شاعر: (طبع اول، لکھنؤ ۱۹۶۰ء) صفحہ ۸۹ -
۲ - مقدمہ مثنویات حالی: (حاشیہ) صفحہ ۳۰ -

کی گئی ہیں کہ آئندہ اس قسم کے مغالطوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

دیوان میں کل ۶۷ قطعات، ۱۱۶ غزلیات (قدیم ۳۰، جدید ۸۶)[1] ۱۰۷ رباعیات (قدیم ۷، جدید ۱۰۰) دو نعتیہ، دو مدحیہ اور دو نا تمام قصیدے، دو ترکیب بند، پانچ مدحیہ و سپاسیہ قطعات شامل ہیں۔ آخر میں اشعار متفرقہ کے عنوان سے کچھ فرمائشی نظمیں اور قطعاتِ تاریخ جمع کر دیے گئے ہیں۔

دیوان سے تین سال پہلے، ۱۸۹۰ع میں مولانا حالی نے اپنی مثنویاں اور بعض طویل نظمیں مرتب کر کے ''مجموعۂ نظم حالی'' کے نام سے چھپوائی تھیں۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل ۱۴ نظمیں شامل تھیں:

۱۔ برکھا رت۔ ۲۔ نشاط امید۔ ۳۔ حب وطن۔ ۴۔ مناظرۂ رحم و انصاف۔ ۵۔ ننگ خدمت۔ ۶۔ ترکیب بند مدرسۃالعلوم علی گڑھ۔ ۷۔ تعصب و انصاف ۸۔ کلمۃ الحق ۹۔ مناظرۂ واعظ و شاعر۔ ۱۰۔ جشن جیوبلی ۱۱۔ پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ۔ ۱۲۔ ترکیب بند مسلمانوں کی تعلیم۔ ۱۳۔ جواں مردی کا کام ۱۴۔ ترکیب بند زمزمۂ قیصری۔

۱۹۰۳ع میں مجموعۂ نظم حالی کا دوسرا ایڈیشن، چار نظموں کے اضافے کے ساتھ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے شائع کیا تھا۔ اس میں ایک نظم

۱۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے غزلیات کی تعداد ۱۱۵ (قدیم ۱۷، جدید ۹۹) درج کی ہے (حالی بحیثیت شاعر: صفحہ ۸۹)۔ غالباً کاتب صاحب نے ننانوے کا پھیر ڈال دیا۔

''صدائے گدایان قوم'' دیوان حالی میں موجود ہے۔ باقی تین نظمیں نئی تھیں۔ یہ دونوں نسخے اب کم یاب ہیں۔ میرے پیش نظر مجموعۂ نظم حالی کے تین نسخے تھے۔ دو نسخے مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کے (طبع سوم ۱۹۱۸ع اور طبع چہارم) اور تیسرا نسخہ دوآبہ ہاؤس لاہور کا شائع کردہ ہے۔ علی گڑھ کے دونوں نسخے، کتابت، طباعت اور صحت متن کے اعتبار سے معیاری ہیں۔ تینوں نسخوں میں مذکورۂ بالا ۱۴ نظموں کے علاوہ مثنوی دولت اور وقت کا مناظرہ بھی شامل ہے۔ یہ نظم دیوان حالی میں بھی موجود ہے۔ مثنویات کی ترتیب و تصحیح میں مجموعۂ نظم حالی کے علاوہ مثنویات حالی کے دو جدید نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

دیوان اور مجموعۂ نظم حالی میں ۱۸۹۳ع تک کا بیش تر کلام جمع ہو گیا تھا۔ حالی نے خود ہی اپنی بعض مشہور نظموں کو کثرت اشاعت کی وجہ سے ان مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ لیکن ۱۸۹۳ع سے پہلے کی مندرجہ ذیل تین مختصر نظمیں، غالباً ناقابل اشاعت سمجھ کر نظر انداز کی گئیں:

۱۔ مبارک باد (۱۸۷۵ع)۔ ۲۔ شکریہ تشریف آوری سر چارلس ایچی سن (۱۸۸۲ع)۔ ۳۔ شکریہ حضور لفٹنٹ گورنر بہادر (۱۸۸۹ع)۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے مرتبہ مجموعوں میں سے جواہرات حالی میں ۱۸۹۳ع کے بعد کی ۷ غزلیں، ۴۳ نئی رباعیاں اور بہت سی چھوٹی بڑی نظمیں درج ہیں۔ اگرچہ پہلے کے کلام میں سے جو طویل نظمیں (مثلاً مناجات بیوہ،

حقوق اولاد اور شکوۂ ہند) اب تک مدون نہیں ہوئی تھیں، وہ اس مجموعے میں بھی شامل نہیں، لیکن شیخ صاحب کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے حالی کے باقی ماندہ منتشر کلام کو بڑی کاوش و جستجو سے جمع کر کے جواہرات کی لڑی میں پرو دیا ۔ میں نے جواہرات حالی سے پوری طرح استفادہ کیا ہے لیکن کلیات نظم جلد اول و دوم میں ایک مختصر نظم ''مبارک باد'' اور ایک طویل نظم ''شکوۂ ہند'' کے سوا اور کوئی نئی چیز نہیں ملی ۔ ۱۹۳۵ع میں حالی کے جشن صد سالہ کے موقع پر شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالی کی اردو و فارسی رباعیات کا مکمل مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا تھا، جس میں آخری دور کی دس نئی رباعیاں بھی شامل ہیں ۔ رباعیات کی ترتیب میں یہی نسخہ میرے پیش نظر رہا ۔ رباعیات حالی کے کئی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، ان میں یہ مجموعہ اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں رباعیات کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ یعنی فارسی کی رباعیوں کے علاوہ صرف اردو کی ۱۶۰ رباعیاں درج ہیں ۔ چونکہ شیخ صاحب نے دیوان کی مطبوعہ رباعیاں بھی خود مصنف کے ذاتی نسخے سے نقل کی ہیں، اس لیے کئی رباعیاں ترمیم شدہ صورت میں ملیں گی ۔ (حواشی میں حسب موقع ترمیم شدہ رباعیوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے) ۔ لیکن یہ مجموعہ بہت غلط چھپا ہے ۔ شیخ صاحب کے مرتبہ مجموعوں کی یہ مشترک خصوصیت ہے ۔ میں یہاں صرف کلیات نظم حالی سے چند مثالیں پیش کروں گا کیونکہ فاضل مرتب نے خود اپنے دیباچے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ کلیات کی ترتیب و

تصحیح میں خاص توجہ صرف کی گئی ہے اور ''حتی الامکان غلطی کا امکان نہیں رہنے دیا[1] -'' میں نے کلیات نظم حالی میں سے صرف دو نظمیں اخذ کی ہیں لہٰذا انھی میں سے ایک (''شکوۂ ہند'' مشمولہ کلیات نظم حالی جلد دوم) کے حوالے دوں گا -

کتابت کی عام غلطیوں کے علاوہ ایک خاص صورت (جو شیخ صاحب کے مرتبہ مجموعوں میں ہر جگہ نظر آتی ہے) یہ ہے کہ دیوان حالی ، طبع اول کے کاتب کی تقلید میں ''یاں'' اور ''واں'' کو ''یہاں'' اور ''وہاں'' لکھا گیا ہے - چنانچہ ''شکوۂ ہند'' کے ۹ مصرعے اسی اصول کتابت کی بھینٹ چڑھے ہیں - دیوان کے کاتب اول پر رحمت ہو کہ وہ ایک وضع خاص کا پابند تھا لیکن ان مجموعوں میں جا بجا اس روایت سے انحراف کی مثالیں بھی ملتی ہیں - یعنی ''یہاں'' اور ''وہاں'' کی جگہ ''یاں'' اور ''واں'' لکھا گیا ہے - ''تیرے'' اور ''ترے''، ''میرے'' اور ''مرے'' کے معاملے میں بھی ان نسخوں میں تحریف و تبادل کی یہی صورت جا بجا سامنے آتی ہے ، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود فاضل مرتب کو احساس نہیں کہ اس تحریف سے شعر کی جان ناتواں پر کیا گزر گئی - شکوۂ ہند سے یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

''سنتے ہیں دیوار و در سے ترے یہ پیغام ہم''- (ص - ۴۶)
''قریہ قریہ ترے علم و فضل سے معمور تھا''- (ص - ۴۸)

وزن کا احساس نہ ہو تو شعر میں ایسی ہزار طرح کی خرابیاں چپکے سے در آتی ہیں کہ بہ ظاہر معنی و مطلب کے لحاظ

---

۱ - دیباچہ کلیات نظم حالی : (مرتبہ محمد اسماعیل) ، جلد اول ، صفحہ ۵ -

سے مصرعے بے عیب نظر آتے ہیں اور مصحح یا مرتب ان کے ''داغ نا تمامی'' سے بے خبر رہتا ہے۔ مثلاً شکوۂ ہند کے ان مصرعوں میں تحریف کی مختلف صورتیں ملاحظہ ہوں :

''تھیں یہی شکلیں ہماری ، تھا یہی رنگ و روپ'' (ص - ۴۵)
''یاریاں ہم میں رہیں باقی نہ غم خواریاں'' (ص - ۵۲)
''کوئی بد عہدی سے بڑھ کر نہ تھا عیب اُن کے لیے'' (ص-۴۲)

جواہرات اور رباعیات میں اس قسم کی تحریفات سے نہ صرف سکتے پڑتے ہیں بلکہ مصرعوں کے جھٹکے ہو گئے ہیں - رباعی کے مخصوص اوزان کی نزاکت و پیچیدگی اچھے اچھوں کو دھوکا دیتی ہے لیکن رباعیات حالی کے مرتب نے تو انتہا کر دی کہ مندرجہ ذیل قطعے کو ، جو انگریزی شاعر گرے کی مشہور نظم کے ایک بند کا ترجمہ ہے ، رباعیات کے زمرے میں شامل کر لیا :

موتی ہزار قعر سمندر میں ہوں نہاں
پر یہ بتاؤ ان کا خریدار ہے کہاں
کھلتے ہیں پھول سینکڑوں ویران دشت میں
ہے کون رنگ و بو کا وہاں اُن کے قدرداں

جن مجموعوں کا اب تک ذکر آیا ہے اُن میں سے کسی میں ''مناجات بیوہ'' اور مثنوی ''حقوق اولاد'' شامل نہیں - یہ نظمیں علیحدہ علیحدہ چھپتی رہیں اور بعد میں مثنویات حالی کے مختلف نسخوں میں شائع ہوئیں - میرے پیش نظر مثنویات کے دو جدید ایڈیشن تھے - پہلے ایڈیشن کے مرتب ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ہیں - اسے

انوار بک ڈپو ، لکھنؤ نے ۱۹۶۰ع میں شائع کیا ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ع میں شیخ مبارک علی (تاجر و ناشر کتب ، لاہور) نے سیّد مرتضیٰ حسین فاضل کے مبسوط مقدمے کے ساتھ چھپوایا ۔ ڈاکٹر شجاعت علی کے مرتبہ نسخے میں متن کی تصحیح کا اہتمام نہیں کیا گیا ۔ ہر صفحے پر کئی کئی غلطیاں موجود ہیں ۔ کتابت و طباعت بھی ناقص ہے ۔ لاہوری نسخہ ظاہری اعتبار سے بدرجہا بہتر ہے ، نیز مرتب کے فاضلانہ مقدمے سے اس کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے لیکن متن کے لحاظ سے یہ نسخہ لکھنوی ایڈیشن (مرتبہ شجاعت) کا مثنیٰ ہے ۔ پہلے نسخے میں ۱۱ مثنویات درج ہیں ۔ دوسرے میں مرتب نے بچوں کی ایک نظم ''روٹی کیوں کر میسر آتی ہے'' (مشمولہ جواہرات حالی) کا اضافہ کیا ہے ۔ مناجات بیوہ اور حقوق اولاد کے علاوہ دیگر مثنویات کی ترتیب میں بھی ان نسخوں سے مدد لی گئی ہے ۔ مثنویات حالی (مرتبہ شجاعت و فاضل) کے علاوہ حالی کی متفرق نظموں کے لاہوری نسخے (مطبوعہ کریمی پریس ، مجتبائی پریس ، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس وغیرہ) بھی میرے پیش نظر رہے ۔ ان تمام نسخوں میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں ۔ البتہ گزشتہ صدی کے اواخر میں مجتبائی پریس اور مصطفائی پریس کے چھپے ہوئے نسخے غنیمت ہیں ۔ ۱۹۶۰ع میں جدید کتاب گھر دہلی نے ایک مجموعہ ''کلیات حالی'' کے نام سے شائع کیا ۔ یہ نام نہاد ''کلیات'' ہر لحاظ سے ناقص و نا مکمل ہے ۔ اس مجموعے کا دیباچہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے لکھا ہے ۔ غالباً وہی اس کے مرتب ہوں گے ۔ بعض جگہ اس سے بھی استفادہ کرنا پڑا ۔

مسدس مد و جزر اسلام کا پہلا ایڈیشن ماہ جون ۱۸۷۹ع میں چھپا - دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۰ع میں اور تیسرا ایڈیشن ''جستہ جستہ تصرفات'' اور ۱٦۲ بند کے ضمیمے کے ساتھ ۱۸۸٦ع میں شائع ہوا - مولانا حالی نے نظرثانی کے بعد تیسرے ایڈیشن میں بہت سے مصرعے بدل دیے ہیں - کہیں کہیں دو ایک بند بڑھا دیے ہیں - بعض جگہ ترتیب بدل دی ہے - سرسید نے پہلے ایڈیشن کے نسخے موصول ہوتے ہی تہذیب الاخلاق (جلد ۱۸۸۰ع) میں پورا مسدس چھاپ دیا تھا - تہذیب الاخلاق سے مقابلہ کرکے پہلے ایڈیشن اور ترمیم شدہ نسخے کا فرق حواشی میں ظاہر کر دیا گیا ہے - مسدس کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں - ۱۹۳۵ع میں اس کا صدی ایڈیشن خاص اہتمام سے چھپا تھا جو اب تک مسدس کا صحیح ترین ایڈیشن مانا جاتا ہے - تاج کمپنی نے بھی مسدس کا ایک اعلیٰ ایڈیشن شائع کیا تھا - مسدس کی ترتیب میں تاج کمپنی کے نسخے کو بنیادی نسخہ قرار دیا گیا ہے اور متن کی تصحیح میں صدی ایڈیشن سے مدد لی گئی ہے -

ضمیمۂ اردو کلیات نظم حالی ، مولانا حالی کے فارسی و عربی کلام نظم و نثر کا مجموعہ ہے جس کا صرف ایک ایڈیشن چھپا تھا - اس مجموعے سے حصۂ نثر کو چھوڑ کر ، فارسی و عربی کا تمام کلام ، بطور ضمیمہ کلیات میں شامل کر لیا گیا ہے -

★

کلیات کی ترتیب کا قدیم اسلوب یہ ہے کہ اصناف سخن (ہیئت) کے اعتبار سے تمام منظومات جمع کر دی جائیں -

شیخ محمد اسماعیل نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ لیکن ذوق سلیم کو یہ شتر گربگی گوارا نہیں کہ محض ہیئت کی یکسانیت کی بنا پر ''مرثیۂ غالب'' کو ''چپ کی داد'' کے پہلو میں یا ''مناجات بیوہ'' کو ''حب وطن'' کے ساتھ جگہ دی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زمانی ترتیب ملحوظ رکھی جائے لیکن اس میں یہ قباحت درپیش تھی کہ بیش تر غزلیات، قطعات و رباعیات اور بعض نظموں کے محض ادوار متعین کیے جا سکتے ہیں؛ اُن کے سنین تصنیف کی تعیین محال ہے۔ لہذا اصنافی یا زمانی ترتیب کے مقابلے میں موضوعاتی ترتیب کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ، جہاں، جس حد تک ممکن اور مناسب تھا، اصنافی اور زمانی ترتیب بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مثلاً ابتدائی تین فصلیں، چار اصناف پر مشتمل ہیں: غزلیات، قطعات و رباعیات اور قصائد۔ دیوان حالی میں غزلیات اور رباعیات کے قدیم و جدید دور قائم کیے گئے ہیں۔ دیوان کے بعد کی غزلیں اور رباعیاں، دور آخر سے متعلق ہیں۔ اس طرح یہ اصناف تین ادوار میں منقسم ہیں۔ قطعات میں یہ تقسیم ممکن نہیں تھی، اس لیے انہیں موضوع کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ تیسری فصل میں قصائد کے ساتھ وہ تمام چھوٹی چھوٹی نظمیں جمع کر دی گئی ہیں جو ہیئت کے اختلاف کے باوجود قصیدے سے معنوی رشتہ رکھتی ہیں۔ اس فصل کے دونوں حصوں میں زمانی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ تیسری فصل سے لے کر آخر تک موضوعاتی اور زمانی ترتیب کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہ اصول ترتیب مرکب اور پیچیدہ ہے، لہذا دقت نظر سے کام لینے کے باوجود اختلاف رائے

کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ سطور ذیل میں ہر فصل کے سرسری جائزے کے ضمن میں اس نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کی جائے گی۔

دیوان حالی کی ترتیب کے برخلاف کلیات میں غزل کو مقدم کیا گیا ہے جس کی توجیہ غیر ضروری ہے۔ غزل کے تین دور قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا دور (قدیم) تقریباً ۱۸۶۳ع سے ۱۸۷۴ع تک کی غزلیات پر مشتمل ہے۔ ابتدا و انتہا کے سنین حتمی طور پر متعین نہیں کیے جا سکتے۔ ۱۸۶۳ع میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے حلقۂ اثر میں داخل ہونے کے بعد حالی کی غزل گوئی کا مستقل دور شروع ہوا۔ گمان غالب ہے کہ اس دور کے منتخب و مختصر کلام میں ابتدائی مشق سخن کی چیزیں شامل نہیں۔ ۱۸۷۲ع میں حالی لاہور آ گئے۔ یہاں گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کے تراجم کی اصلاح کے بہانے انھیں مغربی علوم و انگریزی ادب سے بالواسطہ استفادے کا موقع مل گیا۔ انجمن پنجاب کی اصلاحی تحریک سے بھی روشناس ہوئے۔ اسی زمانے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے ذریعے سر سید کے خیالات بھی ان پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ مختصر یہ کہ لاہور آنے کے بعد حالی کے دل سے ''نا معلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت کم ہونے لگی''[1] اور اسی کے ساتھ اردو ادب کی اصلاح کا جذبہ بھی پیدا ہوا جس نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نئی راہ پر ڈال دیا۔ ۱۸۷۴ع میں مولوی عبدالغفور نساخ کا تذکرۂ سخن شعراء شائع ہوا تھا۔ مؤلف تذکرہ

۱۔ ترجمۂ حالی (مشمولہ کلیات ہذا، صفحہ ۱۱)

کی فرمائش پر حالی نے اپنی ۱۴ غزلوں میں سے ۲۵ اشعار خود انتخاب کرکے بھیجے تھے جو ''سخن شعرا'' میں درج ہیں - یہ تمام غزلیں قدیم غزلیات میں شمار کی گئی ہیں - غالباً اسی وجہ سے حالی کی قدیم غزل گوئی کی آخری حد ۱۸۷۴ع متعین کی جاتی ہے - اگرچہ دور قدیم کی آخری غزلوں میں جو قیام لاہور کے ابتدائی زمانے سے متعلق ہیں ، اشعار کا تسلسل اور ماحول کے تاثرات کا بیان ، ایک نئے رجحان کی علامت ہے - بہر حال بہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ قیام لاہور کے دوران ہی میں (یعنی ۱۸۷۴ع کے آخر تک) اُن کی غزل گوئی کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا - جدید دور کی مدت ۱۸۷۴ع سے دیوان کے سنہ اشاعت ، ۱۸۹۳ع تک ہے - اس کے بعد حالی نے کل ۷ غزلیں کہی ہیں - اس طرح قدیم غزلوں کی تعداد ۳۰ اور جدید غزلیں ، بہ شمول غزلیات دور آخر ، تعداد میں ۹۳ ہیں -

یوں تو کلیات حالی میں غزل کا حصہ بہت کم ہے اور حالی کی مقبولیت و شہرت بھی بیش تر اُن کی قومی شاعری اور جدید طرز کی نظموں سے وابستہ ہے لیکن در حقیقت حالی کے ذوق شعر و شعورِ فن کا ظہور غزل میں جتنا ہوا اُتنا کسی اور صنف میں نہیں ہو سکا - اگر وہ غزل کے سوا اور کچھ نہ کہتے تب بھی اُردو شاعری کی تاریخ میں انھیں ممتاز مقام حاصل ہوتا - حالی کی قدیم غزلوں کو بالعموم سراہا گیا ہے کیوں کہ اُن میں تغزل کے بہترین عناصر کا امتزاج ملتا ہے - بقول ڈاکٹر اعجاز حسین ، حالی نے ان غزلوں میں ''میر کے درد ، غالب کے انداز بیان اور شیفتہ کی سادگی اور سچائی کو یک جا کر دیا ہے[1]'' لیکن حالی کی

---

۱ - نئے ادبی رجحانات ، طبع سوم (۱۹۴۶ع) - ص ۳۳ -

اصلاحی و اجتہادی کوششوں کے بارے میں کچھ ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں کہ انھیں حریفِ غزل سمجھا گیا اور ان کی جدید غزل اب تک ہدفِ تنقیص و تضحیک بنی رہی - یہاں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں تاہم بعض نکات کی وضاحت ضروری ہے -

حالی کی قدیم غزلیں جس دور سے متعلق ہیں اسی دور کا فارسی و عربی کلام نظم و نثر بھی ہمارے سامنے موجود ہے جس سے اُن کے مطالعے اور استفادے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے - عصری رجحانات کے برخلاف عربی شاعری سے حالی کا لگاؤ ، ان کے مزاج کی حقیقت پسندی ، سادگی اور خلوص کا غماز ہے - فارسی کلام شاہد ہے کہ صنفِ غزل نے ارتقا کی جتنی منزلیں طے کیں ، حالی کا ذوق سخن خوب سے خوب‌تر کی جستجو میں اُن تمام منزلوں کی راہ و رسم سے آشنا ہو چکا تھا - اپنے عہد کے اساتذۂ فن میں غالب سے خاص عقیدت اُن کی بلند مذاقی کی دلیل ہے - لیکن وہ اپنے میلان طبع کی مناسبت سے فارسی میں سب سے زیادہ سعدی اور اُردو میں میر سے متاثر ہوئے - ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے ، مقلد ہے میر کا[1]

غالب سے انھوں نے نکتہ سنجی اور معنی آفرینی کے اسلوب سیکھے - شیفتہ کے فیضِ تربیت سے واقعیت کے فطری رجحان نے کچھ واضح صورتیں اختیار کیں - شیفتہ کے توسط

---

۱ - یہ شعر دیوان میں نہیں - جواہرات حالی (صفحہ ۱۲۱) میں اخبار ''عصر جدید'' میرٹھ (شمارہ ۷ جنوری ۱۹۱۵ع) کے حوالے سے درج کیا گیا ہے -

سے مومن کی معاملہ بندی اور ''رنگیں نگاری'' کا ہلکا پرتو بھی بہ حد واقعیت و بہ قدر احوال و ظرف ، قبول کیا ۔ یہ سب نقوشِ تاثر اُن کی قدیم غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔ لیکن میرؔ سے اُن کی ہم رنگی کا رشتہ زیادہ گہرا تھا ، چنانچہ ابتدا ہی میں میر کی پُرکار سادگی اور خلوص فن نے انھیں اپنا ہم نوا بنا لیا ۔ اُن کی قدیم غزلوں میں واردات قلبی کا بے ساختہ اظہار ، لب و لہجہ کی معصومیت اور دل فریبی کے بجائے دل گدازی کی کیفیت ، میر کے نشتروں کی یاد دلاتی ہے ۔ میر اور حالی دونوں نہایت حساس اور درد مند انسان تھے ۔ لیکن حالی نہ تو میر کی طرح دروں بیں تھے کہ انفرادی غم کی لذتوں میں کھوئے رہتے اور نہ غالب کی طرح ''گم گشتۂ بیداے خیال'' ہو سکے ۔ ان کے ابتدائی کلام میں بھی کہیں کہیں شکست خواب کی سی کیفیت اور ایک عزم نو کی جھلک نظر آتی ہے ۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

دل پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بالآخر اُن کا اجتماعی شعور اور انسان دوستی کا جذبہ بہت جلد انھیں داخلیت کے طلسمی حصار سے باہر کھینچ لایا اور انھوں نے ماحول کے دکھ درد کو اپنے دل میں بسا لیا ۔
حالی کی قدیم و جدید غزلوں میں احساس و اظہار کا

خلوص ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالی نے اُردو شاعری کے رسمی و تقلیدی عناصر کے خلاف اپنے مقدمے میں شدید احتجاج کیا لیکن وہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی میں غزل کے فرسودہ موضوعات مثلاً رسمی فلسفہ، مسائلِ تصوف، خمریات وغیرہ کو خیرباد کہہ چکے تھے، حالانکہ اس عہد کے جن اساتذہ سے انھوں نے کسبِ فیض کیا یعنی شیفتہ، مومن اور غالب، اُن کے کلام میں بھی رسمی عناصر کم و بیش موجود ہیں۔ حالی کی سلیم الطبعی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اُن کی قدیم غزلوں میں بھی کہیں گل و بلبل کی فرسودہ علامتوں کے سہارے مضمون آفرینی کی کوشش کا شائبہ نہیں ملتا۔ رسمیات کا سد باب کرکے انھوں نے غزل کو ''سراسر حالی'' بنا دیا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

جب وہ انفرادیت کے خول سے باہر نکلے اور اُن کا دل غمِ دوراں سے آباد ہوا تو زمانے کا حال اُن کا حال بن گیا، جگ بیتی آپ بیتی ہو گئی اور اس لحاظ سے اُن کی جدید غزل بھی ''سراسر حالی'' ہے۔ میری مراد صرف یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا پوری طرح محسوس کرکے کہا، مضمون بندی اور قافیہ پیمائی نہیں کی۔

شاعر کی یہ ذہنی توسیع، موضوع شعر میں لامحدود توسیع کا باعث ہوئی۔ پہلے حالی کی حقیقت نگاری کا دائرہ وارداتِ و نفسیاتِ عشق تک محدود تھا، اب زندگی کے وسیع تجربات و مشاہدات پر محیط ہو گیا۔ عشق کے مفہوم اور اس کی

کیفیات میں بھی وسعت اور تنوع پیدا ہوا۔ اب عشق کسی نصب العین سے گہری لگن، سوز حیات، جستجو و آرزو کی خلش و تپش سے عبارت ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو حالی کی جدید غزلیات میں شعور و احساس کی ایک نئی فضا، خیالات کی ایک نئی دنیا نظر آئے گی۔ سیاسی حالات، اخلاق و عمرانی تصورات، قوم کی بربادی پر نوحہ، تعمیر نو کا جذبہ، غرض ہر مضمون غزل کا مضمون بن گیا اور اس طرح غزل حیات و کائنات کی وسعتوں سے ہم کنار ہوگئی۔ تجربے اور مشاہدے کے خلوص نے خارجیت اور داخلیت کی حدیں مٹا دیں۔ اگرچہ کہیں کہیں قومی جذبات کی شدت نے پند سرائی کی صورت اختیار کر لی ہے لیکن معدودے چند مسلسل غزلوں کے سوا، عموماً ہر جگہ حالی کی درد مندی، اور دل سوزی، اُن کے اسلوب اور لہجے کو ناصحانہ انداز تخاطب سے جدا کر دیتی ہے۔ صرف چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم
گم ہے تمھی میں یارو! باغِ ارم تمھارا

دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشت امید
آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ

جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع ناداں
قیدِ ہستی میں مری جان! فراغت کیسی

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

حالی غزل کے مخصوص مزاج اور تغزل کی روایت سے پوری طرح آشنا تھے ، اس لیے انھوں نے اصلاح کا قدم اس احتیاط کے ساتھ اٹھایا کہ غزل زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو جائے اور اس کے مزاج کی بنیادی خصوصیات بھی برقرار رہیں ۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں بھی انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قدیم اسلوب ، جو کانوں میں رچ گئے ہیں ، اُن کو بدستور قائم رکھا جائے اور زبان و بیان کے اسالیب میں آہستہ آہستہ اضافے کیے جائیں ۔ مقدمے کی اشاعت سے پہلے وہ بیس برس تک اپنی جدید غزلوں میں اسی اُصول پر عمل کرتے رہے ۔ لیکن حالی کی توسیعی و اصلاحی کوششوں کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ وہ تغزل کے مانوس پیرایۂ بیان اور غزل کے مخصوص علائم و رموز کے مخالف ہیں ۔ حالانکہ حالی کا اعتراض اس رسمی و تقلیدی شاعری پر ہے جس کے ہاتھوں غزل کی علامتیں ، وسیلۂ اظہار کے بجائے مستقل مضمون بن گئیں ۔ "دشنہ و خنجر" محض دشنہ و خنجر رہ گئے ، اُن کے پیچھے "ناز و غمزہ" کا کوئی اشارہ باقی نہ رہا ۔ مثلاً ایک اُستادانہ غزل کا مطلع ملاحظہ ہو :

میں نے اُن کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا ، دل رکھ دیا ، سر رکھ دیا

حالی کی غزلوں میں اس قسم کے اشعار ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے اور اسی لیے ان کے یہاں فرسودہ علامتوں اور

استعاروں کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ تاہم حالی نے غزل کی تمام علامتیں اس سلیقے سے برتی ہیں کہ اُن میں ایک نئی جان آ گئی ہے ۔ حالی کی جدید غزلوں میں سے بہار و خزاں ، برق و نشیمن ، بادہ و ساغر، کشتی و طوفاں ، منزل و کارواں وغیرہ مختلف علامتوں اور ان کے تلازموں کے معنی‌خیز و خیال افروز استعمال کی درجنوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ لیکن یہاں صرف ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔ انیسویں صدی کے انحطاطی دور غزل گوئی میں تغزل کا یہ نکھار اور یہ ایمائی حسن ، دیوان حالی کے سوا اور کہاں نظر آئے گا ؟

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ
دیکھ اس خرامِ ناز پہ اتنا نہ کر دماغ
یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ
دو چار گام نقشِ قدم مل کے رہ گئے
آگے چلا نہ آہوے مشکیں کا کچھ سراغ
آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہل ظرف ہوں
ساقی بھرے کھڑا ہے مئے لعل سے ایاغ
جنگل میں تختۂ گلِ خود رو کو دیکھ کر
تازہ ہوا زمانے کی ناقدریوں کا داغ
حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں
باری تب اُن کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

حالی کی قدیم غزلوں میں کوئی غزل غیر مردف نہیں لیکن جدید دور میں ایسی ۱۹ غزلیں ملتی ہیں ۔ قدما کے بعد مختلف اکھاڑوں کے ''استاد'' سنگلاخ زمینوں اور

طویل طویل ردیفوں میں خوب خوب زور آزمائیاں کرتے رہے۔ دبستان لکھنؤ میں تو غیر مردف غزل کہنا یک قلم متروک ہو گیا۔ شاعری قافیہ پیمائی ہو کر رہ گئی۔ حالی نے ارتقاے غزل کی راہ کے یہ روڑے ہٹا دیے۔ صنعت گری اور محاورہ بندی کی بد مذاقیاں دور کرکے لفظ و معنی میں جسم و جان کا رشتہ قائم کیا۔ مصنوعی ریزہ خیالی کی جگہ غزل کے اشعار میں داخلی ربط اور وحدت تاثر کی کیفیت پیدا کی۔ مسلسل غزلیں بھی لکھیں لیکن حمد و نعت کو چھوڑ کر مسلسل غزلوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں اور ان میں بھی کئی غزلوں میں معنوی ہم آہنگی کے باوجود اشعار کی انفرادیت مجروح نہیں ہوئی۔ بہر حال یہ ایک تجربہ تھا جسے ''ایک خطرناک قدم'' قرار دینا مناسب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی نے تنقید غزل اور اصلاح غزل کے سلسلے میں جس توازن، اعتدال اور شعور فن کا ثبوت دیا اس کی نظیر موجودہ صدی کی منظم ادبی تحریکیں بھی نہیں پیش کر سکیں۔ جب ہم سلیم پانی پتی اور جوش ملیح آبادی کی نظم نما غزلیں پڑھتے ہیں، جن کی میکانکی ہم آہنگی سے روحِ غزل پناہ مانگتی ہے اور اُن تخریبی ہنگاموں پر نظر ڈالتے ہیں جو اس ''نیم وحشی صنف سخن'' کے خلاف برپا ہوئے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں ہمارا تنقیدی شعور اور مذاق سخن، حالی کی سطح سے کچھ زیادہ بلند نہیں ہوا۔

★

فصل دوم قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ دیوان حالی میں غزلوں کے قطعہ بند اشعار کے علاوہ تین قسم کے قطعات ہیں۔ اول وہ ۶۷ قطعات جو مختلف عنوانات

کے تحت دیوان کے ابتدائی حصے میں جمع کر دیے گئے ہیں - دوم، متفرق مدحیہ و سپاسیہ قطعات جو قصیدوں اور دیگر نظموں کے ساتھ درج ہیں - سوم ، بعض فرمائشی قطعات اور قطعات تاریخ جو دیوان کے آخری حصے (اشعار متفرقہ) میں چھپے ہیں - دیوان کے علاوہ کلام حالی کے مختلف مجموعوں میں کئی نظمیں قطعات کی صورت میں ہیں - اس فصل میں صرف قسم اول کے قطعات شامل ہیں - فرمائشی قطعات اور وہ تمام قطعات جو کسی خاص تقریب سے متعلق ہیں ، اپنے موضوع کی مناسبت سے تیسری فصل میں قصائد کے ساتھ ترتیب دیے گئے ہیں - قطعات تاریخ ، آخری فصل (متفرقات) میں درج ہیں - شیخ محمد اسماعیل نے ، اصنافی ترتیب ملحوظ رکھتے ہوئے ، کلیات نظم حالی جلد اول کے پہلے حصے میں ۸۳ قطعات جمع کیے ہیں - پھر بھی بعض قطعات رہ گئے - مثلاً حالی کی نظم ''مناظرۂ واعظ و شاعر'' ان قطعات میں شامل نہیں - ۱۳۹ اشعار کی یہ طویل نظم ہیئت کے لحاظ سے قطعہ ہے - اصنافی ترتیب کے اصول کے مطابق اسے قطعات کے حصے میں درج ہونا چاہیے - دراصل اصنافی ، زمانی یا موضوعاتی ترتیب میں سے کسی ایک اصول کی سختی سے پیروی کرنا بڑی قباحتوں کا موجب ہوتا ہے - ''مناظرۂ واعظ و شاعر'' کو موضوع و اسلوب کے اعتبار سے دیگر مناظراتی نظموں سے یک گونہ مناسبت ہے لہٰذا اسے فصل پنجم میں جگہ دی گئی ہے -

دیوان میں قطعات کی کوئی ترتیب نہیں - یہاں تمام قطعات موضوع کے لحاظ سے درج کیے گئے ہیں - مثلاً بعض قطعات شعر و ادب کے بارے میں حالی کے تنقیدی نظریات

کی ترجمانی کرتے ہیں ، انھیں ''تنقیدی قطعات'' کے عنوان سے یکجا کیا گیا ہے ۔ اسی طرح سیاسی ، اخلاقی ، معاشرتی ، طنزیہ و مزاحیہ قطعات الگ الگ عنوانات کے ذیل میں درج ہیں ۔ اس ترتیب سے حالی کے قطعات کے تنوع کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔ لیکن رباعیات کے بارے میں ادواری (زمانی) ترتیب زیادہ مناسب معلوم ہوئی ۔ دیوان حالی میں قدیم و جدید رباعیاں الگ الگ درج ہیں ۔ دیوان کی اشاعت کے بعد بلکہ زندگی کے آخری دور میں بھی جب شعر گوئی کی طرف حالی کی توجہ کم ہوگئی تھی ، رباعیات کا سلسلہ جاری رہا ۔ اس طرح تین دور قائم ہو گئے جن کے تحت ۱۶۰ رباعیات کا کُل سرمایہ احتیاط سے مرتب کیا گیا ہے[۱] ۔

آردو شاعری میں حالی سے پہلے قطعے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی ۔ کبھی کبھی غزل میں قطعہ بند اشعار آ جاتے تھے ۔ غزل سے علیحدہ صرف تاریخ گوئی یا معذرت و تہنیت کے مواقع پر اس صنف سے کام لیا جاتا تھا ۔ حالی

---

۱ ۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے اپنے تحقیقی مقالے میں رباعیات کی صحیح تعداد درج نہیں کی ۔ وہ لکھتے ہیں : ''اب تک حالی کی ۱۵۳ رباعیات کا علم ہوا ہے جن میں سے ۱۵۰ کلیات نظم حالی جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل میں موجود ہیں ۔ بقیہ تین رباعیاں نواب محسن الملک کی خدمات پر ہیں'' ۔ (''حالی بحیثیت شاعر'' صفحہ ۲۳۴) ۔ فاضل محقق نے جن تین رباعیوں کا ذکر کیا ہے ، ان کے علاوہ حالی نے محسن الملک کی وفات پر پانچ رثائی رباعیاں اور لکھی تھیں ۔ نیز اخبار ہمدرد دہلی کے اجرا اور ہنگامۂ کانپور سے متعلق چار آخری رباعیاں (مصنفہ ۱۹۱۳ع) بھی دستیاب ہو چکی ہیں ۔ اس طرح رباعیات کی کل تعداد ۱۶۰ ہے ۔

نے اپنی ہمہ گیر اصلاحی مہم میں قطعے کو وسیلۂ اظہار بنا کر اسے ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت عطا کی اور اس حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے دیوان میں سب سے پہلے جگہ دی۔ رباعی بھی عموماً خانہ پری یا اظہار قادر الکلامی کے لیے کہی جاتی رہی۔ البتہ مرثیہ گو شعراء خصوصاً میر انیس نے رباعی کا ایک بلند معیار قائم کیا۔ یہ صنف جو قدماے فارسی کے یہاں فلسفہ و حکمت اور اخلاق و معرفت کے سنجیدہ مضامین کے لیے مخصوص تھی، حالی کے اصلاحی مقاصد سے بے تکلف ہم آہنگ ہوگئی اور اپنے اختصار کی وجہ سے زندگی کے آخری دور میں بھی ان کی دم ساز بنی رہی۔ حالی کے قطعات و رباعیات کا فنی مرتبہ کچھ زیادہ بلند نہیں۔ طنز و مزاح، حکایت و مطائبہ کی رنگ آمیزی کے باوجود کہیں کہیں اُن کے قطعات کا زور، طوالت پسندی کی وجہ سے گھٹ جاتا ہے۔ حالی کی نکتہ سنجی رباعی میں جان ڈال دیتی ہے لیکن اُن کے مزاج کا دھیما پن تیسرے اور چوتھے مصرعوں کو زیادہ اُبھرنے اور چمکنے نہیں دیتا۔ حالی کا اجتہادی کارنامہ یہ ہے کہ قطعہ اور رباعی کے موضوعات و اسالیب میں تنوع پیدا کیا اور کثیر تعداد میں قطعات و رباعیات لکھ کر ان اصناف کو اُردو شاعری میں مقبول عام بنایا۔

فصل سوم میں مکمل و نا مکمل قصائد اور وہ تمام نظمیں زمانی ترتیب سے یک جا کر دی گئی ہیں جو اگرچہ قطعہ یا ترکیب بند یا مسدس کی صورت میں ہیں لیکن موضوع و مافیہ کے اعتبار سے صنف قصیدہ سے قریب تر ہیں۔ ان میں سے بیش تر نظمیں کسی خاص تقریب سے

متعلق اور سپاس و تشکر یا مدح و تہنیت کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

حالی کے مکمل قصائد کل سات ہیں جن میں سے ایک قصیدہ، یعنی قصیدۂ غیاثیہ جو ''عرض حال'' (بجناب سرور کائنات علیہ افضل الصلواۃ) کے عنوان سے مشہور ہے، یہاں عمداً درج نہیں کیا گیا۔ اسے مسدس کے ساتھ حالی کی قومی و ملی شاعری میں جگہ دینا مناسب معلوم ہوا۔ اسی طرح ایک نظم ''شکریۂ والیِ رام پور'' (ترکیب بند) بھی اپنے عنوان کے تقاضے کے باوجود، قصائد کے بجائے فصل نہم کی تعلیمی و تحریکی نظموں میں شامل کی گئی۔ اس ترکیب بند میں شخصی مدح کا عنصر برائے نام ہے، زیادہ تر قومی تعلیم کی اہمیت کا ذکر ہے یا تعصب اور جاہلانہ رسم و رواج کے خلاف جہاد کی تلقین کی گئی ہے۔

جدید ادبی مذاق کو قصیدے کے نام سے چڑ ہے لیکن اگر قارئین زحمت توجہ گوارا فرمائیں تو اس فصل میں بھی حالی کے اجتہادِ فن اور شاعرانہ عظمت کے شواہد نظر آئیں گے۔ مطالعے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہوگا کہ حالی جیسا حقیقت پسند شاعر جو فطرتاً سادگی و خلوص کی طرف مائل ہے، قصیدے جیسی صنف سخن کے ساتھ، جس کی بنیاد ہی مبالغہ و تصنع پر قائم ہے، کس طرح نباہ کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حالی تو یہاں بھی وہی حالی ہے، البتہ قصیدے کی کایا پلٹ چکی ہے۔ فارسی و اردو شاعری کی ہزار سالہ تاریخ میں سعدی کے بعد غالباً حالی وہ تنہا شاعر ہے جس کے قصائد مبالغہ آرائی اور

لفاظی کی جگہ سادگی اور خلوص پر مبنی ہیں۔ حالی کے معاصرین میں سے کئی اساتذۂ فن ، قدیم درباری روایات کے مطابق رام پور اور حیدر آباد کے والیان ریاست کی مداحی کرتے رہے لیکن حالی نے ان رؤسا کی قومی و ملکی خدمات کو قصیدے کا موضوع بنایا۔ نواب کلب علی خاں (والیِ ریاست رام پور) نے قومی کاموں میں سبقت کی تھی اور ان کی مدح میں حالی کا قصیدہ (مرتبہ ۱۸۷۰ع) جدید طرز کا پہلا قصیدہ ہے جس میں کسی قدر تکلف کا شائبہ پایا جاتا ہے لیکن بعد کے قصائد میں واقعیت اور خلوص کا رنگ گہرا ہوتا چلا گیا ہے۔ چنانچہ نظام حیدرآباد کے جشن جوبلی کے موقع پر قصیدہ لکھنے کے لیے وہ مولوی عبدالحق سے حضور نظام کے ذاتی اوصاف اور رفاہ عامہ کے کاموں کی تفصیل دریافت کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ''مجھے بے سر و پا مدح سرائی اور بھٹئی کرنی نہیں آتی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ قصیدے میں سر تا پا فیکٹس اور واقعات کا بیان ہو[۱]۔'' غرض ، ابتدائی دور کے نعتیہ قصیدے ہوں یا مدحیہ و سیاسیہ نظمیں ، (چند فرمائشی چیزوں کے سوا) ہر جگہ خلوص و عقیدت اور تحسین و ستائش کا فطری جذبہ کارفرما ملے گا۔ یہی جذبہ تھا جس نے ستر برس کی عمر میں انھیں جواں سال (مولانا) ظفر علی خاں کی قومی خدمات کو بے ساختہ سراہنے پر مجبور کر دیا۔

فصل چہارم میں ۷ مرثیے سنہ تصنیف کی ترتیب سے درج ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے اپنے مقالے میں حالی کے

۱۔ مکتوبات حالی ، حصہ اول (طبع اول ۱۹۲۵ع)۔ صفحہ ۵۹۔

مرثیوں کی تعداد ۵ بیان کی ہے اور اُن کے عنوانات بھی لکھے ہیں[1] ۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل دو مرثیے شامل نہیں جو جواہرات حالی میں شائع ہو چکے ہیں :

۱ ۔ نوحۂ قیصرۂ ہند ۲ ۔ سر سید کے دو رفیق

اُردو میں ''مرثیہ'' سے عموماً شہدائے کربلا کا مرثیہ مراد لیا جاتا ہے ۔ حالی سے پہلے عام شخصی مرثیے کا میدان خالی پڑا تھا ۔ اگرچہ حالی مرثیہ گو شعراء کی فنی عظمت کے معترف تھے لیکن سب سے پہلے انھی کو یہ احساس ہوا کہ ''صرف واقعات کربلا کو مرثیے کا موضوع بنانا شاعری کو محدود کرنا ہے ۔'' انھوں نے مرثیے کی تنگ دامنی کا یہ علاج تجویز کیا :

''شاعر جو کہ قوم کی زبان ہوتا ہے ، اس کا فرض ہونا چاہیے کہ جب کسی کی موت سے اس کے یا اس کی قوم یا خاندان کے دل کو فی‌الواقعہ صدمہ پہنچے ، اس کیفیت یا حالت کو جہاں تک ممکن ہو ، درد اور سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے[2] ۔''

اُردو شاعری میں حالی کی اجتہادی اور توسیعی کوششوں کا آغاز لاہور کے جدید مشاعروں کے بعد ہوا ۔ لیکن مرثیہ وہ صنف ہے جس میں حالی اس تحریک سے پہلے ہی نقش نو کی طرح ڈال چکے تھے ۔ ۱۸۶۹ع میں انھوں نے اپنے محبوب اُستاد مرزا غالب کی یاد میں ، داخلی جذبے ،

---

۱ ۔ حالی بحیثیت شاعر ، صفحہ ۲۲۷ ۔
۲ ۔ مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی)، صفحہ ۲۷۳ ۔

فنی رکھ رکھاؤ اور کلاسیکی تناسب و توازن کے امتزاج سے دس دس شعروں کے دس بند پر مشتمل ایک حسین ادبی تاج محل تعمیر کیا جو اردو میں جدید طرزِ مرثیہ گوئی کا پہلا شاہکار ہے۔ ''مرثیۂ غالب'' خود غالب کی شخصیت اور فن کی طرح عظیم و بے مثال ہے۔ اردو کیا، فارسی میں بھی اس پائے کے شخصی مرثیے کم ہی ملیں گے۔ حالی قومی مرثیہ گو تھے۔ سچ پوچھیے تو شخصی مرثیوں میں بھی ان کے وہی مرثیے کامیاب ہیں جن میں ذاتی درد و غم کے ساتھ قومی زیان و محروسی کا احساس بھی شامل ہے۔ غالب اور حکیم محمود خاں کا مرثیہ محض ایک فرد کا مرثیہ نہیں بلکہ مغل تہذیب اور دلی کی ثقافتی عظمت کا مرثیہ ہے۔

فصل پنجم میں مناظمۂ لاہور کی مثنویوں کے علاوہ وہ تمام نظمیں زمانی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں جو بہ اعتبار موضوع و اسلوب ''نیچرل'' (یا حقیقت پسندانہ) شاعری کے ضمن میں آتی ہیں۔ اس طرح دو کے سوا حالی کی سبھی مثنویاں اس فصل میں سما گئی ہیں۔ ''مناجاتِ بیوہ'' کا ایک اور ہی عالم ہے۔ مثنوی ''گدایانِ قوم'' بھی تعلیمی و تحریکی نظموں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن ''مناظرۂ واعظ و شاعر'' کا مکالماتی اسلوب، قطعے کی ہیئت کے باوجود، اسے اس فصل کی کئی نظموں سے ہم رشتہ کر دیتا ہے۔

نظم جدید کی تحریک، ایک وسیع تر تہذیبی و تعلیمی تحریک کا نتیجہ تھی جو شمالی ہند میں نئے نظامِ تعلیم کے قیام و استحکام کے لیے چند علم دوست، مشرق آشنا انگریز حکام کی رہنمائی میں شروع ہوئی - ۱۸۶۰ع کے لگ بھگ

مرکزی مقامات کے علاوہ پنجاب اور یوپی کے کئی شہروں میں علمی و ثقافتی انجمنیں قائم ہوئیں۔ متعدد اخبار و رسائل نئے علوم اور نئے خیالات کی ترویج و اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ محکمۂ تعلیم کی سرپرستی میں نئے طرز کے مدارس کی نصابی ضروریات کے لیے نئی نئی کتابیں ترجمہ و تالیف ہونے لگیں۔ اس سلسلے میں انجمن پنجاب کی اصلاحی کوششیں اردو کے حق میں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے مناظمے جدید شاعری کے آغاز کا ایک وسیلہ بن گئے۔ ان مناظموں میں آزاد اور حالی کے علاوہ کئی شعرا مثلاً انورحسین ہما، اشرف بیگ اشرف، الٰہی بخش رفیق، محمد مقرب علی، ولی دہلوی، قادر بخش رفیق، عطاءاللہ، علاؤالدین محمد وغیرہ شریک ہوئے۔ لیکن قدامت و جدت کا ہنر مند پیوندکار اور نئے خیالات کو اپنے شعور میں رچا بسا کر مانوس شعری اسالیب کے سانچوں میں ڈھالنے والا حالی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لہٰذا نظم جدید کی مقبولیت کا سہرا حالی کے سر رہا۔ حالی کی ''پیرویِ مغربی'' کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھوں نے شاعری اور زندگی کے رشتے کو استوار کیا اور تخیل کو ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے بجائے تجربات و مشاہدات کے مواد سے کام لینا سکھایا۔ لیکن حالی نے مصحفی و میر کی میراثِ سخن کو بھی ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ حالی اور آزاد کی جدید نظموں کے تقابلی مطالعے سے ظاہر ہوگا کہ زبان پر قدرت اور جولانیِ تخیل کے باوصف، آزاد کے اشعار بے آہنگ اور ان کا لہجہ اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ انھوں نے سہولت بیان

کی غرض سے مثنوی کی مروجہ بحروں سے قطع نظر کر کے طویل بحریں اختیار کیں لیکن اُن کی نظموں میں زبان کی وہ سادگی، شیرینی اور گھلاوٹ، بیان کی وہ صفائی، روانی و برجستگی نہیں ہے جو حالی کے چھوٹے چھوٹے ڈھلے ڈھلائے مصرعوں والی مثنویوں میں ہے۔

اُردو مثنوی کا دائرہ صرف عشقیہ داستانوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ مثنوی نگاروں نے اسی محدود دائرے میں مثنوی کے وصفیہ و بیانیہ آرٹ کو چمکایا۔ مثنوی کے فنی آداب اور کلاسیکی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے حالی نے اس صنف کی وسعتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسے نئے خیالات کے اظہار اور معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ آج ہماری نظروں میں ان مثنویوں کی کوئی اہمیت نہیں لیکن ایک صدی قبل روایت اور جدت کا یہ حسین امتزاج اُردو شاعری میں ایک ''کارنامہ'' سمجھا گیا تھا۔ چنانچہ سر سید، تہذیب الاخلاق (یکم محرم ۱۲۹۲ھ) میں لکھتے ہیں:

''مولوی خواجہ الطاف حسین --- کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی ''مناظرۂ رحم و انصاف'' جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے، درحقیقت ہمارے علم ادب کا ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائیِ بیان، عمدگیِ خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔''

''مناظرۂ رحم و انصاف'' میں حالی نے بعض قدیم فارسی شعرا کے تمثیلی و مکالماتی اسلوب کا احیا کیا۔ پھر اس رنگ میں کئی نظمیں لکھیں۔ اخلاق آموزی کا یہ دلچسپ پیرایہ اردو مثنویوں کے لیے نیا تھا۔ ان نظموں میں منطقی استدلال کے علاوہ شاعرانہ تخیل کی نکتہ آفرینی کا انداز بھی انوکھا ہے۔ یہاں ہم تخیل کو خلا میں پرواز کرنے یا مبالغہ و اغراق کے کرتب دکھانے کے بجائے زندگی کے مسائل کا تجزیہ اور حقیقت کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مثنوی تعصب و انصاف میں قومی کردار، علماء کی خام خیالی، تعصب و تنگ نظری کا تجزیہ اور ''مناظرۂ واعظ و شاعر'' میں واعظ و شاعر کی نفسیاتی تحلیل جس صداقت اور لطیف طنز و مزاح کی رنگ آمیزی کے ساتھ کی گئی ہے، اس کی مثال بھی اور کہیں نہیں ملتی۔ بعض نظموں میں اصلاحی مقصدیت کا سلسلہ علی گڑھ تحریک سے جا ملا ہے۔ خصوصاً کلمۃالحق اور تعصب و انصاف میں سر سید کی شخصیت اور اُن کے خیال کا پرتو صاف نظر آتا ہے لیکن فصل سوم کے بعض قطعات و قصائد کی طرح انھیں بھی اُن نظموں میں شامل کرنا مناسب معلوم نہ ہوا جو خالصتاً تحریکی مقاصد کی تبلیغ کے لیے لکھی گئی تھیں۔

فصل ششم بچوں کی نظموں پر مشتمل ہے۔ یوں تو فصل پنجم کی بیش تر نظمیں گزشتہ ایک صدی کے دوران میں برابر درسی کتابوں کی زینت بنی رہیں لیکن بچوں کے شاعر کی حیثیت سے حالی کو بہت کم لوگ جانتے پہچانتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچوں کے ادب پر جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں اُن

میں بھی صرف حالی کی مشہور مثنویوں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اور انھی نظموں کی اخلاقی و مقصدی نوعیت کے پیش نظر حالی کو بچوں کا ایک ناکام شاعر ثابت کیا گیا ہے ۔

انیسویں صدی کے اواخر میں محکمۂ تعلیم کی ترغیب سے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی گئیں ۔ ان نظم نگاروں میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ۔ موصوف نے ۱۸۹۳ع میں ابتدائی جماعتوں کے لیے درسی کتابوں کا ایک سلسلہ مرتب کیا تھا جو ان کی دل چسپ نظموں کی وجہ سے بہت مقبول ہوا ۔ حالی کی یہ نظمیں بھی سررشتۂ تعلیم کی فرمائشوں اور تقاضوں کا نتیجہ ہیں ۔ ۱۹۰۸ع میں مسٹر ایچ ۔ ٹی ۔ نولٹن ، پرنسپل ٹریننگ کالج لاہور کی نگرانی میں بچوں کی نظموں کا ایک مجموعہ ''اطوار بازیچہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں حالی کی متعدد نظمیں درج تھیں ۔ کچھ نظمیں ''بچوں کا اخبار'' لاہور میں چھپیں ۔ ان نظموں میں حالی نے درس آموزی کے علاوہ بچوں کی نفسیات و رجحانات کا بھی خیال رکھا ہے ۔ سیدھی سادی زبان اور ہلکی پھلکی بحروں میں کئی نظمیں بچوں کے مختلف تفریحی موضوعات سے متعلق ہیں ۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی طرح حالی بھی بچوں کی دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے گہری دل چسپی رکھتے تھے ۔ مقصدی نظموں میں بھی ناصحانہ تخاطب کی جگہ عموماً بیانیہ اور متکلمی انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ قوم کے نونہالوں کی شخصیت و کردار کی تعمیر کے لیے حالی نے جس پہلو پر خاص زور دیا ہے وہ یہ تصور ہے کہ دنیا میں کوئی کام

اور کوئی پیشہ بذات خود ذلیل نہیں ؛ محنت اور خدمت ہی انسانی زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔

★

کلیات کی جلد اول ، حالی کی شاعری کی انھی شش جہات پر مشتمل ہے۔ متناسب ضخامت کے خیال سے جلد دوم کا آغاز فصل ہفتم سے کرنا پڑا۔ اس فصل میں صرف دو نظمیں شامل ہیں : ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد''۔ موضوع کے اچھوتے پن اور مجموعی تاثیر و تاثر کے لحاظ سے ان نظموں کی انفرادیت اتنی نمایاں ہے کہ ان کے لیے ایک علیحدہ فصل قائم کرنا ضروری تھا۔ حالی نے متعدد و متنوع موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ نیچرل شاعری کی طرح قومی و اصلاحی شاعری میں بھی اُن کے کئی ہم نوا پیدا ہو گئے ، لیکن طبقۂ نسواں کی ہم‌دردی و دل سوزی میں وہ تنہا نظر آتے ہیں۔ بعض نقادوں نے حالی کی ان نظموں کو بھی علی‌گڑھ تحریک کے ادبی ثمرات میں شمار کیا ہے ، حالانکہ خود سرسید نے تعلیم نسواں یا عورتوں کے دیگر مسائل کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اگر حالی کے گہرے معاشرتی شعور اور جذبۂ اصلاح کو علی گڑھ تحریک کا فیضان سمجھا جائے ، تب بھی ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس مظلوم طبقے کی بے بسی کو پوری شدت سے محسوس کرنے کے لیے جس حساس اور درد آشنا دل کی ضرورت تھی وہ حالی کے سوا کسی شاعر کے پہلو میں نہیں تھا۔ مناجات بیوہ میں انھوں نے جس خلوص سے ایک بیوہ کے دکھ درد کو اپنایا ہے اور جس پُر تاثیر پیرائے میں اس کے جذبات کی ترجمانی کی ہے ، اس کی مثال خود حالی کے کلام میں بھی بہت کم ملتی ہے۔

حالی کی زبان و بیان میں سادگی کی خصوصیت ہر جگہ موجود ہے لیکن یہ نظم سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے۔ موضوع کی رعایت سے شاعر نے پوری نظم میں گھریلو زبان کے ہلکے پھلکے ، سبک و شیریں بول استعمال کیے ہیں۔ معاشرتی پس منظر کی عکاسی اور بیوہ عورت کے فطری جذبات کی ترجمانی کے لیے جا بجا موزوں تشبیہات اور لطیف اشاروں ، کنایوں سے کام لیا ہے۔ محترمہ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں :

''مجھے مناجات بیوہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی باوجود مرد ہونے کے ایسا درد آشنا ، ایسا حساس ، اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کم سن بیوہ کے صحیح جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ سب کچھ خود اس پر بیت چکا ہو۔ لیکن یہی تو اصلی شاعر کا کمال ہے کہ ہر ایک کی بیتی خود اس پر گزرتی ہے اور تب ہی وہ ایسی زندۂ جاوید چیز لکھ سکتا ہے ، جیسی مناجات بیوہ''[1]۔

''مناجات بیوہ'' کی زبان کا جادو سب پر چھا گیا۔ اردو داں طبقے کے علاوہ ہندی والوں میں بھی یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ، یہاں تک کہ ''سنسکرت میں بھی ترجمہ کی جا چکی ہے۔[2]'' بابائے اردو نے ایک مرتبہ مہاتما گاندھی کو لکھا تھا کہ اگر آپ اس زبان کا نمونہ دیکھنا چاہیں

---

۱ - یادگار حالی (طبع اول ، دہلی) ، صفحہ ۱۹۳ -
۲ - حالی بحیثیت شاعر ، صفحہ ۲۲۴ -

جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ، تو حالی کی ''مناجات بیوہ'' پڑھیے -

''چپ کی داد'' میں حالی نے نہ صرف عورتوں کے مظلوم طبقے کی وکالت کی ہے بلکہ خاتون مشرق کے کردار کی ایک مثالی تصویر بھی کھینچ دی ہے - ہماری شاعری میں عورت کا تصور محض رومان و تغزل کی خیالی رنگینیوں تک محدود رہا - اپنے فرضی آلام و مصائب کے شکوہ سنج شعرا جنس لطیف کی زندگی کے حقیقی المیوں کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوئے - حالی نے عورت کو ماں ، بہن اور بیٹی کے روپ میں بھی دیکھا اور ہمیں پہلے پہل یہ احساس دلایا کہ وہ عورت جس کے بے پایاں ایثار و خدمت اور مہر و محبت کے طفیل میں ہمیں معاشرتی زندگی کی حلاوتیں اور سعادتیں نصیب ہیں اور جس کے دم قدم سے ہماری تہذیبی روایات کا بھرم قائم ہے ، صدیوں سے اب تک کس طرح گوناگوں مظالم کا شکار رہی ہے -

مسدس کی اشاعت (۱۸۷۹ع) کے بعد حالی کی قومی شاعری کا سلسلہ برابر جاری رہا اور انھوں نے علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی تبلیغ کے لیے متعدد نظمیں لکھیں - لیکن مسدس حالی ، شکوۂ ہند اور قصیدۂ غیاثیہ (عرض حال) کی حیثیت ان تحریکاتی نظموں سے قدرے مختلف ہے - فصل ہشتم کی یہ نظمیں گہرے قومی و ملی شعور پر مبنی اور درد و سوز سے معمور ہیں - اس میں شک نہیں کہ حالی کے ملی تصورات میں ماضی اور حال کے تاریخی رشتے کے باوصف وسعت اور ہمہ گیری نہیں ہے - اقبال کا تصور ملت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے - لیکن حالی کا تعلق جس

بحرانی دور سے تھا ، اس کے تقاضوں نے اُن کے ذہن و فکر کے دائرے کو ہندی مسلمانوں کے مسائل تک محدود کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے اس نازک دور میں محدود قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں کی تنظیم ، تحریک احیائے ملت کے آغاز کے لیے اولین شرط تھی ۔

مسدس میں شیرازۂ ملت کے اجزائے پریشاں کے انفرادی انحطاط و انتشار کی تفصیل یا خارجی طاقتوں کی سازشوں اور آویزشوں کا ذکر نہیں کیا گیا ۔ لیکن حالی نے زوال کے داخلی اسباب کا تجزیہ اس خوبی سے کیا ہے اور موجودہ حالات کی ایسی مفصل و مکمل تصویر پیش کی ہے کہ ہمیں ملت کے عروج و زوال کی اس داستان میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ۔ ملت اسلامیہ کی سیزدہ صد سالہ زندگی کی طویل داستان ، نسبتاً ایک مختصر نظم میں بیان کرنے کے لیے فنی ہنر مندی کے علاوہ تاریخی عوامل کے واضح شعور اور صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی ضرورت تھی ۔ حالی جانتے تھے کہ مد و جزر اسلام کی کہانی عرب و عجم کے شاہناموں سے کس حد تک مختلف ہوگی ۔ لہٰذا انھوں نے رزم و بزم اور حرب و ضرب کے ہزاروں کارناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اُن بنیادی اقدار پر اپنی توجہ مرکوز رکھی جن کے فروغ یا فقدان پر اسلامی تحریک کے عروج یا زوال کا انحصار تھا ۔

علی گڑھ تحریک نے حالی کی شاعری کا رخ موڑا تھا ؛ مسدس حالی نے خود اس تحریک کا رخ قبلۂ مغرب سے مغرب قبلہ کی طرف موڑ دیا ۔ اس سے پہلے تحریک کا مطمح نظر انگریزی اور انگریزیت کے سوا اور کیا تھا ؟

لیکن مسدس کا شاعر جب اپنی خودی میں ڈوب کر ابھرا تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی تھی کہ قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے مغرب کی اندھی تقلید درکار نہیں۔ اسلام کی ابدی تعلیمات اور تہذیبی اقدار ماضی کی طرح آج بھی ہماری ملی بقا و ارتقا کی ضامن ہیں۔ پہلے دانایان فرنگ کے حوالے سے جدید علوم کی تبلیغ کرنے والوں پر کفر کے فتوے لگتے لیکن حالی نے جب تاریخ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے حوالے سے کہا :

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر
ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ حکم پیمبر
کہ "حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو"

تو پوری قوم نے یہ محسوس کیا گویا ایک بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا گیا ہے۔

مسدس ہماری قومی زندگی اور قومی شاعری کا سرچشمہ ہے۔ حالی سے پہلے اردو میں ایسی کوئی نظم نہیں ملتی جو مبالغے، لفاظی اور مختلف تکلفات شعری سے عاری ہونے کے باوجود اپنی مجموعی ہیئت و تشکیل کے اعتبار سے اتنی مکمل و مربوط، مقاصد میں اتنی اعلی اور اثر و نفوذ کے لحاظ سے ایسی انقلاب آفریں ہو۔ حالی نے از رہِ انکسار اسے "آبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن" کہا ہے لیکن بعض فن پرستوں کے سوا پوری قوم کے اہل دل اور ارباب نظر اس نظم کے پُرسوز آہنگ اور پرکار سادگی سے

متاثر ہوئے۔ حالی کا سب سے بڑا ادبی اجتہاد یہ ہے کہ انھوں نے شعر کے اسلوب و لفظیات کو جمہوری سطح سے قریب کر دیا۔ چونکہ مسدس میں اُن کا خطاب پوری قوم کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ طبقے سے ہے لہٰذا دیگر نظموں کے مقابلے میں اس کی زبان زیادہ صاف و سادہ ہے۔ اس عوامی زبان میں شیرینی اور لطافت، روانی اور برجستگی، ایجاز و اختصار کی خوبیاں یوں ہی نہیں پیدا ہو گئیں، یقیناً یہ خوبیاں شاعر کی پُر خلوص فکری کاوشوں اور کاہشوں کا نتیجہ ہیں۔ اسی لیے حالی نے اپنے دیباچے میں اسے "جانکاہ نظم" کہا ہے۔ مسدس کے طبع سوم میں نظر ثانی کے بعد جو ترمیمیں کی گئیں، اُن سے شاعر کی جاں کاہی کا مزید ثبوت ملتا ہے۔

حالی نے مسدس کے دیباچے میں جس مردِ بزرگ کا ذکر اس تکلف و اہتمام سے کیا ہے، اُس کی رہنمائی اور فرمائش بجا، لیکن محض خارجی تحریک سے کوئی ادبی شہ پارہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ مسدس تو خود اُس مرد بزرگ کی توقعات سے بھی کہیں زیادہ بلند درجے کا شہکار تھا۔ سر سید کا وہ خط (مشمولہ کلیات ھٰذا) ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے پر جوش الفاظ اور والہانہ انداز میں مسدس کی داد دی ہے۔ یہ تحسینِ ناشناس، یا مشاعرے کی رسمی واہ واہ نہیں، اپنے عہد کے سب سے بڑے رہنما، مفکر اور ادیب کا مخلصانہ اعتراف کمال ہے۔ کوئی ادنیٰ صلاحیتوں کا انسان، کوئی اندھا مقلد اپنے رہنما کے اس اعزاز و تکریم کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ مسدس کے بارے میں سر سید کی تمام اُمیدیں بر آئیں۔ قوم کے خطیب اور امام اپنے خطبوں میں اور مقرر اپنی

تقریروں میں اس کے بند پڑھتے رہے۔ گلی کوچوں، مجلسوں اور درگاہوں میں مسدس کے اشعار گائے اور سنائے گئے۔ ملک بھر میں مسدس کے جتنے ایڈیشن مختلف اوقات میں چھپتے رہے اُن کا کوئی شمار نہیں۔ زبان کے محافظوں اور مذہب کے علم برداروں نے اس کے خلاف مخالفت کے طوفان اٹھائے۔ اودھ پنچ کے حملہ آور میدان پانی پت کی طرح حالی کو پامال کرتے رہے۔ خالی، خیالی، ڈفالی، سوالی، عالی اور عوالی وغیرہ مسخروں نے مسدس حالی کے جواب میں درجنوں مسدس لکھے لیکن بہ قول اسد ملتانی مرحوم:

اسد یہ کرشمہ تھا صدق و صفا کا
کہ اک فرد نے قوم پر فتح پا لی

مسدس کی طرح شکوۂ ہند بھی حالی کی تاریخی بصیرت، ملی شعور اور فنی و تخلیقی صلاحیتوں کا عظیم کارنامہ ہے۔ شاعر کا دور رس تخیل، اجتماعی شعور کا دیدۂ بیدار بن کر ماضی کی ایک روشن تصویر دیکھتا ہے جس میں قومی کردار کے اصلی خد و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ ملت کا کارواں جب صدیوں کا سفر طے کرکے سرزمین ہند میں پہنچا تو انسانیت کے جوہر سے مالا مال تھا لیکن اس ''غارت گرِ اقوام'' نے عارضی جاہ و ثروت کے بدلے میں اس کے جوشِ کردار اور دین و دانش کی متاع بے بہا لوٹ لی۔ شاعر کا مقصد اس کھوئی ہوئی متاع کو یاد دلا کر کارواں کے دل میں ''احساس زیاں'' پیدا کرنا ہے۔ لیکن نظم کی ابتدا اور خاتمے کے یہ پیغمبرانہ الفاظ: ''رخصت اے ہندوستاں، اے بوستان بے خزاں'' اور ''برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت''، اس حقیقت کی طرف اشارہ

کرتے ہیں کہ یہ کارواں اپنی خودی کی حفاظت کے لیے خاک ہند سے دامن جھاڑ کر الگ ہو جائے گا۔

فصل نہم اُن قومی نظموں پر مشتمل ہے جو تعلیمی و اصلاحی تحریک کے سلسلے میں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقعوں پر یا دیگر قومی جلسوں میں پڑھی گئیں۔ ان نظموں کے موضوع قوم کے تعلیمی و اقتصادی مسائل ہیں۔ شاعر نے مختلف پیرایوں میں تعلیمِ جدید کی اہمیت واضح کی ہے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق تعمیر و ترقی کی راہیں دکھائی ہیں۔ جب کوئی شاعر شعوری طور پر ناصح مشفق بننے کی کوشش کرتا ہے تو شعریت دم توڑ دیتی ہے اور شاعر کا کلام ایک منظوم خطبہ بن کر رہ جاتا ہے۔ حالی کے مقلدوں کی شاعری کا بالعموم یہی حال ہے۔ ان نظموں کے بعض حصے بھی بالکل سپاٹ ہیں لیکن کہیں کہیں حالی نے اپنے خونِ جگر کے چھینٹوں سے فن کی آبرو رکھ لی ہے۔ جن مجالس میں یہ نظمیں پڑھی گئیں، اُن کی رودادیں شاہد ہیں کہ حالی کے یہ منظوم خطبات بھی ''ان من الشعر لحکمة و ان من البیان لسحراً'' کے مصداق، قوم کے دل و دماغ پر جادو کی طرح چھا جاتے تھے۔ مثلاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے سالانہ اجلاس (منعقدہ دسمبر ۱۸۹۱ع) میں جو نظم ''متوسط طبقہ'' کے عنوان سے پڑھی گئی، اس کے تاثرات سر سید نے اپنی رپورٹ میں یوں بیان کیے ہیں:

''اے دوستو! آج یہ نظم جو مولانا حالی نے پڑھی، ایک عجیب نظم ہے کہ شاید ایسی نظم فارسی، اردو اور عربی میں کسی شاعر نے نہیں لکھی . . . جو

طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اُس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا، اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے، مولانا حالی ہی کا کام ہے۔ ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آیندہ زمانے میں جو کہا جاوے گا کہ فخر قوم، فخر شعرا، فخر علماء اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے؟ تو کہا جاوے گا کہ حالی!''

اگر ہم عصری رجحانات و تحریکات کے پس منظر میں ان نظموں کا مطالعہ کریں اور آردو کے قدیم شعری سرمایے کو سامنے رکھ کر جائزہ لیں تو سر سید کے اس بیان کی صداقت ہم پر واضح ہو جائے گی۔ فنی نقطۂ نظر سے حالی کا یہ احسان کچھ کم نہیں کہ انھوں نے اپنی قومی نظموں میں حکیمانہ خیالات کو جذبے کی آنچ سے پگھلا کر زبان و بیان کے موزوں سانچوں میں ڈھالا؛ تشبیہ و تمثیل، نکتہ سنجی اور سخن آفرینی سے اشعار میں جاذبیت پیدا کی؛ مسدس کے علاوہ ترکیب بند کی ہیئت اختیار کرکے اس میں شعری اسلوب کے نئے نئے تجربے کیے اور اس طرح اقبال کی تغزل آفرینی کے لیے ایک بنیاد فراہم کر دی۔

دیوان کے ساتھ مقدمے کی اشاعت (١٨٩٣ع) کے بعد ادبی و لسانی تعصبات نے مخالفت کی آگ اور بھڑکا دی۔ چنانچہ

اودھ پنچ میں ''نیچری کانفرنس'' والی نظموں کی دھجیاں آڑائی گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبان کے معاملے میں حالی کی وسیع المشربی شعر کی روانی اور فصاحت میں خلل انداز ہوتی ہے۔ ہندی کے سبک و شیریں لفظوں کے علاوہ بعض اوقات وہ عوامی زبان کے بے ڈھب الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں اور انگریزی الفاظ بھی بے تکلف لے آتے ہیں۔ توسیع زبان کے خیال سے متروکات اور دیگر عروضی و لسانی پابندیوں کی پروا نہیں کرتے۔ کہیں کہیں بندش کی سستی و ناہمواری اور لفظی و معنوی تعقید بھی آن کے اشعار کا فنی مرتبہ گرا دیتی ہے۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو حالی کے اصلاحی و انقلابی کارناموں کے سامنے یہ کوتاہیاں نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں۔

گو کہ حالی اگلے آستادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ !

فصل دہم میں ''زمزمۂ قیصری'' کے علاوہ جو مختصر منظوم ترجمے درج ہیں انھیں متفرقات میں شامل کیا جا سکتا تھا لیکن زمزمۂ قیصری کی طوالت ایک علیحدہ فصل کی متقاضی ہوئی۔ ایک انگریز شاعر، مسٹر اسٹوک نے ملکہ وکٹوریا کے جشن دربار قیصری کے موقع پر ایک طویل نظم لکھی تھی جس کے تین حصے تھے۔ زمزمۂ قیصری اس نظم کے حصۂ اول کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ نظم اس قابل نہیں تھی کہ حالی از خود اس کے ترجمے کی زحمت آٹھاتے لیکن کمشنر دہلی کے حکم سے مجبور ہو کر انھیں یہ بیگار بھگتنی پڑی۔ ابھی صرف پہلے

حصے کا ترجمہ مکمل ہوا تھا کہ مصنف نے اردو کے بجائے فارسی میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی ۔ حالی نے علالت کی وجہ سے اپنی معذوری ظاہر کی اور یہ ترجمہ ادھورا رہ گیا ۔ انگریز مصنف نے نظم کے ابتدائی حصے میں جہاں ہندوستان کی تاریخ کے قدیم ادوار کا ذکر کیا ہے ، مسلمانوں کے عہد حکومت ، خصوصاً سلطان محمود غزنوی کے خلاف بہت زہر چکانی کی ہے ۔ حالی نے اپنے حواشی میں ان ناروا حملوں کا مدلل اور مسکت جواب دیا ہے ۔ یہ تشریحی و تنقیدی شذرات ، حالی کی حیرت انگیز جرأت گفتار اور وسعت معلومات پر دلالت کرتے ہیں ، لہٰذا انھیں بے کم و کاست نقل کیا گیا ہے ۔ ایک جگہ حاشیے میں حالی نے محمود غزنوی کے بارے میں ایک اور انگریز شاعر کی ہجویہ نظم کا ترجمہ درج کیا ہے ۔ یہ منظوم ترجمہ ۸ اشعار پر مشتمل ہے ۔

ترکیب بند کی ہیئت میں سات سات اشعار کے ۳۵ بند[1] کی یہ طویل نظم حالی کی قادرالکلامی اور فنی مہارت کا کرشمہ ہے ۔ یہ آزاد ترجمہ نہیں ۔ ہیئت کی پابندیوں کے علاوہ حالی نے انگریزی متن کی اس حد تک پیروی کی ہے کہ اگر اصل مطالب پر کسی لفظ یا مصرعے یا شعر کے اضافے کی ضرورت پیش آئی تو اُسے قوسین میں ظاہر کر دیا ہے ۔ مثلاً :

---

۱ - مجموعۂ نظم حالی کے تمام نسخوں میں اس نظم کے کل ۳۵ بند درج ہیں ۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب نے سہواً نظم کے بندوں کی تعداد ۳۶ بیان کی ہے (حالی کا ذہنی ارتقا ، صفحہ ۶۰) ۔

۱ - خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ ہے اندر کی فکر
(دست گل چیں نا رسا و نخل دولت زرفشاں)

۲ - ع : مرحبا اے خطۂ ہندوستاں (صد مرحبا !)

اس التزام و احتیاط کے باوجود بندش الفاظ کی صفائی اور ڈھلے ڈھلائے مصرعوں کی روانی و برجستگی سے ترجمے پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے ۔ حالی نے فنکارانہ خلوص و دیانت کے تقاضے پورے کرکے منظوم ترجمے کا ایسا بلند معیار قائم کر دیا کہ گزشتہ ایک صدی کے دوران میں کسی طویل ادب پارے کے ترجمے کی اس سے بہتر مثال نہیں ملتی ۔

آخری فصل جس میں حالی کا متفرق کلام جمع کیا گیا ہے ، تین حصوں پر مشتمل ہے :

ا ۔ متفرق اشعار و قطعات جو دیوان حالی اور جواہرات حالی کے آخری حصے میں درج ہیں ۔ لیکن دیوان کے متفرقات میں سے چند نظمیں موضوع کی مناسبت سے فصل دوم میں شامل کی گئی ہیں اور فارسی و عربی کے اشعار و قطعات ضمیمے میں اپنی اپنی جگہ درج کیے گئے ہیں ۔

ب ۔ قطعات تاریخ اور قرآنی مادہ ہائے تاریخی ۔ اس حصے میں قطعۂ تاریخ وفات مولانا محمد حسین آزاد کے سوا (جو جواہرات حالی سے ماخوذ ہے) باقی تمام قطعات اور تاریخی مادے دیوان حالی سے منقول ہیں ۔ البتہ دیوان کے فارسی قطعات کو ضمیمے میں جگہ دی گئی ہے ۔

ج ۔ تبرکات حالی یعنی حالی کا غیر مدون و غیر مطبوعہ کلام جس کی تفصیل آگے آئے گی ۔

ابتدا میں ذکر آ چکا ہے کہ مولانا حالی نے کلیات کی

ترتیب کے سلسلے میں سب سے پہلے فارسی و عربی نظم و نثر کا مجموعہ ''ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی'' کے نام سے شائع کیا۔ مصنف کی اس خواہش کا احترام مرتب پر لازم تھا لٰہذا کلیات میں فارسی و عربی کلام بطور ضمیمہ شامل کیا گیا۔ لیکن انشاے فارسی و عربی کی گنجائش نہیں نکل سکی۔ فارسی و عربی زبانوں میں تصنیف و تالیف کا رواج حالی کے زمانے ہی میں اٹھ گیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں :

> ''دونوں زبانوں کی نظم و نثر کے مسودے جو کبھی کبھی کے لکھے ہوئے پڑے تھے، اُن کی نسبت متردد تھا کہ اُن کو کیا کیا جائے... لیکن مذکورۂ بالا مسودات کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑی کاوش سے لکھے گئے تھے اور زیادہ تر اس خیال سے کہ قومی خصوصیات کی یادگار تھے، اُن کو رائیگاں کھونا گوارا نہ ہوا۔'' (دیباچہ ضمیمہ مشمولہ کلیات ھٰذا)

غنیمت ہے کہ خود حالی کی کوشش سے یہ سرمایہ محفوظ ہو گیا ورنہ آج ان جواہر ریزوں کا فراہم کرنا محال ہو جاتا۔

اردو شاعری کی طرح حالی کی فارسی غزل گوئی کا مستقل دور بھی ۱۸۶۳ع سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے فارسی نظم و نثر لکھنے کا خیال ''میلان طبع کی حد سے آگے نہیں بڑھا'' (دیباچہ ضمیمہ)۔ شیفتہ کی مصاحبت کے زمانے میں اردو و فارسی کے علاوہ عربی میں بھی گاہے گاہے طبع آزمائی کا موقع ملتا رہا۔ عربی کی نظموں میں ۴۸ اشعار کا قصیدۂ بائیہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ یہ قصیدہ حضرت شاہ عبدالغنی قدس سرہ کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجا گیا تھا

اور خود حضرت ممدوح کا بیان ہے کہ مدینے کے بعض آدبا نے اس قصیدے کی براعت و فصاحت کو سراہا ہے۔ (''و استحسنہا بعض آدباء المدینۃ المنورۃ لما فیہ من البراعت والفصاحۃ'')۔ اس کے علاوہ صرف چند مختصر تقریباتی قطعات ہیں جو بہ طور تفنن طبع لکھے گئے۔ البتہ فارسی میں مختلف اصناف سخن سے متعلق بلند پایہ تخلیقات موجود ہیں۔ بہرۂ فارسی ، غزلیات (۱۹) ، رباعیات (۲۰) قصائد (۴) ، مراثی (۷) ، قطعات (۶) ، اور قطعات تاریخ (۱۵) پر مشتمل ہے۔ تمام غزلیں قیام جہانگیر آباد کے زمانے کی یادگار ہیں۔ ان غزلوں میں زبان کی عذوبت و حلاوت اور تغزل کا آب و رنگ بیش تر ''پوچ گویان ہند'' خصوصاً معاصرین کی غزلوں سے زیادہ ہے۔ اُردو غزلوں کی طرح یہاں بھی رسمی مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی کے بجائے سادگی و خلوص نمایاں ہے۔ بعض غزلوں میں غالب کے حسن بیان ، نازک خیالی اور نکتہ سنجی کا پرتو جھلکتا ہے۔ مثلاً غالب کی ایک مشہور غزل (''شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن'') کی زمین میں حالی کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

عشق اگر کیش است ملت ہا کہن خواہد شدن
منبرے ہر گوشہ از دار و رسن خواہد شدن
می دمد گل ہر کجا پاے نگاریں می نہی
جادہ چوں از سیر باز آئی چمن خواہد شدن
صید تا افگند محو دست و بازوے خود است
ایں جواں روزے شکار خویشتن خواہد شدن

ابتدائی دور کی ان غزلوں سے ظاہر ہے کہ مستقبل میں فن کی آن بلندیوں تک حالی کی رسائی ممکن تھی جو

نظیری اور غالب جیسے نغز سراؤں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن انقلاب زمانہ نے اُس بزم سخن کی بساط ہی اُلٹ دی اور حالی ''وقت کی راگنی'' اور قوم کے ماتم کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔

اُستاد اور شاگرد کی ''بیت بحثی'' کا قصہ یادگار غالب میں مذکور ہے۔ نوجوان شاگرد جس آن بان سے اس موقع کی نزاکتوں سے عہدہ برآ ہوا، اُس کا اندازہ ان قطعات سے ہوگا جن کے ابتدائی شعر درج ذیل ہیں:

۱۔ تو اے کہ رونق پیشینیاں بہم بشکست
زنظم و نثر تو کاندر زمان ما گفتی
۲۔ تو اے کہ عذر فرستادۂ بہ سوے رہی
سزد کہ جان گرامی بران نثار کنم

یہ قطعات حالی کی قادرالکلامی اور اُن کے ذہن و ذوق کی بلندی و پاکیزگی کے شاہد عادل ہیں۔ قصیدوں میں اُن کا پہلا قصیدہ در مدح نواب کلب علی خاں، رئیس مصطفٰی آباد (رام پور) خاصے کی چیز ہے اور قصیدے کے فنی محاسن کے ساتھ ایک اجتہادی شان کا حامل ہے۔ اس سے تین سال قبل، انھی کی مدح میں حالی نے اُردو میں نئے طرز کا قصیدہ لکھا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں دربار قیصری کے موقع پر جب تمام والیان ریاست کا دہلی میں اجتماع ہوا تو حالی نے خاص اہتمام سے یہ فارسی قصیدہ مرتب کیا جس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

''چونکہ حضور نواب صاحب ممدوح سے فی الجملہ تعارف تھا اور انھوں نے سرسید کی امداد میں سب سے

پہلے سبقت کی تھی اور دربار میں ان کے شریک ہونے کی قوی اُمید تھی ، اس لیے انھی کو اس قصیدے کا ممدوح قرار دیا گیا[1] ۔''

قصیدے کی تمہید میں ایک بیدار دل فرماں روا کی صفات بیان کی ہیں اور مدح میں نواب صاحب کے حقیقی اوصاف یعنی اُن کے فضل و کمال ، ہنر مندی اور ہنر پروری کی تعریف نئے نئے پیرایوں میں ، مبالغہ آفریں جوش عقیدت سے کی ہے ۔ جزالت بیان اور شوکت الفاظ میں یہ قصیدہ فارسی کے بہترین کلاسیکی قصائد سے لگا کھاتا ہے ۔ حسن معانی اور جدت خیال کے ساتھ کہیں کہیں بندش الفاظ میں قاآنی کی طرح مرصع کاری کا کمال دکھایا ہے ۔ مثلاً :

مظالم را براندازد ، جہاں از فتنہ پردازد
عدالت را برافرازد ، ستم را افگند از پا
ضعیفاں را تواں بخشد ، بہ مظلوماں اماں بخشد
بہ محتاجاں چناں بخشد کہ حاجت را نماند جا

اس قصیدے کے علاوہ دیگر قصیدے بہت ہلکے پھلکے ہیں ۔ اُن میں اسلوب فکر کی جدت تو ہے لیکن اسلوب بیان میں قصیدے کی فنی خوبیاں موجود نہیں ۔

حالی کے ۷ مرثیوں میں سے ۵ قطعات کی صورت میں ہیں ۔ سر سالار جنگ کا مرثیہ ترجیع بند میں اور سر سید کا ترکیب بند میں ہے ۔ مؤخرالذکر فارسی میں حالی کی بہترین تخلیق ہے ۔ مرثیۂ غالب کی طرح یہ بھی اپنے موضوع کی عظمت کا آئینہ دار اور شاعر کے خلوص فن کا بے نظیر شاہکار ہے ۔ یہ مرثیہ محتشم کاشی کے مشہور مرثیے کی زمین میں ، دس

۱ ۔ حاشیۂ قصیدہ (مشمولہ ضمیمہ (۲) کلیات ہذا ۔ جلد دوم)

دس اشعار کے سات بندوں پر مشتمل ہے۔ محتشم کاشی کی تقلید میں کئی مرثیے لکھے گئے لیکن سوز و ساز، جذبہ و تخیل اور فکر و فن کا یہ امتزاج اور کہیں مشکل سے نظر آئے گا۔ یوں تو اس نظم کا ہر شعر درد و سوز میں ڈوبا ہوا ہے لیکن ہر بند میں زور و اثر بتدریج بڑھتا چلا گیا ہے حتی کہ پانچویں بند میں تشبیہات و استعارات کی لطافت، تراکیب کی بلاغت، بیان کی روانی اور پرکاری انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ سر سید کی عظیم شخصیت کے محاسن اور ان کی قومی خدمات کی یاد دلاتے ہوئے آخر میں شاعر نے اپنی دل شکستہ قوم کو عزم و عمل کا پیغام دیا ہے۔ یہ شعر پورے بند کا خلاصہ ہے:

مزد او ایں بس کہ در اصلاح خود کوشید زود
کز شما غیر از شما مطلوب آو چیزے نہ بود

تیسرے بند میں حالی نے انسانیت کا جو اعلیٰ تصور پیش کیا ہے وہ خود آن کے پاکیزہ کردار اور درد آشنا دل کی تصویر ہے۔ ممکن ہے کوئی نفسیات زدہ نقاد اس کردار کے خلوص اور اس دل کے سوز و گداز کو ذہنی و جسمانی کمزوریوں پر محمول کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حیوان کی ادنیٰ سطح سے انسانی ذہن و روح کا ارتقا انھی نفوس قدسی کے جذبۂ ہمدردی کا مرہون منت ہے جو بقول حالی، باغ عدن میں سموم نجد کی تپش اور شبستان راحت میں زندان کی گھٹن محسوس کرکے بے چین ہو جاتے ہیں۔ اس بند کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
در فصاحت ہم چو سحباں، در خرد لقماں شدن

می تواں قطب زماں شد ، می تواں شد غوث وقت
ہرچہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی ؟ تپیدن از تپ ہمسائگاں
از سموم نجد در باغ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریِ ابنائے جنس
در شبستان تنگ دل از محنت زنداں شدن
زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم
گر توانی ، می توانی سید احمد خاں شدن
می تواں مقبول عالم گشت اما ہمچو شیخ
بہر سود خلق مردود جہاں نتواں شدن

★

کلام حالی کے مختلف پہلوؤں کا یہ سرسری جائزہ مفصل تبصرے کا متحمل نہ ہو سکا ۔ گزشتہ دس پندرہ **برس** کی مدت میں حالی پر جو تحقیقی کام ہوا ہے ، اس کے بعد بھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش باقی ہے لیکن مطالعۂ حالی کے سلسلے میں شاعر کے تخلیقی تجربے کے پس منظر سے آگہی زیادہ ضروری ہے اور اس نقطۂ نظر سے خود حالی کے مختصر دیباچے کسی مفصل تبصرے سے کہیں زیادہ بصیرت افروز ثابت ہوں گے ۔ چنانچہ کلیات میں مسدس ، ضمیمۂ مسدس ، دیوان حالی اور مجموعۂ نظم حالی کے دیباچوں کی شمولیت ضروری سمجھی گئی ۔ مرتب کے پیش نظر اولین مقصد یہ تھا کہ حالی کا تمام منتشر کلام ایک جامع شیرازے میں منسلک کر دیا جائے ۔ الحمدللہ کہ کلیات کی دونوں جلدیں حالی کے تمام مدون ، غیر مدون ، مطبوعہ ، غیر مطبوعہ ، اردو ، فارسی اور عربی کلام پر حاوی ہیں ۔ مآخذ کے سلسلے میں کلام حالی کے مختلف مجموعوں کا ذکر آ چکا ہے ۔

اس سرمایے کے علاوہ کم و بیش پچاس اشعار پر مشتمل غیر مدون کلام (جو اب تک کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوا) اور غیر مطبوعہ کلام (جو مسودات کی صورت میں دستیاب ہوا ہے) حسب تفصیل ذیل کلیات میں جمع ہو گیا ہے :

غیر مدون کلام :

(۱) غزل کے ۴ شعر : (مشمولہ فصل اول—حواشی)
(۲) ایک نظم : (مشمولہ فصل ششم—بچوں کی نظمیں)
(۳) ترجمۂ اشعار حضرت علی کرم اللہ وجہہ :
(مشمولہ فصل دہم—تراجم)
(۴) تین قطعات تاریخ : (مشمولہ ضمیمہ ۲— کلام فارسی)

غیر مطبوعہ کلام :

(۱) ۲ متفرق اشعار : (مشمولہ فصل یازدہم—متفرقات)
(۲) ۴ قطعات : (,, ,, ,,)

نوادرِ حالی کی تلاش ہنوز جاری ہے۔ ایک پرانی غزل کے چار شعر ابھی دست یاب ہوئے ہیں جو فصل یازدہم میں درج کیے جاتے ہیں ۔

چونکہ کلیات کی ہر فصل میں حتی الامکان زمانی ترتیب کا التزام رکھا گیا ہے لٰہذا ہر نظم کے سنہ تصنیف کی تعیین اور حسب ضرورت تعارفی حواشی کی ترتیب بھی ناگزیر ہو گئی ۔ اس سلسلے میں مختلف ماخذ سے مدد لی گئی جن میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی محققانہ تصنیف ”حالی کا ذہنی ارتقا“ سب سے زیادہ جامع اور مستند ذخیرۂ معلومات ثابت ہوئی ۔ تاہم متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کے سنین تصنیف

خود مرتب نے مختلف داخلی و خارجی شواہد کی بنیاد پر متعین کیے۔ مولانا حالی کے تشریحی حواشی انھی کے الفاظ میں بجنسہ منقول ہیں۔ ان کے سوا، اعلام و آیات و تلمیحات وغیرہ سے متعلق جملہ حواشی کی ذمہ داری مرتب پر عائد ہوتی ہے۔ حواشی کی ترتیب میں اختصار ملحوظ رکھا گیا ہے اور حسب موقع کتب حوالہ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

تدوین کلام کے ساتھ صحت متن کا اہتمام بھی مرتب کے فرائض میں شامل ہے۔ اس غرض سے ترتیب اور طباعت کے مختلف مرحلوں میں، صحیح ترین نسخوں کو سامنے رکھ کر مسلسل چھان بین ہوتی رہی۔ جہاں مقابلے کی گنجائش نہیں تھی وہاں قیاس سے کام لے کر کاتبوں اور مرتبوں کے اغلاط و تسامحات کی اصلاح کی گئی۔ مصححین مطبع کے علاوہ خود مرتب نے ہر پروف کو حرف بحرف دو دو تین تین بار دیکھنا فرض عین سمجھا۔ اس کد و کاوش سے طباعت میں تاخیر تو ہوئی لیکن اگر مشینی لغزشوں کو نظر انداز کر دیا جائے (جو سربریدہ الفاظ کی صورت میں جابجا ہماری کوششوں کا منہ چڑا رہی ہیں) تو اغلاط کا تناسب بہت کم رہ جاتا ہے اور موجودہ حالات میں جب کہ اردو مطبوعات کا اغلاط سے مبرا ہونا محالات میں سے ہے، ہم اس نمایاں کمی کو فوز عظیم سمجھنے پر مجبور ہیں۔

اصول املا کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مجلس کی جدید مطبوعات میں ہمزۂ اضافت کا استعمال متروک قرار پایا ہے۔ مثلاً روشنئ طبع کو اب ''روشنیِ طبع'' اور مصرعۂ اولیٰ کو مصرعِ اولیٰ لکھا جاتا ہے۔ پرانے کاتب کئی الفاظ ملا کر لکھتے تھے؛ اس غلطی کی اصلاح ہوئی تو اب اتصال کی جگہ انفصال کا رجحان ترقی پر ہے، حتیٰ کہ اگر

ہمدم و دمساز اور دلبر و دلدار کے بھی ٹکڑے ہو گئے ہوں تو کچھ عجب نہیں ۔

طباعت و تصحیح متن کے سلسلے میں محبی محمد شفیق صاحب (مالک شفیق پریس لاہور) اور عزیزی عبدالغفار احمد صاحب (مہتمم مطبوعات ، مجلس ترقی ادب) کی ذاتی توجہ اور پُر خلوص تعاون کا شکریہ مجھ پر واجب ہے ۔ کلام حالی کے بعض نادر نسخوں کی فراہمی میں جن حضرات نے میری مدد فرمائی اُن میں بالخصوص ، الحاج خواجہ افضال حسین صاحب ایڈوو کیٹ سرگودھا (نبیرۂ حالی) ، مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل ، مولانا بشیر حسین ضیائی اور محبی احسان دانش صاحب میرے دلی شکریے کے مستحق ہیں ۔ یہاں اُن بزرگوں کے شکریے کی کوشش ایک جسارت بے جا سے کم نہیں جن کی نوازشات کا یہ عالم ہے کہ میری تمام ادبی کاوشیں اُنھی کے فیضان نظر کی رہین منت ہیں ۔ لیکن کلیات کے سلسلے میں جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب (وائس چانسلر ، پنجاب یونیورسٹی) کی خاص توجہ اور دلچسپی کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا ۔ ۱۹۶۲ع میں جب میں اسلامیہ کالج میں تھا تو ایک موقع پر محترمی خان صاحب کے ارشادات گرامی ، کلیات کی تدوین کے محرک ہوئے اور چند سال کی ناگزیر مصروفیات کے بعد جب میں نے یہ کام شروع کیا تو موصوف ہی کی پیہم حوصلہ افزائی سے یہ ہفت خواں طے ہوا ۔

افتخار احمد صدیقی
آستاد شعبۂ اُردو
یونیورسٹی اورینٹل کالج
لاہور ۔

مئی ۱۹۶۸ع

کلیات نظم حالی

(جلد اول)

مرتبہ

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

"ترجمۂ حالی"[1]

(مولانا حالی کی خودنوشت سوانح عمری)

"میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ع میں بہ مقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی - اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے، آباد چلی آتی ہے - ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات[2] کی اولاد میں سے ایک

۱- منقول از مقالات حالی حصۂ اول (صفحہ ۲۶۱ تا ۲۷۹) - ۱۹۰۱ع میں لندن سے کسی انگریز مصنف نے نواب عماد الملک بہادر، مولوی سید حسین بلگرامی سے مولانا حالی کے حالات زندگی دریافت کیے - نواب عماد الملک نے خود مولانا کو لکھا - مولانا حالی نے نواب صاحب کی فرمائش پر یہ مختصر سوانح عمری لکھ کر حیدر آباد بھیجی تھی - ۱۹۰۱ع کے بعد کے حالات آخر میں مختصر طور پر درج کیے گئے ہیں - (مرتب)

۲- فن حدیث کے بہت بڑے امام اور صوفیِ کامل تھے - بہت سی کتابوں کے مصنف، ادیب اور اعلیٰ درجے کے خطیب تھے - ۸۵ سال کی عمر میں ۹ ربیع الاول ۴۸۱ھ کو ہرات میں وفات پائی - علمائے فرنگی محل لکھنؤ آپ ہی کی اولاد سے ہیں - (بحوالہ تذکرۂ حالی، صفحہ ۲۶)

بزرگ خواجہ ملک علی[1] نام ، جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے[2] جن کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے محمود شاد انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراقِ عجم کا فرماں روا تھا ، پہنچتا ہے - چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد ، علماء و شعراء و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا ، اس لیے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے - اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا - چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ آراضی سوادِ قصبۂ پانی پت میں بطور مددِ معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے آن کو عنایت کی

۱- خواجہ ملک علی تک مولانا حالی کا شجرۂ نسب درج ذیل ہے :
خواجہ الطاف حسین حالی بن خواجہ ایزد بخش، بن خواجہ بوعلی بخش بن خواجہ محمد بخش ، بن خواجہ غلام محمد ، بن خواجہ عبدالسبحان ، بن خواجہ عبدالکریم، بن خواجہ مسلم، بن خواجہ زین الدین احمد، بن خواجہ عبدالکافی ، بن خواجہ ضیاء الدین ، بن خواجہ ابو راشد ، بن خواجہ ابوحامد ، بن خواجہ ابو تراب ، بن خواجہ نصیر، بن محمود، بن قاضی خواجہ ملک علی - (بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۱۸)

۲ - خواجہ ملک علی انصاری ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ع میں اپنے دو بیٹوں خواجہ محمد مسعود اور خواجہ محمد نصیرالدین کے ساتھ پانی پت میں وارد ہوئے جو اس وقت علما اور فضلا کا مرکز تھا - خواجہ ملک علی پانی پت کے علمی ماحول سے متاثر ہو کر یہیں سکونت پذیر ہوئے -
(بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۲۹)

اور منصبِ قضاء و صدارت و تشخیصِ نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سوادِ پانی پت میں واقع ہیں ، اور خطابت عیدین اُن سے متعلق کر دی - پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے - میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی، جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں ، بیٹی تھیں[1] -

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا - میرے والد نے سنِ کہولت میں انتقال کیا[2]، جب کہ میں نو برس کا تھا - اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا

۱- والدہ کی طرف سے شجرۂ نسب یہ ہے :

الطاف حسین حالی بن امۃالرسول (زوجہ خواجہ ایزد بخش) بنت سید محمد شفیع ، بن سید محمد امین ، بن سید عبدالرحمان ، بن سید عبدالرحیم ، بن سید ابوالقاسم ، بن سید علی ، بن سید منجھو، بن سید محمد ، بن سید امجد، بن سید نعمت اللہ ، بن سید اخوند ، بن سید حسام الدین ، بن سید شمس الدین، بن سید معظم ، بن سید مرتضیٰ ، بن سید نور الدین ، بن سید مغیث ، بن سید محمد ، بن سید موسیٰ ، بن سید ابی تمیم ، بن سید یحییٰ ، بن سید ابراهیم ، بن سید موسیٰ مکحول ، بن سید ابو جعفر ، بن حضرت سید اسماعیل شہید ، بن حضرت سید احمد ، بن حضرت امام ابوالقاسم اسماعیل شہید شہدا پوری ، بن حضرت سید محمد ناطق ، بن حضرت اسماعیل ناطق، بن حضرت امام جعفر صادق ، بن حضرت امام ابو جعفر محمد باقر ، بن حضرت امام علی زین العابدین ، بن حضرت سیدنا امام حسین ، بن حضرت سیدہ فاطمہ" الزہرا رضی اللہ عنہا بنت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم - (بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۱۹ ، ۲۰)

۲- مولانا حالی کے والد ، خواجہ ایزد بخش ، سرکار انگریزی کے سررشتہ پرمٹ میں ایک معمولی ملازم تھے - ۱۸۴۵ء میں بہ عمر چالیس سال آپ کا انتقال ہو گیا - (بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۳۳ ، ۳۴)

سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا[1] - انہوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا[2]- اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا ، مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا - ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے ، اور بوجہ تعلق زنا شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ و طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے ، اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور اُن کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی - پھر عربی کا شوق ہوا - انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے ؛ اُن سے صرف و نحو پڑھی - مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بہ منزلۂ والدین

۱- مولانا حالی کے ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں - مولانا ان تینوں سے چھوٹے تھے - بھائی کا نام خواجہ امداد حسین تھا - وہ یو ، پی میں انسپکٹر پولیس تھے - فارسی کے اچھے شاعر اور نہایت با مذاق اور زندہ دل شخص تھے، مظہر تخلص کرتے تھے- بڑی بہن امت الحسین زوجہ حکیم خواجہ محمد علی اور دوسری بہن وجیہ النساء زوجہ سید محمد حسین تھیں - وجیہ النساء کی لڑکی اُم الحسن صاحبہ خواجہ غلام الحسنین صاحب (سابق انسپکٹر تعلیمات صوبہ گلبرگہ و مترجم فلسفۂ تعلیم ہربرٹ سپنسر) اور آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب (ایڈیٹر عصر جدید) کی والدہ اور خواجہ غلام السیدین صاحب (سابق پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی دادی تھیں - (بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۳۲ ، ۳۳)

۲- انصاریوں کے محلے کے مشہور قاری و حافظ ، مولوی ممتاز علی انصاری آپ کو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے - مولانا کا حافظہ بہت اچھا تھا - ''بچپن میں قرآن مجید ایسی خوش آوازی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جو شخص بھی سنتا ، تعریف کرتا -''
(بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۳۴ ، ۳۵)

سمجھتا تھا، تأہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی' اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بہ ظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں، مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۲۔ اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائیٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی، وہاں تعلیم کو

۱۔ ۱۸۵۲ع میں حالی کی شادی سادات کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ اہلیہ کا نام اسلام النساء تھا۔ وہ سید باقر علی کی صاحبزادی تھیں۔ دنیوی لحاظ سے مولانا کے سسرال والے اچھے کھاتے پیتے اور آسودہ حال لوگ تھے۔ (بحوالہ تذکرۂ حالی، صفحہ ۳۸، ۸۴)

۲۔ مولوی نوازش علی' موضع ہابڑی (تحصیل کیتھل، ضلع کرنال) کے رہنے والے' بڑے زبردست واعظ' متبحر عالم فاضل اور مشہور مدرس تھے۔ سر سید نے بھی ان سے پڑھا ہے۔ اس زمانے میں جامع مسجد دہلی کے قریب حسین بخش کا مدرسہ نیا نیا قائم ہوا تھا، مولوی نوازش علی اسی مدرسے میں درس دیا کرتے تھے۔ مولانا حالی بھی حسین بخش کے مدرسے میں داخل ہوگئے۔ مدرسے میں قیام کا زمانہ بڑی بے سر و سامانی اور فقر و فاقہ کے عالم میں گزرا۔ مولانا کے فرزند اکبر خواجہ سجاد حسین صاحب کا بیان ہے کہ ''زمانۂ قیام دہلی میں والد مرحوم تکیے کی جگہ ایک یا دو اینٹیں سرہانے رکھ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے دن ان پر ایسے بھی گزرے ہوں گے کہ فاقہ رہا ہوگا اور کھانے کو کچھ نہ مل سکا ہوگا۔ اس محنت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶ پر)

صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵)

اور تکلیف کا نتیجہ تھا کہ والد مرحوم کی صحت جوانی ہی میں خراب ہوگئی اور ہمیشہ بیمار رہنے لگے ۔'' (بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۴۰)

جس زمانے میں مولانا حالی ' حسین بخش کے مدرسے میں پڑھتے تھے ' اسی دوران میں انھوں نے عربی میں ایک رسالہ لکھا جس میں ایک جگہ کسی مسئلے میں ، نواب صدیق حسن خاں (جو علیا حضرت نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے شوہر ' کثیر التعداد کتابوں کے مصنف اور جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم تھے) کی تائید کی گئی تھی ۔ جب یہ کتاب بغرض اصلاح اپنے استاد کے سامنے پیش کی جو حنفی المذہب تھے ' تو انھوں نے مذہبی اختلاف کے جوش میں کتاب کو پھاڑ ڈالا ۔ اس طرح مولانا حالی کی یہ اولین تصنیف ضائع ہوگئی ۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب اپنے ایک مضمون میں حالی کے استاد کا یہ قول نقل کرتے ہیں : ''رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چونکہ اس سے ایک وہابی مولوی کی تائید ہوتی تھی اس لیے چاک کر دیا گیا ۔''

(تذکرۂ حالی ، صفحہ ۱۴۲)

مولوی نوازش علی کے علاوہ دہلی میں مولانا حالی نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے بھی استفادہ کیا :

(۱) مولوی فیض الحسن سہارن پوری : اپنے عہد کے مشہور عالم اور صاحب تصنیف بزرگ ، جو بعد میں اورئینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوئے ' اس زمانے میں دہلی میں درس دیا کرتے تھے ۔ مولانا حالی نے بعض چیزیں ان سے بھی پڑھی ہیں ۔

(۲) مولوی امیر احمد : مولانا نے ان سے دیوان متنبی کے دو تین قصیدے پڑھے تھے ۔

(۳) شمس العلماء میاں سید نذیر حسین دہلوی : میاں صاحب علم حدیث کے بہت بڑے عالم ' حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہم کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے ۔ مولانا حالی نے ان سے بھی حدیث کا کچھ درس لیا ہے ۔

(بحوالہ تذکرۂ حالی ، صفحہ ۴۱ ، ۴۲)

انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء 'بھلے' کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا، وہاں کے مدرس اور طلبا، کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے (اس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے، جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح مسلم، ملا حسن، اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ع کا ہے۔ دلی سے آ کر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۸۵۶ع میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی لیکن ۵۷ع میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عمل‌داری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور

قریب چار برس کے (پانی پت میں) بیکاری کی حالت میں گزرے ۔ اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبدالرحمان ، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ ، کبھی حدیث ، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا ، اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا ۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا ۔

جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر اُن کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ، ان کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے ۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے ۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے ۔'' مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا

اتفاق نہیں ہوا ۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ، رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ، ضلع بلند شہر ، سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے ، شناسائی ہوگئی[1] ۔ اور آٹھ سات برس تک بہ طور مصاحبت کے اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ۔ نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے ، اس کی بہ نسبت اُن کا مذاق شاعری بہ مراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا ۔ انھوں نے ابتداء میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے ۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا ، تازہ ہوگیا اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا ، چمک اٹھا ۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا ۔ انھی کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام

---

۱ ۔ یہ واقعہ ۱۸۶۳ع کا ہے ۔ (تذکرۂ حالی ، صفحہ ۵۵) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے نوجوان حالی کو جوہر قابل پایا اور انھیں اپنی مصاحبت اور اپنے بچوں کی اتالیقی کے لیے منتخب کر کے اپنے ساتھ جہاں گیر آباد لے گئے ۔

مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا ۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا ، بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا ۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا ، منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے ۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعے سے بہ خوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا ، انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرع پڑھا :

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا ، یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا ۔ اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا ۔

نواب شیفتہ کی وفات[1] کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھ کو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ، اُن کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی ۔ تقریباً چار برس تک میں نے یہ کام لاہور میں

---

١ ۔ نواب شیفتہ کی وفات ١٨٦٩ع میں ہوئی ۔

رہ کر گیا - اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی - لاہور ہی میں کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایماء سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا، یعنی ۱۸۷۴ع میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں - میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں، ایک 'برسات' پر دوسری 'امید' پر تیسری 'رحم و انصاف' پر اور چوتھی 'حب وطن' پر لکھیں[۱] -

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا[۲] - یہاں آ کر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اس طرز کی جس کی تحریک لاہور میں

۱- مولانا حالی کچھ عرصے تک سر رشتۂ تعلیمات پنجاب کے ماہوار جریدے 'اتالیق پنجاب' کے نائب مدیر بھی رہے -
(بحوالہ تذکرۂ حالی، صفحہ ۶۰)

۲- حالی، دلی کی علمی و ادبی صحبتوں کے دلدادہ تھے - ایک صدی قبل کے لاہور کی فضا سے مانوس نہ ہو سکے - احساس تنہائی کے علاوہ یہاں کی آب و ہوا بھی انھیں راس نہ آئی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے - چنانچہ مجبوراً انھوں نے اپنا تبادلہ کرا لیا اور ۱۸۷۴ع کے آخر یا ۱۸۷۵ع کی ابتدا میں دہلی آ گئے - (بحوالہ تذکرۂ حالی، صفحہ ۶۲)

ہوئی تھی، لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم[1] نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چنانچہ میں نے اول مسدس مد و جزرِ اسلام[2] اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب 'تریاق مسموم' ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا[3]، لکھی تھی جس کو اسی

۱۔ سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک سے حالی کے ذہنی روابط کا آغاز ۱۸۷۱ء میں ہو چکا تھا۔ اس کا ثبوت حالی کے اس مضمون سے ملتا ہے جو "سید احمد خاں اور ان کے کام" کے عنوان سے اسی سال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد ۱۸۷۵ء میں وہ علی گڑھ تحریک سے مستقل طور پر وابستہ ہو گئے اور گزٹ کے علاوہ 'تہذیب الاخلاق' میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ اسی سال حالی کی قومی شاعری کی بنیاد، ان کی نظم 'مبارکباد' سے پڑی جو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی رسم افتتاح (۲۴ مئی ۱۸۷۵ء) کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ (بحوالہ حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۴۵)

۲۔ سنہ طباعت ۱۸۷۹ء

۳۔ غدر کے بعد عیسائی مبلغین نے سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر بڑا فتنہ پھیلایا اور ہندوستان کی مذہبی فضا کو مسموم بنا دیا تھا۔ ایک پادری (مرتد) عماد الدین پانی پتی نے اپنی کتاب "ہدایت المسلمین" میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا۔ اسی کے جواب میں حالی نے "تریاق مسموم" لکھی۔ (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۱۷) "تذکرۂ حالی" میں پادری کی کتاب کا نام "تحقیق الایمان" اور "تریاق مسموم" کا سنہ تصنیف ۱۸۶۸ء درج ہے۔ مؤلف تذکرہ کا بیان ہے کہ مولانا حالی کا جواب اسی زمانے میں دہلی کے ایک ماہوار رسالہ "خیر المواعظ" میں بالاقساط چھپا، علیحدہ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔
(بحوالہ تذکرۂ حالی، صفحہ ۱۱۹)

زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا[1]۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی (علم طبقات الارض) میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اُردو میں ترجمہ کیا[2] اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جب کہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرایے میں موسوم بہ 'مجالس النساء' لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا[3] اور جو اودھ

۱۔ پادری عماد الدین کی ایک اور کتاب ''تاریخ محمدی'' پر حالی نے ایک تنقیدی مقالہ لکھا تھا جو ''تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے'' کے نام سے ۱۸۷۱ع یا ۱۸۷۲ع میں شائع ہوا۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ (تذکرۂ حالی، صفحہ ۱۲۰) حالی کی اولین نثری تصنیف ''مولود شریف'' ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۴ع اور ۱۸۷۰ع کے درمیان لکھی گئی لیکن مصنف کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی۔ خواجہ سجاد حسین صاحب نے اسے ۱۹۲۳ع میں شائع کرایا۔ (بحوالہ تذکرۂ حالی، صفحہ ۱۲۴)

۲۔ مولانا حالی ۱۸۷۲ع میں لاہور آئے لہٰذا یہ ترجمہ ۱۸۷۲ع اور ۱۸۷۴ع کے درمیان میں کیا گیا ہوگا۔ لیکن شیخ محمد اسماعیل صاحب لکھتے ہیں (تذکرۂ حالی، صفحہ ۱۲۰) کہ یہ ترجمہ مولانا نے غالباً ۱۸۶۸ع میں کیا تھا۔

۳۔ مجالس النساء ۱۸۷۴ع کی تصنیف ہے۔ ایجوکیشنل دربار ۱۸۷۵ع میں پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ (بحوالہ حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۴۱)

اور پنجاب کے مدارسِ نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو[1] - پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام ''حیات سعدی'' ہے[2] اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں - پھر شاعری پر ایک مبسوط ایسّے (Essay) لکھ کر بہ طور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا[3]- اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں اُن کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا

۱- اسی زمانے میں انھوں نے فارسی زبان کے قواعد پر ایک کتاب ''اصول فارسی'' لکھی تھی جو غالباً کبھی شائع نہیں ہوئی ۔ بعض تذکروں سے ''تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے'' اور ''شواہد الالہام'' بھی اسی عہد کی تصنیف معلوم ہوتی ہے - (حالی کا ذہنی ارتقا ، صفحہ ۳۲) شواہد الالہام حالی کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف ہے جس کے بارے میں مؤلف تذکرۂ حالی لکھتے ہیں : ''مختصر رسالہ ہے مگر نہایت جامعیت اور سلاست کے ساتھ لکھا گیا ہے - اس میں مولانا نے عقلی دلائل سے نبوت اور الہام کی ضرورت کو ثابت کیا ہے -'' (تذکرہ ، صفحہ ۱۳۰)

۲- ۱۸۷۵ع کے بعد حالی کے متعدد مضامین اور تبصرے ، مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے - ۱۸۸۲ع میں ''سفرنامہ حکیم ناصرخسرو'' فارسی میں محققانہ سوانح اور دیباچہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا - ''حیات سعدی'' جو اردو میں جدید سیرت نگاری کا پہلا کامیاب نمونہ ہے ، ۱۸۸۶ع کے اوائل میں شائع ہوئی - اس کے سنہ تصنیف کے بارے میں بہت اختلاف ہے-پروفیسر حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں ایک جگہ ۱۸۸۲ع اور ایک جگہ ۱۸۸۴ع لکھا ہے-(صفحات ۵۸۶ و ۲۱) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں : ''یہ کتاب غالباً مولانا نے ۱۸۸۴ع میں شائع کی تھی'' - (تذکرۂ حالی ، صفحہ ۱۱۲) لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے مولانا شبلی کے ایک خط کے حوالے سے اس کا سنہ تصنیف ۱۸۸۶ع متعین کیا ہے - (حالی کا ذہنی ارتقا ، صفحہ ۱۰۳)

۳- ۱۸۹۳ع -

ہے ، ''یادگار غالب'' کے نام سے لکھ کر شائع کی[1] اور اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ ''حیات جاوید'' جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے ، لکھی ہے جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی[2] ۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں ۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق ، علی گڑھ گزٹ ، اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں[3] ۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم ، میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی[4] ۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان سے کم ہونے لگا ہے ، اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی ۔ میری سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے ۔

۱- ۱۸۹۷ء   ۲- ۱۹۰۱ء

۳- مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی نے ''مضامین حالی'' کے نام سے ایک مجموعہ ۱۹۰۲ء میں شائع کیا ۔ یہ مجموعہ نامکمل تھا ۔ بعد میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام حالی کے تمام مضامین اور تقریظات ''مقالات حالی'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب ہو کر شائع ہوئے ۔ حالی کے خطوط کا مجموعہ ''مکتوبات حالی'' دو جلدوں میں حالی پریس پانی پت سے ۱۹۲۵ء میں چھپ کر شائع ہوا ۔

۴- حالی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں عربی و فارسی کلام نظم و نثر کا مجموعہ مرتب کیا تھا جو ان کے انتقال سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء میں ''ضمیمہ اردو کلیات نظم'' کے نام سے چھپ گیا تھا ۔

١٣٠٥ھ[1] میں جب کہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا[2] ۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدارالمہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظے کے لیے سرسید احمد خاں کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا ۔ نواب صاحب ممدوح نے بہ صیغۂ امداد مصنفین ایک وظیفہ ، تعدادی ۷۵ روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور ١٣٠٩ھ[3] میں جب کہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بہ شمول دیگر ممبران ڈپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ ، حیدر آباد گیا تھا ، اس وظیفے میں ۲۵ روپے ماہوار کا اضافہ کرکے سو روپے سکہ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بہ ماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا قطع تعلق کر لیا ہے ۔"

★ ★ ★

اگست ١٨٨٩ع میں حالی ، عربک اسکول کی ملازمت

١- مطابق ١٨٨٨ع -

٢- اس سے پہلے کے دو واقعات قابل ذکر ہیں - ١٣٠٣ھ (مطابق ١٨٨٦ع) میں حالی کے برادر بزرگ خواجہ امداد حسین ، بیمار ہو کر بغرض علاج دہلی آئے اور حالی کے پاس ٹھہرے - پانچ چھ ماہ کی شدید علالت کے بعد وہیں ان کا انتقال ہو گیا - حالی کو بھائی کی وفات کا بے حد صدمہ ہوا - (تذکرۂ حالی ، صفحہ ٦٣) جنوری ١٨٨٧ع میں وہ ایچیسن کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ کے اتالیق مقرر ہو کر گئے لیکن وہاں ان کا جی نہ لگا اور آٹھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ جون ١٨٨٧ع میں اپنی جگہ (اینگلو عربک اسکول دہلی میں) واپس آ گئے - (بحوالہ حالی کا ذہنی ارتقا ، صفحہ ١٠٥ ، ١٠٦)

٣- مطابق ١٨٩١ع

سے سبک دوش ہو کر پانی پت چلے گئے۔ خانہ نشین ہونے کے بعد اُن کی صحت خراب رہنے لگی۔ نزلہ، زکام اور کھانسی کی تکلیف اکثر رہتی تھی۔ چالیس سال کی عمر سے بواسیر کے مرض میں مبتلا تھے؛ اب اس مرض کا زور بڑھنے لگا۔ جسمانی عوارض کے علاوہ طرح طرح کی خانگی اور خاندانی پریشانیوں میں بھی گھرے رہتے تھے۔ ۲۲ اگست ۱۹۰۰ع کو اُن کی اہلیہ ہیضے میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئیں۔ اُن کی وفات سے حالی کی خانگی مشکلات اور بڑھ گئیں۔ لیکن ان الجھنوں اور پریشانیوں میں بھی وہ برابر شعر و ادب کی زلفیں سنوارتے رہے۔ اگرچہ حیات جاوید (۱۹۰۱ع) کے بعد نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن مضامین، تبصروں اور قومی نظموں کا سلسلہ جاری رہا۔ سرسید کی زندگی میں، کانفرنس کے جلسوں اور تبلیغی دوروں میں اُن کے ساتھ ساتھ رہے۔ سرسید کی وفات (۱۸۹۸ع) کے بعد بھی علی گڑھ تحریک کے فروغ میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۰۴ع میں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا، بلکہ بہ قول علامہ شبلی ”اس خطاب کو (حالی سے منسوب ہونے کی) عزت حاصل ہوئی۔“ آخر دسمبر ۱۹۰۵ع میں نظام دکن کے جشن چہل سالہ کی سال گرہ کی روداد لکھنے کے لیے حیدر آباد بلائے گئے۔ ۷ جون ۱۹۰۶ع تک حیدر آباد میں مقیم رہے۔ اسی قیام کے زمانے میں اپنی مشہور نظم ”چپ کی داد“ لکھی جو مہاراجا سرکشن پرشاد کے زیر صدارت ایک جلسے میں سنائی گئی[1]۔ ۱۹۰۵ع میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے موقع پر اُن کی یادگار میں ایک ہائی اسکول قائم کرنے کی غرض سے حالی نے

۱۔ حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۲۱۳۔

چندہ جمع کیا لیکن چندے کی رقم ناکافی تھی ، اس لیے ہائی اسکول کے بجائے شہر کے وسط میں ایک پبلک لائبریری قائم کی اور بہت سی کتابیں اپنی کوشش سے جمع کیں۔ تقریباً ۱۸۹۴ع میں حالی نے اپنے گھر کے قریب ایک مدرسۂ نسواں قائم کیا تھا ؛ لیکن بعض دشواریوں کی وجہ سے وہ اسکول زیادہ عرصے تک نہ چل سکا[1]۔ چند سال بعد خواجہ سجاد حسین نے حالی کے ایماء سے ایک ابتدائی مسلم اسکول کھول دیا جو ۱۹۵۱ع میں ہائی اسکول ہوا اور حالی کے نام منسوب ہو کر حالی مسلم ہائی اسکول کہلانے لگا۔ حالی کی یہ یادگار ۱۹۴۷ع کے فسادات کی نظر ہو گئی[2]۔ ۱۹۰۶ع میں حیدر آباد سے واپسی کے بعد حالی کی داہنی آنکھ میں پانی اتر آیا جس کی وجہ سے وہ کچھ عرصے تک لکھنے پڑھنے سے معذور رہے۔ ۱۹۰۷ع میں پٹیالہ میں آنکھ کا آپریشن کرایا لیکن یہ آپریشن کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوا ، البتہ نوشت و خواند میں قدرے سہولت ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد دوسری آنکھ میں بھی پانی اتر آیا۔ ۱۹۱۱ع میں لکھنؤ جا کر آپریشن کرانا پڑا۔ اس کے بعد عینک کی مدد سے پڑھنے لگے۔ دسمبر ۱۹۰۷ع میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو حالی اس کے صدر منتخب ہوئے۔ زندگی کے آخری زمانے میں انھیں اپنے علمی و ادبی کاموں کی تکمیل کے لیے سکون کی تلاش تھی۔ گھر میں خانگی تفکرات کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملتا تھا۔ انھیں اپنے کلیات کی

۱- یادگار حالی ، صفحہ ۱۱۶ -

۲- یادگار حالی ، صفحہ ۵۷ -

ترتیب و تدوین کی سب سے زیادہ فکر تھی - بالآخر ۱۹۱۲ع میں اپنے ایک عزیز اور ہم وطن ، ڈاکٹر لیاقت حسین کے پاس فرید آباد میں چار پانچ ماہ رہ کر اپنا عربی و فارسی کلام مرتب کرنا شروع کیا - وہاں بھی ملاقاتیوں اور عقیدت مندوں نے پیچھا نہ چھوڑا - بہرحال یہ مجموعہ مرتب ہو گیا - لیکن اردو کلیات نظم کی ترتیب و طباعت کی حسرت ہی رہ گئی - نزلہ ، زکام ، دمہ اور بواسیر کے امراض تو مزمن تھے ، اسّی سال کی عمر میں ضعف جسمانی کی وجہ سے کئی اور امراض پیدا ہو گئے - ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ع کو 'فرشتہ سیرت' حالی کی روح ملاء اعلیٰ میں پہنچ گئی اور جسد خاکی درگاہ حضرت بوعلی شاہ قلندر کے صحن میں مدفون ہوا - (مرتب)

دیباچہ

مسدس مد و جزر اسلام

۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ع

(از مصنف)

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے ، ایک ایسے دل‌چسپ اور پر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا ۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے ، نہ خاردار جھاڑیاں تھیں ، نہ آندھیوں کے طوفان تھے، نہ باد سموم کی لپٹ تھی ۔

جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دل فریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہوگئیں ۔ مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا ۔ اس کی سرسبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اس کے خوش نما پودوں پر سانپ اور بچھو لپٹے ہوئے تھے ۔ جوں ہی اس کی حد میں قدم رکھا ہر گوشے سے شیر و پلنگ

اور مار و کژدم نکل آئے۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کی مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی؛ خود آرائی کا خیال آیا، نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذت اٹھائی، نہ فراق کا مزا چکھا :

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریابار سے تمام عالم کو ڈبو دیا؛ آہ و فغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے ہو گئے، شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہوگیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا، یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہوگئے۔ جب شوق کا دریا امنڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر ہوا، بہشت و دوزخ کی سیر کی؛ بادہ نوشی پر آئے تو خم کے خم لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانۂ خمار کی چوکھٹ پر جبہہ سائی کی، کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بیزار رہے۔ پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کہیں،

واعظوں کا خاکہ اڑایا ۔ دیر اور بت خانے کی تعظیم کی ، کعبہ اور مسجد کی توہین کی ۔ خدا سے شوخیاں کیں ، نبیوں سے گستاخیاں کیں ، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا ، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا ۔ غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں ، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیے ۔ ہر مشت خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے ، ہر چوب خشک میں عصائے موسوی کے کرشمے دکھائے ، ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا ، ہر فرعون بے سامان کو قادر مطلق سے جا بھڑایا ۔ جس کے مداح بنے اسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا ۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی :

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود
تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے ۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں :

شکست رنگ شباب و ہنوز رعنائی
دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں ۔ شاہ راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا ۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری

چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں دود رہی ہو ، ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا ۔ اس کے سوا بیس برس کی بےکار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی ۔ لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا ۔ چند روز اسی تردد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے پڑتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا ۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ، ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے ۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے ، تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں ۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ اُفتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں ۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں ، پیروں میں چھالے پڑے ہیں ، دم چڑھ رہا ہے ، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں ۔ لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے ، اسی طرح تازہ دم ہے ۔ نہ اسے رستے کی تکان ہے ، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے ، نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے ۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے ، وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے ۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی ۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ ، اسی دشوارگزار رستے پر پڑ لیے ۔ نہ یہ خبر ہے کہاں جاتے ہیں ، نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں ۔ نہ طلب صادق ہے ، نہ قدم راسخ ہے ، نہ عزم ہے ، نہ استقلال ہے ، نہ صدق ہے ، نہ اخلاص ہے ۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لیے جاتا ہے ۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہوگیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے ابھاروں سے دل بڑھتا تھا، نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا، مگر یہ ایک ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بخارات درونی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیرخواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے:

رو چو انساں لب بجنباں در دہن
ور جمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہوگئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں

میں پڑی ہے - جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے - امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں ، غافل اور بے پروا ہیں - علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے ، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں - ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے - ہرچند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے ، قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی - اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا ، مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں ؛ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے ، دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے - پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے :

در فیض ست منشیں از کشائش ناامید ایں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می‌روید کلید ایں جا

”وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ“ (اور وہ ایسا خدا ہے کہ جب لوگ ناامید ہو جاتے ہیں تو مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے) ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی - دل سے ہی نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری - برسوں کی بجھی ہوئی

طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں ایک ابال آیا ۔ افسردہ دل ، بوسیدہ دماغ ، جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انھی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی ۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا مگر ہر حال میں یہ دھن لگی رہی ۔ بارے الحمد للہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا ۔ صرف ایک امید کے سہارے پر یہ راہِ دور دراز طے ہو گئی ہے ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہے اور نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے :

خبرم نیست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید

اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا ہے ۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبیِ امی ؐ کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعۃً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے ۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے ۔ اگرچہ اس جاں کاہ نظم

میں جس کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے ، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے مگر شکر ہے کہ جس قدر ہوگیا اتنی بھی آمید نہ تھی ۔ ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہرا اس رو کھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے ، کیوں کہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے ، نہ رنگیں بیانی ۔ نہ مبالغے کی چاٹ ہے ، نہ تکلف کی چاشنی ہے ۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے کہ ''لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر'' (نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی بشر کے دل میں گزرا) گویا اہل دہلی و لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں ۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے کی گئی ہے ۔ اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو اُن کا احسان ہے ورنہ کچھ شکایت نہیں ۔

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

★

مکتوب سرسید بنام مولانا حالی

جناب مخدوم و مکرم من ! عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے - جس وقت ہاتھوں میں آئی ، جب تک ختم نہ ہوئی ، ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی - اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے - کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے ، بیان سے باہر ہے - تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغے ، جھوٹ ، تشبیہاتِ دورازکار سے ، جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے ، بالکل مبرا ہے ، کیوں کر ایسی خوبی اور خوش بیانی اور مؤثر طریقہ پر ادا ہوتا ہے - متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے - حق ہے ، جو دل سے نکلتی ہے ، دل میں بیٹھتی ہے - نثر بھی نہایت عمدہ و نئے ڈھنگ کی ہے - پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے - میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے ، اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں - اگر پرانی شاعری کی بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انھی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے - بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ 'تو کیا لایا ؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں - خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے - مسجد کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں - آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور

کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جمیع امور سے مجھے مطلع فرمائیے۔ یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں۔ آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے اور رجسٹری کر دی جائے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔ مگر نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو، جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو 'تہذیب الاخلاق' میں چھاپوں گا۔ والسلام۔

خاکسار

شملہ۔ پارک ہوٹل — آپ کا احسان مند تابع دار

۱۰ جون ۱۸۷۹ع — سید احمد

رباعی

نتیجۂ فکر جناب نواب ضیاء الدین احمد
خاں بہادر متخلص بہ نیر (رئیس لوہارو)
در تبصرۂ کہ گفت حالی حالی

بنوشت ز خوب و زشت حالی حالی
پرسند اگر کہ کیست غم خوارۂ قوم
نیر حالی بگو کہ حالی! حالی!

[منقول از 'تہذیب الاخلاق' (جلد ۱۸۸۰ع) صفحہ ۱۰۱]

دیباچہ

متعلق بہ ضمیمہ مسدس مد و جزر اسلام

۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ع

(از مصنف)

حدیث درد دلاویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد

"مسدس مد و جزر اسلام" اول ہی اول ۱۲۹۶ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا - اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے شاید کوئی معتد بہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت و شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقعہ تعجب انگیز ہے - نظم بالکل غیرمانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے - قوم کی برائیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ و سناں کا کام لیا گیا تھا - ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ابرار و اخیار مذہبی سوے ظن رکھتے تھے - تعصب عموماً کلمۂ حق سننے سے مانع تھا، بااین ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی - ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں - بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے - مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں - اکثر

لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں - اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں - کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کیے جاتے ہیں - بہت سے مسدس اسی کی روش پر اسی بحر میں ترتیب دیے گئے ہیں - اکثر اخباروں میں موافق و مخالف ریویو اس پر لکھے گئے ہیں - شمال مغربی اضلاع کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کر دیا گیا ہے - یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نے اس کی طرف کافی توجہ کی ہے ، مگر اس پر مصنف کو کچھ فخر کرنے کا محل نہیں ہے - اگر قوم کے دل میں متأثر ہونے کا مادہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی ایسی ہزار نظمیں بے کار تھیں - پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمینِ شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی - اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں ہے - وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر رستے کی تلاش میں چپ و راست نگراں ہیں - ان کے ہنر مفقود ہو گئے ہیں مگر قابلیت موجود ہے - ان کی صورت بدل گئی ہے مگر ہیولیٰ باقی ہے - ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے مگر زائل نہیں ہوئے - ان کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلا سے پھر نمودار ہو سکتے ہیں - ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی - ان کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی -

یہ نظم جس میں قوم کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا صحیح صحیح نقشہ کھینچنا مد نظر تھا ، اگرچہ مشرق کی

عام نظموں کی بہ نسبت مبالغے سے خالی تھی لیکن فروگذاشت سے خالی نہ تھی ۔ دوست کی نگاہ نکتہ چینی اور خوردہ گیری میں وہی کام کرتی ہے جو دشمن کی نگاہ کرتی ہے ۔ دونوں یکساں عیبوں پر خوردہ گیری اور چشم پوشی کرتے ہیں مگر دشمن اس غرض سے کہ عیب ظاہر ہوں اور خوبیاں مخفی رہیں اور دوست اس خوف سے کہ مبادا خوبیوں کا غرور عیبوں کی اصلاح سے باز رکھے ۔ مصنف بھی جو کہ دوستی کا دم بھرتا ہے ، شاید محبت اور دل سوزی ہی سے قوم کی عیب جوئی پر مجبور ہوا اور ہنرگستری سے معذور رہا ۔ مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا ۔ مصنف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی ۔ نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں ۔ شاید اس خرابی کا تدراک کچھ نہ ہو سکتا اگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی اور قوم کو ایک نئے خطاب کا مستحق نہ ٹھہراتی ۔ گو قوم نہیں بدلی مگر اس کے تیور بدلتے جاتے ہیں ۔ پس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفرین ضرور کم ہونی چاہیے ۔ بعض احباب کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا ۔ ضمیمے کو طول دینا مصنف کا مقصود نہ تھا لیکن اس مضمون کو چھیڑ کر طول سے بچنا ایسا ہی مشکل تھا جیسے سمندر میں کود کر ہاتھ پاؤں نہ مارنا ۔

قدیم مسدس میں جستہ جستہ تصرف کیا گیا ہے ۔

شاید بعض تصرفات کو ناظرین اس وجہ سے کہ قدیم اسلوب مانوس ہو گیا تھا ، پسند نہ کریں ۔ مگر مصنف کا فرض تھا کہ دوستوں کی ضیافت میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کرے جو خود اس کے مذاق میں ناگوار معلوم ہو ۔ نظم نہ پہلے پسند کے قابل تھی اور نہ اب ہے ۔ مگر الحمد للہ کہ درد اور سچ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے ۔ امید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

★

دیباچہ دیوان حالی

(از مصنف)

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا تعشق کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا ۔ اول تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولے سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے ۔ اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے ۔ پھر قوم[1] کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا ہے اسی خیال کی تائید کرتا ہے ۔ با ایں ہمہ حداثت سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہد رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیر زال کی صورت میں کیا جائے اور شراب ارغوانی کی جگہ سرکۂ بے نمک سے ضیافت طبع کی جائے ۔ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا ۔ خود بھی یہ سودا اچھلا ۔ آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر

۱- قوم سے یہاں اس کے متعارف معنی مراد نہیں بلکہ قوم سے مراد شعراء ہیں ۔

راہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلے کے ساتھ راہ کی ہمواری اور رہ‌گزر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا، وہ تمام سیمیانی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے، رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل و تشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

یقولون ھل قبل الثلثین ملعب[1]
فقلت و ھل بعد الثلثین ملعب

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے۔ مگر زمانے کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دل فریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں ؎

یکرہ بحال خویش ہم آخر تواں گریست
تا چند بر فلان و بہ بہمان گریستن

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں؛ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند، مگر چوٹ سب کے

۱- یعنی لوگ کہتے ہیں: کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہے؟ سو میں نے ان سے کہا: کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟

دل پر لگی - کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی ؛ اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی - جو نظمیں کسی قدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی ہیں - اب زیادہ تر کچھ بچے کھچے متفرق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں جن میں سے کسی قدر قطعہ و رباعی کے لباس میں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کیے گئے ہیں - ان کے سوا چند ترکیب بند ، ایک آدھ مسمط ، کچھ قصیدے اور تاریخیں ہیں جن میں سے اکثر خاص خاص طور پر وقتاً بعد وقتِ شائع ہو چکی ہیں لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں - پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصۂ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے - انسان کی طبیعت کا مقتضا ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے سر انجام ہوتا ہے ، عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو ، وہ اس کو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے - جس فخر کے ساتھ وہ اعرابی[1]

۱- یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہارون رشید کے زمانے میں ایک بدوی جس نے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزہ نہ چکھا تھا ، اس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے نسبت نہ رکھتا تھا لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوی ہمیشہ پیا کرتا تھا ، اس سے کسی قدر میٹھا تھا - وہ خوشی خوشی اس کی ایک مشک بھر کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے دربار میں اس کو بطور ایک علق نفیس کے پیش کیا - خلیفہ نے اس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا - مگر اس کی بد مزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اس کو انعام دے کر رخصت کیا اور حکم دیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا -

جس نے کبھی آب شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا ، ایک کھاری پانی کے چشمے سے مشک بھر کر ہارون رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لے گیا تھا ، وہ اس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کلمبس امریکا دریافت کرکے ازبلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا ۔ پس یہ تمام مجموعہ جس میں کچھ نئے اور کچھ پرانے خیالات شامل ہیں ، محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھیے مردود ہو یا مقبول ، ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے ، ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں ۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانے کے خیالات میں پہلے زمانے کی بہ نسبت حقائق و واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے ، اور جیسی کہ امید کی جاتی ہے ، ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے ۔ مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں ، ایسے سچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہم کو بھی معلوم نہیں ، تا بدیگراں چہ رسد ۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولے سے ہوتا ہے ویسا ہی بلکہ بعض اوقات اس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش ، تحسین و آفرین کے لالچ ، جلب منفعت کی توقع یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے ؛ اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا ۔ لیکن اگرچہ ہم اس وقت نہ ہوں گے مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ پانی کو الگ کیے بغیر نہ رہے گا ۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا اور جھوٹ برسات کے سبزے کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا ۔

وکم قد رأینا من فروع کثیرۃ
تموت اذا لم تحیھنّ اصول[۱]

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان اور زبان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے مگر پہیا اور دھرا باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیے تھے مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجا، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے، خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متأخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقۂ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیے اسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے اور اپنی وضع، صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل دور کر دے؛ اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھی پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔ اور قدما کا دل سے شکرگزار ہو جو اس کے لیے ایسے

۱۔ ترجمہ: ہم نے وہ شاخیں اکثر سوکھتی دیکھی ہیں، جن کی جڑیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شاخوں کو سرسبز رکھ سکیں۔

منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے ۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعے کو اور نیز ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں ، دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے ؟ نہ خیالات ہی اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں اور نہ طرز بیان ہی میں کوئی ایسی جدت جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں ۔ اور وہ یہ سمجھ کر بے اختیار پکار اٹھیں کہ ھذا الذی رزقنا من قبل[1] ۔ پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا میں ، جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ، وہ بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا ۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے ہیں ، اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے ۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن کی ان تک رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و نا شاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت ان کے پیش نظر ہیں مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور مبتذل ہیں کہ ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی

---

۱ ۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے ہذاالذی رزقنا من قبل (یعنی یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزہ اور لذت جدا ہوگی ۔

طرف بہت کم التفات کیا گیا اور پایۂ شاعری کو ان سے وراء الورا سمجھا گیا ہے - لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید انھی مبتذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا :

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے ، ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لا سکے - اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے - پس جس طرح عمارت تیار کرنے میں معمار اینٹ، مٹی، چونے کا یا بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے ، اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مسالے کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو - وہ مسالہ کیا ہے ؟ یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں ؛ خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں یا زمین ، آسمان ، چاند ، سورج ، پہاڑ ، اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا مچھر، مکڑی اور بھنگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے - پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی ، اس کی مثال اس معمار کی سی ہوگی ، جو عمارت بنانے کے لیے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مسالے کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی :

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی ، معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزول مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانے کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقے کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورتِ وقت ، اقوال سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیے گئے۔ کہیں ان کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اس کو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات و رباعیات میں اخلاق مضامین کنایہ میں ادا کیے گئے ہیں جو شاید کہیں کہیں مطائبہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں ، مگر انوری و سعدی و شفائی کے مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریا و مکر و سالوس و عُجب و خود پسندی اور اسی قسم کے اخلاق واعظ و زاہد و صوفی و شیخ و ملا پر ڈھالے گئے نہ اس لیے کہ نعوذ باللہ اس فرقۂ علیا کی مذمت مقصود تھی بلکہ اس لیے کہ ان اخلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تر کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبا جیسا اجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ، ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں ، مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح

ریا و عُجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے ، مگر جب اس کو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈراؤنی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعر کی علت غائی ہے - ایک شاعر جب اخلاق مضامین بیان کرتا ہے تو اس کو بہ ضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے، اس لیے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے - اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہوبہو تصویر کھینچ دکھاتا اور گھر کے بھیدی کی طرح چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے - ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ ، پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے - پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے :

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اس کو ساری
حالی سے بد گمانی بے جا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہو سکے کہ اس میں فطرت انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جس کی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو، وہ پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح

نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ خود اس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے - اسی طرح ایک دوسرا شاعر جس نے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقے سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا ، وہ رند و اوباش کی صحبتوں کا ایسا چربہ اتار دیتا ہے کہ گویا انھی میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے - ابونواس نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع سن کر ، جس میں رات کے تخلیے اور عیش کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا ، اس مصرعے کی تضمین میں ایسے واقعات بیان کر دیے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہو کر بے ساختہ یہ کہہ اٹھتا تھا : ''قاتلک اللہ کانک کنت ثالثاً''[۱] - شکسپیر جس کے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنے والے تھے اور جس نے کبھی آنکھ کھول کر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی ، اس نے میکبتھ ، جولیٹ ، کیتھرائن ، ڈزڈیمونا اور بعض اور لیڈیوں کے ایسے اصلی کیرکٹر دکھائے ہیں جن کا اس سوسائٹی پر جس میں اس کی عمر گزری تھی ، کبھی پرچھاواں تک نہ پڑا تھا - ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس ، رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکانے کی لکھ جاتے ہیں ، جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود ان پر گزرے تھے -

اس عذر سے اگرچہ کسی قدر شاعر کی برأت ہو سکتی ہے ، مگر پھر بھی اس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا

---

۱ - خدا تجھ کو شرمائے گویا تیسرا ہم میں تو تھا - یعنی تو نے ایسے صحیح واقعات بیان کیے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا -

جا سکتا ۔ ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے ، بخلاف شاعر کے کہ اس کا اصلی مقصد فطرت انسانی کی کرید اور واقعات دہر سے متأثر ہو کر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس ۔ وہ کسی کے سمجھانے کے لیے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھ کر چیخ اٹھتا ہے :

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر
دردمند ان کے نہ اُن کے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر
نالۂ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اس کے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اس کو واعظ یا ناصح قرار دے کر یہ الزام نہیں دینا چاہیے کہ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم[1] ۔ بلکہ اس کی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیے کہ انھم یقولون ما لا یفعلون[2] ۔

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقض پایا جانا ایک ضروری بات ہے بلکہ اس کے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کہ کما قال اللہ تعالیٰ ولوکان من عند غیراللہ لوجد و فیہ اختلافاً کثیراً[3] ۔ مگر جس طرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا اس تصنیف کو عیب لگاتا ہے ، اس طرح شاعر کے کلام کو عیب

---

۱ ۔ کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا حالانکہ تم اپنی جانوں کو بھولے ہوئے ہو ۔

۲ ۔ تحقیق وہ کہتے ہیں مگر کرتے نہیں ۔

۳ ۔ جس طرح کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ خدا کے سوا اگر یہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے ۔

نہیں لگاتا بلکہ اس کا بے ساختہ پن ظاہر کرتا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیے ۔ فلسفی یا مورخ ہر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو ۔ لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اس کے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اس کے دل کو بے چین کر دے ، اس کو اسی طرح بیان کرے ۔ پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو ، اس کو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے ۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا کہ اس کو حقائق و واقعات کے ہر پہلو پر نظر رکھنی پڑے بلکہ جس طرح ایک فوٹوگرافر ایک ہی عمارت کی کبھی روکار کا ، کبھی پچھیت کا ، کبھی اس ضلع کا ، کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اتارتا ہے ، اسی طرح شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے ۔ پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت ۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی تعریف ، کیونکہ خیر محض کے سوا ہر خیر میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ہر شر میں خیر کا پہلو موجود ہے ۔ عقل ، علم ، زہد ، دولت ، عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں مگر شعرا نے ان کی جا بجا مذمت کی ہے ۔ اسی طرح دیوانگی ، نادانی ، رندی ، فقر ، ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں لیکن شعرا ان کے اکثر مداح رہے ہیں ۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے ۔ وہ کبھی قدماء کے مقابلے میں اس لیے کہ وہ استاد اور موجد فن تھے ، اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے ۔ اور کبھی اس لیے کہ اس نے ان کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو ان کے پاس نہ تھی ، اپنے تئیں ترجیح دیتا ہے ۔ وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دارالغرور و دارالمحن ہے اور کبھی اس کی بڑائی و عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعۂ آخرت ہے ۔ وہ کبھی ایک ہی گورنمنٹ کی اس کی خوبیوں کے سبب سے ستائش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت ۔ مگر وہ کبھی ان حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اس کے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں ۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو گویا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہے ۔ وہ ایک نادان بچے کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے ۔ مگر نہ اس کے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا ۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھ کر لوگ متعجب ہوں مگر جب تک شاعر کا سا دل ان کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا ان کے دماغ میں نہ ہو ، ان کا تعجب رفع ہونا مشکل ہے :

بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

یہ چند اصول جو اوپر بیان کیے گئے ہیں ، ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود

ہے ، کیوں کہ جس طرح فوارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اچھلتا ہے ، اسی طرح نکتہ چینوں کی زبان بند کرنے سے اور زیادہ اچھلتی ہے ۔ دوسرے ، نکتہ چینوں سے کان اس قدر مانوس ہوگئے ہیں کہ جس طرح توپ خانے کا گھوڑا توپ کی آواز سے کان نہیں ہلاتا ، اسی طرح مصنف نکتہ چینوں کے شوروغل کی کچھ پروا نہیں کرتے ۔ پس ان کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت ۔ البتہ ضرورتِ وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچے میں یہ چند باتیں جتا دی جائیں ۔ ظاہر ہے کہ سویلزیشن ، جس کو شعر و شاعری کا قاتل کہا جاتا ہے ، اس کا پرچھاواں اس ملک پر بھی پڑنے لگا ہے ۔ شعر جس کو مدرسے میں لے جانے کی اجازت نہ تھی[۱] اس کو روز بروز زیادہ تر مدرسے ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے ۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پتلے جوق در جوق اور فوج در فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوق معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شعرا ان کے نزدیک عقل و دانائی سے ۔ ان پر شعر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حدی خوان کی آواز اثر کرتی ہے ۔ غرضیکہ شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے اور ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے ۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے ۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ

---

۱ - یہ اشارہ ہے اس مشہور مقولے کی طرف کہ "شعر مرا بہ مدرسہ مبر" ۔

اصول بیان کرنا ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی - اسی لیے مقدمے میں مطلق شاعری پر کسی قدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے اور چند باتیں جو خاص اس مجموعے سے علاقہ رکھتی تھیں، وہ اب دیباچے میں بیان کی گئیں - لیکن اگر غور کیجیے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی - مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار، سرے سے شعر کہنے کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی : ع

آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

مگر مدبرالسمٰوات والارض نے اس خرابۂ آباد نما کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے رہیں، دھوکے کو حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں، اور جس کوشش و جاں فشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے بودے اور کمزور جالے کے پورنے میں سرگرم رہتی ہے، اسی کوشش و جاں فشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور پا در ہوا عمارتیں چنتے رہیں، یہاں تک کہ فنا ہو جائیں -

در کارخانۂ کہ بنایش بہ غفلت است
ہشیار زیستن نہ ز قانون حکمت است
نروح و نغدوا لحاجاتنا
وحاجة من عاش لا تنقضی
و یسلبہ الموت اثوابہ
و یمنعہ الموت مایشتہی

تموت مع المرء حاجاته
و تبقى له حاجة ما بقى[1]

---

۱ - ترجمہ : ہم اپنے کاموں میں صبح و شام سر گرم ہیں اور جو شخص زندہ ہے اس کا کام ختم نہیں ہو سکتا - موت ہی اس کے کپڑے اُتروائے گی اور موت ہی اس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی - انسان کی خواہشیں اُس کے ساتھ ہی مریں گی - جب تک وہ زندہ ہے ، کوئی نہ کوئی خواہش اُس کے ساتھ لگی ہوئی ہے -

دیباچہ مجموعۂ نظم حالی

(از مصنف)

۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب، کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو، وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔ یہ تحریک اگر پندرہ برس پہلے کی جاتی تو شاید اس پر کوئی ثمرہ مترتب نہ ہوتا، کیونکہ جو لوگ ہندوستان میں اردو نظم پر تھوڑی یا بہت قدرت رکھتے تھے وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے اور مبالغے کو شعر کے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ وہ واقعہ نگاری اور تصویر حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔ انھوں نے مغربی انشا پردازی کا کوئی نمونہ بھی اپنی زبان میں نہیں دیکھا تھا جس پر وہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھنے کے قابل ہوتے۔ لیکن یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت ہوئی جب کہ اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جا رہی تھی۔ لٹریچر میں بہت سی کتابیں

اور مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے - دیسی اخباروں میں بھی جن میں سے سینٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہے ، انگریزی آرٹکلوں کے ترجمے ہونے لگے تھے - ان اسباب سے مغربی طرز تحریر اور مغربی طرز بیان آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جاتی تھی - یہاں تک کہ ۱۸۷۲ء[۱] میں سرسید احمد خاں نے پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کے سبب سے اُن مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے ، بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا - اُردو فارسی انشا پردازی کا قدیم طریقہ اُن کی نظر میں نہایت سخیف اور سبک معلوم ہونے لگا اور اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے - اگرچہ مغربی شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ اس وقت اُردو زبان میں موجود نہ تھا اور نہ اب تک موجود ہے - لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ''دیوانہ را ہوئے بس است'' جدت پسند طبیعتوں پر جس قدر مغربی انشا پردازی کی لے اب تک کھلی تھی ، وہی اُن کو لے اڑی - بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہن مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا ، اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے - اگرچہ یہ صحبت مدت تک جمی رہی لیکن راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بہ سبب ناموافقت

---

۱ - مجموعۂ نظم حالی کے تمام نسخوں میں ۱۸۷۰ء کے بجائے ۱۸۷۲ء درج ہے - لیکن اسے سہو کتابت ہی سمجھنا چاہیے - تہذیب الاخلاق کے اجراء کے بارے میں خود مولانا حالی لکھتے ہیں : ''یکم شوال ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا پہلا نمبر شائع ہوا''- (حیات جاوید ، طبع جدید - اکادمی پنجاب ، لاہور- ص ۲۱۸)

آب و ہوا کے لاہور سے تبدیل ہو کر دہلی چلا آیا ۔ مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے ۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا ۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغے سے اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا ۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عاید ہو ۔

چار مثنویاں جو اس مجموعے میں سب سے اول درج کی گئی ہیں یعنی برکھا رت ، نشاط امید ، حب وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف ، اسی مشاعرے کی نظمیں ہیں جو مشاعروں کی ترتیب کے موافق اس کتاب میں داخل کی گئی ہیں ۔ ان کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو مشاعرۂ مذکور سے کچھ تعلق نہیں ہے ۔ محض بہ تقاضائے وقت و مقتضائے طبیعت یا بہ تحریک بعض اکابر قوم وقتاً بعد وقتٍ وحیناً بعد حینٍ ترتیب پا کر ان میں سے چند عام طور پر شائع ہو گئی ہیں ، اور چند بالکل شائع نہیں ہوئیں اور کچھ اخباروں وغیرہ کے ذریعے سے بعض احباب ۔ پبلک کی نذر کی ہیں ۔

میرے اکثر دوست مدت سے متقاضی تھے کہ تمام ہفوات ایک جگہ جمع کر کے نکتہ نواز دوستوں سے داد اور نکتہ گیر یاروں سے اپنے کلام کی اصلاح میں امداد لوں ۔ لیکن جو نظمیں عام طور پر شائع ہو رہی ہیں جیسے

مدوجزر اسلام ، مناجات بیوہ ، حقوق اولاد ، شکوۂ ہند وغیرہ کو اس مجموعے میں داخل کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی اور دیوان غزلیات و قطعات و رباعیات وغیرہ میں ابھی کچھ اور بڑھانا باقی ہے ، اس لیے ان کو چھوڑ کر باقی اکثر نظمیں جو ۱۸۷۴ء سے اب تک لکھی گئی ہیں ، سب ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں ۔

میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے ، معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں ہو سکا اور ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں ، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا ۔ البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے ۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے ، جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ام
بو کہ بعد از ماشود ایں تخم نخل بار دار

(الطاف حسین حالی)

۱۸۹۳ء

٭

فصل اول

غزلیات

(ا) دور اول (غزلیاتِ قدیم) از ۱۸۶۳ع تا ۱۸۷۴ع

(ب) دور دوم (غزلیاتِ جدید) ۱۸۷۴ع تا ۱۸۹۳ع

(ج) دور آخر ———— ۱۸۹۳ع تا ۱۹۱۴ع

۱۰۳۸۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غزلیات قدیم

۱

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمھارے شہید کا

مضمون ہے دل میں نقش ''لدینامزید[1]'' کا
کونین سے بھرے گا نہ دامن امید کا

قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

دیکھا ہے ہم نے عالم رحمت کو غور سے
ہے شش جہت میں قحط دلِ ناامید کا

شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں
انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا

ہے نردبان جذبۂ توفیق درمیاں
یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا

ہے آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ
خون جگر میں نشہ ہے جام نبید کا

تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے
یا رب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا

---

۱ - سورۂ قٓ کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے : جنت میں وہ جو کچھ چاہیں گے ، ملے گا اور (لدینا مزید :) ہمارے پاس اس سے بڑھ کر (بھی کچھ اور) ہے - (القرآن ۵۰ : ۳۵)

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر
''لاتقنطوا'' جواب ہے ''ہل من مزید'' کا[۱]

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

۲

خلوت میں تری صوفی گر نورِ صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفت جاں اس کا اندازِ کماں داری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا[۲]

یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سنا قاصد
ان پڑھ ہے تو ہے یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا

باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے الفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلہ ہوتا

ہم روز وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

۱- لاتقنطوا من رحمۃاللہ : سورۂ الزمر کی آیت ۵۳ کا ایک جزو ، یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو- ھل من مزید : سورۂ ق کی آیت ۳۰ کا آخری جزو ، یعنی (دوزخ کہے گی) کیا کوئی اور (گنہگار) ہے ؟
تذکرۂ سخن شعراء (مؤلفہ عبدالغفور نساخ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ (۱۸۷۴ع) کے لیے حالی نے اپنی غزلوں کے ۲۵ منتخب اشعار بھیجے تھے - ان میں اس غزل کا یہ شعر شامل ہے لیکن پہلا مصرع یوں ہے : ''دوزخ اگر وسیع تو رحمت وسیع تر''

۲ - سخن شعرا کے انتخاب میں اس غزل کا یہی ایک شعر درج ہے-

گر صاحب دل ہوتے، سن کر مری بے تابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے درگزرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانیے کیا ہوتا

کل **حالی** دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

۳

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں کوئی میہماں نہ تھا

ہم کو بہار میں بھی سر گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا[1]

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیم جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاس خاطر نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

---

۱ - سخن شعرا کے انتخاب میں یہ شعر شامل ہے۔

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں **حالیِ** جادوبیاں نہ تھا

۴

رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا — کاٹنا ہے شب تنہائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم — شوق تھا بادیہ پیمائی کا
اس سے نادان ہی بن کر ملیے — کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ — حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیاں پائے نظر ہے جب تک — ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل — مجھ کو ڈر ہے تری خودرائی کا
بزم دشمن میں نہ جی سے اترا — پوچھنا کیا تری زیبائی کا
یہی انجام تھا اے فصل خزاں! — گل و بلبل کی شناسائی کا
مدد اے جذبۂ توفیق کہ یاں — ہو چکا کام توانائی کا
محتسب عذر بہت ہیں لیکن — اذن ہم کو نہیں گویائی کا
ہوں گے **حالی** سے بہت آوارہ — گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

۵

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا

دردا کہ لب پہ راز دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

جانی نہ قدر رحمت حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا

دُردی کشان بزم مغاں کا نہ پوچھ حال
ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرم بزم حضور تھا

روز وداع بھی شب ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شام بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر
بہرِ نماز نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا[1]

---

۱ - شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اس غزل کے دو اور شعر دریافت کیے ہیں جو بحوالۂ جواہرات حالی (صفحہ ۴۰۱) درج ذیل ہیں:

کیوں کر کہوں کہ تم مرے مرنے پہ شاد تھے
چہرہ تھا کیوں آداس جو دل میں سرور تھا
زاہد کو گر عبادت و تقویٰ پہ تھا گھمنڈ
ہم کو بھی انفعال پہ اپنے غرور تھا

۶

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا[1]

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دل رضائے غیر ہے شرط رضائے دوست
زنہار بار عشق اٹھایا نہ جائے گا

دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائے گا

مے تند و ظرف حوصلۂ اہل بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں ، جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ **حالی** پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

---

۱ - تذکرۂ سخن شعرا کے لیے حالی نے اس غزل کا دوسرا ، ساتواں اور آٹھواں شعر انتخاب کیا تھا ۔

۷

قلق اور دل میں سوا ہو گیا　　دلاسا تمھارا بلا ہو گیا[۱]
دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل　　اگر تیر اس کا خطا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور　　مرا شکر اس کا گلہ ہو گیا
وہ امید کیا جس کی ہو انتہا　　وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا　　مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت　　وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد　　ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
سمجھتے تھے جس غم کو ہم جانگزا　　وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا
نہ دے میری امید مجھ کو جواب　　رہے وہ خفا، گر خفا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعار **حالی** سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

۸

سنگ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا
اب دیکھنا ہے زور دل بے قرار کا
اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
آؤ مٹا بھی دو خلش آرزوے قتل
کیا اعتبار زندگی مستعار کا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

---

۱ - سخن شعرا میں اس غزل کا تیسرا اور چھٹا شعر درج ہے۔ لیکن تیسرے شعر میں ''اس کا'' کی جگہ ''ان کا'' ہے۔ اسی طرح چھٹے شعر کے مصرع اول میں ''اس کی'' کی جگہ ''ان کی'' ہے اور مصرع ثانی یوں ہے: وہ مل مل کے رونا بلا ہو گیا۔

سمجھو مجھے اگر ہے تمھیں آدمی کی قدر
میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا
گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال
سن لیں گے وہ مآل شب انتظار کا
اب محو بوے گل پہ ہوا کب دل حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
ہر سمت گرد ناقۂ لیلیٰ بلند ہے
پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہ سوار کا
غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا
حالی بس اب یقیں ہے کہ دلی کے ہو رہے
ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

۹

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبط راز تھا
چہرے سے اپنے شورش پنہاں عیاں ہے اب
جس دل کو قیدِ ہستیِ دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیر حلقۂ زلف بتاں ہے اب
آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب
لغزش نہ ہو، بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب[1]

---

۱ - سخن شعرا کے انتخاب میں یہ شعر موجود ہے ۔

اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

ہے وقت نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
ہاں جذب دل مدد کہ دم امتحاں ہے اب

ہے دل غم جہاں سے سبک دوش ان دنوں
سر پڑتا سوجھتا کوئی بار گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمت پیر مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

۱۰

بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
پہ چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت

جسے دیکھ کر دل ہو عاشق کا بے کل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شبِ وعدہ ہے بارِ عام ان کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غم دل نے رسوا کیا ہم کو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہے اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخِ فانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھ کر کرو قتل **حالی** کو، دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

۱۱

عہد وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز
عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز
جھونکا نسیم مصر کا آیا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزل مقصود میں کہیں
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز
آیا نہ ہوگا اس کو تغافل میں کچھ مزا
ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا
اس نے نقاب رخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز
یاں دے چکی جواب امید جواب خط
واں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز
پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا
کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز
کیا دل سے بعد مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد
بھولے ہمی کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز
سرمایۂ خلاف دو عالم ہے راز دل
باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز
کس نشّے میں ہے چور خدا جانے اس قدر
حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

۱۲

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگی شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یا رب کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دل شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قید گراں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی راز داں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرز بیاں[1] سے ہم

دل کش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ؟
پوچھیں گے جا کے **حالیِ** جادو بیاں سے ہم

۱۳

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں[2]

---

۱ - دیوان حالی، طبع سوم (صفحہ ۸۲) اور متداول نسخوں میں 'طرز ادا' چھپا ہے - (مرتب)

۲ - سخن شعرا کے انتخاب میں حالی نے اس غزل کا پہلا، ساتواں اور آٹھواں شعر شامل کیا ہے -

ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

بس ہوچکا بیاں کسل و رنج راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں[1]

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح، رہے رات بھر کہاں

۱۴

پیا ہم نے نہ جامِ بےکدورت بزم دوراں میں
خزاں کو لے گئے ہمراہ گر پہنچے گلستاں میں[2]

نہیں کچھ منحصر دل بستگی زلف پریشاں میں
جو دل چاہے تو الجھے اک غبار دود پیچاں میں

---

۱ - سخن شعرا میں یہ شعر یوں درج ہے:
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ کچھ اور بات ہے
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں
(بحوالہ "حالی بحیثیت شاعر" صفحہ ۱۹۰)

۲ - سخن شعرا میں اس غزل کا پانچواں شعر شامل ہے۔

اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشقِ زلیخا نے
نہ رہنے دے گا حسن خود نما یوسفؑ کو کنعاں میں
تصور نے بھلایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو
نہ کچھ کلفت ہے زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں
خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر
کہاں تک جی نہ گھبرائے الٰہی دردِ ہجراں میں
زباں تقریر سے قاصر، قلم تحریر سے عاجز
نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزم رنداں میں
فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کام دل اے خضر
سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہے آب حیواں میں
نہ چھوڑے گی محبت یار سے ناکام عاشق کو
نسیم مصر کو آنا ہے اک دن بیت احزاں[1] میں
گل و نسریں تو کیا، فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے
ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیر گلستاں میں
بہت دن چاہئیں یوسفؑ کو تا پہنچے زلیخا تک
نکل کر چاہ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں
نہ دی حیرت نے **حالی** فرصتِ سیر جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

۱۵

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

---

۱ - بیت احزاں یا بیت الحزن: غم کدہ یا ماتم خانہ؛ مراد وہ حجرہ جہاں حضرت یعقوبؑ اپنے محبوب بیٹے حضرت یوسفؑ کے غم میں رویا کرتے تھے -

مجھ کو تم سے پر اعتماد وفا
تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

یوں ہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرصت غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں
سرسری دل کی واردات نہیں

ذرہ ذرہ ہے مظہر خورشید
جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو ، کوہ کن ہو ، یا **حالی**
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

۱۶

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غم ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں[1]

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزہ تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

ہم نے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبل زار
بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا
فتنۂ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں

---

۱ - سخن شعرا کے انتخاب میں اس غزل کا تیسرا ، آٹھواں اور گیارھواں شعر شامل ہے - ان کے علاوہ مندرجہ ذیل شعر بھی درج ہے جو دیوان کے کسی نسخے میں موجود نہیں :

خلوت خاص میں رہ رہ کے عدو سیکھ گئے
وہ اشارے کہ تری جنبش مژگاں میں نہیں

محتسب! صدق و صفا یاں ہے انھی کے دم تک
مصلحت برہمیِ صحبتِ رنداں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دل وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھہرتے ٹھہرتے دل یونہی ٹھہر جائے گا
بات جو آج ہے وہ کل غم ہجراں میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے اُلجھاؤ ترے کاکل پیچاں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلماں میں نہیں

۱۷

غم فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں
شادی وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں[1]

---

۱ - سخن شعرا میں اس غزل کا دوسرا شعر درج ہے لیکن مصرع اولیٰ میں ''خوبروئی'' کی جگہ ''خوبیٔ رو'' اور مصرع ثانی میں ''تجھ سا'' کی جگہ ''تم سا'' ہے۔ اس شعر کے علاوہ مقطع کا یہ شعر بھی ہے جو دیوان میں موجود نہیں:

حالی انصاف کر آخر سنے انساں کب تک
طعن اغیار ہیں کچھ آپ کے اشعار نہیں

خوبروئی کے لیے زشتیِ خو بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئیَ تجھ سا طرح دار نہیں

قول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار
ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشے سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصت گفتار نہیں

حق ہوا کس سے ادا اس کی وفاداری کا
جس کے نزدیک جفا باعث آزار نہیں

دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کون سی راہ
کعبہ و دیر سے کچھ ہم کو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلع ثانی سن کر
جو تجلی[۱] میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

۱۸

میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

کچھ پتا منزل مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقت رفتار نہیں

چشم بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ
غیرت عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں

ہو چکا ناز اٹھانے ہی میں گو کام تمام
للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں

---

۱ - مطابق طبع اول (صفحہ ۱۱۲) و طبع سوم (صفحہ ۹۰) و نسخۂ الناظر (صفحہ ۸۷) لیکن متداول نسخوں میں ''تعلی'' بجائے ''تجلی'' چھپا ہے - (مرتب)

مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا
دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں

اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلب گار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی **حالی**
سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں

۱۹

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دل پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا **حالی** سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

۲۰

مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو
مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو

نہ چھیڑوں تذکرہ وصل عدو کا
اگر سمع مبارک پر گراں ہو

تقاضائے محبت ہے، وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بے قدر ہوں محفل میں تیری
کہیں ناخواندہ تو بھی میہماں ہو

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو [1]

کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے
جسے سننی ہماری داستاں ہو

مؤثر ہے بہت **حالی** ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

۲۱

حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ
مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن
مری الفت در و دیوار سے پوچھ

ہماری آہ بے تاثیر کا حال
کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ

دلوں میں ڈالنا ذوق اسیری
کمند گیسوئے خم‌دار سے پوچھ

دل مہجور سے سن لذت وصل
نشاط عافیت بیمار سے پوچھ

نہیں جز گریۂ غم حاصل عشق
ہماری چشم دریا بار سے پوچھ

---

۱ - سخن شعرا کے انتخاب میں یہ شعر شامل ہے -

نہیں آب بقا جز جلوۂ دوست
کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ

فریب وعدۂ دلدار[1] کیجئے کی قدر
شہید خنجرِ انکار سے پوچھ

فغان شوق کو مانع نہیں وصل
یہ نکتہ عندلیب زار سے پوچھ

تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم
وہ تصویر خیال یار سے پوچھ

متاع بے بہا ہے شعر **حالی**
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

۲۲

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعن وصل عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر اُلفت بہت جتانے لگے

تم کو کرنا پڑے گا عذر جفا
ہم اگر درد دل سنانے لگے

---

۱ - دیوان حالی، طبع سوم (ص ۹۴) اور متداول نسخوں میں ''وعدۂ دیدار'' درج ہے -

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے[1]

جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِّ باطن کو فاش کر یا رب
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقت رخصت تھا سخت حالیؔ پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

۲۳

حشر تک یاں دل شکیبا چاہیے
کب مِلایں دلبر سے دیکھا چاہیے

ہے تجلّی بھی نقاب روئے یار
اس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے

غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اس کو لکھا چاہیے

ہے دل افگاروں کی دلداری ضرور
گر نہیں اُلفت مدارا چاہیے

ہے کچھ اک باقی خلش اُمید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

دوستوں کی بھی نہ ہو پروا جسے
بے نیازی اس کی دیکھا چاہیے

بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کیجیے اغماض جتنا چاہیے

---

۱ - سخنِ شعرا میں یہ شعر درج ہے -

شیخ ! ہے ان کی نگہ جادو بھری
صحبت رنداں سے بچنا چاہیے
لگ گئی چپ حالیؔ رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے

۲۴

جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے
قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
دم گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشک اشک دریا ہوا چاہتا ہے
خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے
ملاپ ان سے گویا ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے
مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت
کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ ان دنوں ذوقِ عصیاں
در رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے
قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی
کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے
وفا شرط اُلفت ہے لیکن کہاں تک
دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے[1]
بہت حظ اُٹھاتا ہے دل تجھ سے مل کر
قلق دیکھیے کیا ہوا چاہتا ہے

۱۔ سخن شعرا میں یہ شعر موجود ہے۔

غم رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم
سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

۲۵

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا، یاد رہے[1]

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آداب شریعت سے تھے آگاہ مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجے
اس بھلائی کا ہے انجام برا، یاد رہے

شیخ یاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے
توبہ اُن کی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے

وادیِ عشق میں موسیٰ کو ہو گر رخصت دید
ہاتھ کٹوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے

خضر نے پاؤں اگر دشت فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہ آب بقا، یاد رہے

دل بری طرح لگا عشق بتاں میں اے شیخ
دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے

---

۱ - سخن شعرا میں اس غزل کا دوسرا، تیسرا اور نواں شعر درج ہے - لیکن تیسرے شعر کا مصرع ثانی یوں ہے:

کبھی برتی نہ ہو جو رسم وہ کیا یاد رہے

چارہ گر کار بہ اندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقت دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں **حالی** نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا ، یاد رہے

۲۶

کر دیا خوگرِ جفا تو نے
خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دور پہنچی تھی اپنی آزادی
پر خدا جانے کیا کیا تو نے

کیوں نہ آئیں گے یاں وہ اے ہمدم
بس سنا میں نے اور کہا تو نے

گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج
نہ کہا اور نہ کچھ سنا تو نے

صبر کا ہے بہت برا انجام
ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے

ابتدائے وفا ہے سر دینا
میری دیکھی نہ انتہا تو نے

دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل
اور کھویا رہا سہا تو نے

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک
ہم کو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالی اپنا کہا سنا تو نے

۲۷

کرکے بیمار دی دوا تو نے
جان سے پہلے دل لیا تو نے

رہ روِ تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے

شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا
کے مسجد سے کیا لیا تو نے

دور ہو اے دل مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزا تو نے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ
کیا کیا چشم آشنا تو نے

دل و دیں کھو کے آئے تھے سوے دیر
یاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے امید خلد پر **حالی**
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

۲۸

دل کو درد آشنا کیا تو نے
دردِ دل کو دوا کیا تو نے

طبع انساں کو دی سرشتِ وفا
خاک کو کیمیا کیا تو نے

وصلِ جاناں محال ٹھہرایا
قتل عاشق روا کیا تو نے

تھا نہ جز غم بساط عاشق میں
غم کو راحت فزا کیا تو نے

جان تھی اک وبال فرقت میں
شوق کو جاں گزا کیا تو نے

تھی محبت میں ننگ منّتِ غیر
جذبِ دل کو رسا کیا تو نے

قطعہ

راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی
درِ مےخانہ وا کیا تو نے

قطع ہونے ہی جب لگا پیوند
غیر کو آشنا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ
عشق کو رہ نما کیا تو نے

ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی
عقل کو ناخدا کیا تو نے

بڑھ گئی جب پدر کو مہر پسر[1]
اس کو اس سے جدا کیا تو نے

جب ہوا ملک و مال رہزنِ ہوش
بادشہ کو گدا کیا تو نے

جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد
درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہ رو کو ذوقِ طلب
سعی کو نارسا کیا تو نے

پردۂ چشم تھے حجاب بہت
حسن کو خود نما کیا تو نے

---

۱ - اس شعر میں پدر و پسر کا اشارہ حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کی طرف ہے اور اگلے شعر میں بادشاہ سے مراد ابراہیم ادہمؒ ہیں -

عشق کو تاب انتظار نہ تھی
غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے

حرم آباد اور دیر خراب
جو کیا سب بجا کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھے احباب
ہم کو جادو نوا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یا رب
کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے[1]

۲۹

نہ واں پرسش نہ یاں تاب سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے[2]

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

---

۱ - حالی اپنے قصیدۂ نعتیہ (ع - ''میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور'') کی فخریہ تمہید سے متعلق طویل حاشیے میں لکھتے ہیں : ''انھی دنوں (یعنی ۸۷-۱۲۸۶ھ مطابق ۷۱-۱۸۷۰ع) میں سیتا رام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا - مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں -'' غالباً حالی کا اشارہ انھی تین ہم طرح غزلوں (نمبر ۲۶ تا ۲۸) کی طرف ہے - (مرتب)

۲ - ''یہ غزل تقریباً ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ع) میں اس وقت لکھی تھی جب کہ اول ہی اول بہ تقریب ملازمت دلی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا - اس وقت اول تو دلی سے جدا ہونا سخت شاق گزرا تھا ، دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی - وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی اور وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور رہا - آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا - اس تنہائی اور سراسیمگی و غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے تھے -'' (حالی)

بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات
مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی
جو سچ پوچھو تو جائے سوے ظن ہے

بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار
تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

کروں تجھ سے بیاں کچھ درد غربت
مگر جوش سخن مُہر دہن ہے

رہے لاہور میں آ کر سو جانے
یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے

نہیں آتی کہیں یاں بوے یوسف
مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے

یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل نا شناساے چمن ہے

نہ کچھ مجنوں کو ہے پرواے لیلیٰ
نہ کچھ شیریں کو درد کوہکن ہے

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور
تصور میں مرے اک انجمن ہے

مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم
خموشی میں مری ذوق سخن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجاے خود چمن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو
جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی
مگر یاد عزیزاں راہزن ہے

نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام
یہی گر جذبۂ مہر وطن ہے

گریں نظروں سے سب باتیں پرانی
مگر اُلفت کہ اک رسم کہن ہے

بھلا **حالی** اور اُلفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حسن ظن ہے

کیا ہے اس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

۳۰

دھوم تھی اپنی پارسائی کی — کی بھی اور کس سے آشنائی کی[۱]
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے — تم کو عادت ہے خود نمائی کی
لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں — صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
ملتے غیروں سے ہو، ملو لیکن — ہم سے باتیں کرو صفائی کی
دل رہا پائے بند اُلفت دام — تھی عبث آرزو رہائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے — رکھیے اُمید دل ربائی کی
شہر و دریا سے باغ و صحرا سے — بُو نہیں آتی آشنائی کی

۱۔ یہ غزل بھی قیام لاہور کے ابتدائی ایام سے متعلق ہے۔ (مرتب)

نہ ملا کوئی غارت ایماں   رہ گئی شرم پارسائی کی
بختِ ہم داستانیِ شیدا[1]   تو نے آخر کو نارسائی کی
صحبت گاہ گاہیِ رشکی[2]   تو نے بھی ہم سے بےوفائی کی
موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے   ساعت آ پہنچی اس جدائی کی
زندہ پھرنے کی ہے ہوس **حالی**
انتہا ہے یہ بےحیائی کی

★ ★ ★

۱- ''شیدا سے مراد منشی اکرام اللہ خاں صاحب دہلوی ہیں کہ اُس زمانے میں کبھی کبھی فکر شعر کرتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔'' (حالی)

۲- ''رشکی، آنریبل نواب محمد علی خان بہادر رئیس جہانگیرآباد کا تخلص ہے۔'' (حالی)

غزلیات جدید

۱

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہوگا حق کیونکہ ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا

جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعت سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی یاں
ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا ق—(۱)

تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
(۲) جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

نشّے میں وہ احسان کے سرشار ہیں اور بے خود
جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا (۳)

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے
(۴) جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھ کر
عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا (۵)

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

۲

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا رعبِ جمال تیرا

کاوش میں ہے الٰہی، دگدا میں ہے طبیعی[1]
جو حل ہوا، نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا

چھوٹے ہوئے ہیں گو جی، پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیوں کر جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سُو عالم میں جال تیرا

اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

دل ہو کہ جان، تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

ہے پورِ زال[2] سے دل اس کا قوی زیادہ
رکھتی ہے آسرا یاں جو پیرِ زال تیرا

ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی
یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیر

---

۱ - الٰہی : الٰہیات کا عالم - طبیعی : علوم طبیعی کا عالم -
۲ - پور زال : زال کا بیٹا ، مراد رستم پہلوان -

بیگانگی میں **حالی** یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا

۳

رہِ میں دشت جنوں کی تیری عجب مزا خوش گوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشے میں خمار دیکھا
نہ جی رکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یاں انہیں بھی امیدوار دیکھا
رخ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں
نہ بلبل و گل میں واں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا
سوار محمل کی جستجو میں ہزاروں دشت طلب میں دوڑے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اٹھتا غبار دیکھا
جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا
لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پُر خطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا
بچے ہوئے کاہشوں سے یاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا
چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغ دار تیرے
گل ان کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا
خبر نہیں یہ کہ کیا ہے، کیسا ہے، کون ہے اور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اک استوار دیکھا
سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلماں
نہ ان سے کچھ تیرا بھر پایا، نہ ان سے کچھ تیرا پیار دیکھا
سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیے ہاتھ باندھ سب کے
جنہیں تھا یاں اختیار سب کچھ انہیں بھی بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بے کار تجھ کو پایا ، کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

۴

نعت

یا ملکی الصفات و یا بشری القویٰ
فیک دلیل علیٰ انک خیرالوریٰ[1]

تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ باراں سے خاک
خلقک خصب الزماں بعثک محیاالوریٰ[2]

دعویٰ روشن ترا ثابت ہے بیںنہ
صورت و سیرت تری صدق پہ تیرے گوا

قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور
اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

غیب سے بھیجا تجھے ، ٹاپتا پھرتا تھا جب
دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما

اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت
جیسے کہ ہنگام قحط قبلے سے اٹھے گھٹا

شان رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں
گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا

گلہ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو
گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا

دوڑ پڑے سوے حق کاٹ کے سب بیڑیاں
اُمیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا

---

۱ - اے ملکوتی صفات اور انسانی قابلیتیں رکھنے والے! آپ کی ذات اس بات پر دلیل ہے کہ آپ تمام مخلوقات کے سردار ہیں ۔

۲ - آپ کی پیدائش کائنات کے لیے طراوت بخش اور آپ کی بعثت مخلوق کے لیے حیات بخش ہے ۔

راہب و قسیس و حبرا رہ گئے دل تھام کے
دیکھ کے تیرا قدم ہم قدم انبیاء

خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شر و فساد
تو نے اسی کو دیا ارضِ مقدس بنا

تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب
جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحم کیا

چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت
تو نے کیا دام دام قرض سب اُن کا ادا

تو نے کیا سرِّ حق عارف و عامی پہ فاش
ایک کو سمجھا دیا ، ایک کو دکھلا دیا

چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی
ایک کے چرکا لگا ، ایک کو گھائل کیا

حجت حق کر چکا دین ترا جب تمام
پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما

دیر ہوئے بے چراغ اور صلوت یہود[2]
شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا

بجھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بت کدے
ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا

اٹھّے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھاس
مزبلہ پر چند روز پاتی ہے نشو و نما

---

۱ ۔ قسیس : عیسائی عالم جو مبلغ بھی ہو (مشنری) ۔ راہب : تارک دنیا عابد و زاہد (جو بزمانۂ بعثت ، نصاریٰ میں بہت تھے ۔) حبر : جید عالم (عرفاً یہودی عالم ، جمع احبار)

۲ ۔ صلواۃ یہود : مجازاً یہود کی عبادت گاہ ۔

غیرت حق نے مگر جلد لیا انتقام
مل گئے اٹھ اٹھ کے سب خاک میں اہل ہوا
رہ گیا نام سجاح[1] کذب میں ضرب المثل
اسود و ابن کثیر[2] خوار ہوئے برملا
سلسلۂ انبیا ختم نہ ہوتا، اگر
حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اٹھا
آتے ہی چشمہ دیا تو نے کنویں سے نکال
جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا
بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ
بھیج چکا تیرے ہاتھ ملت بیضا خدا
تجھ پہ صلٰوۃ و سلام رب سمٰوٰات سے
روزوشب و صبح و شام قدر رمال و حصیٰ[3]

۵

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا
رایوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا
کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا

---

۱ - سجاح : ایک عورت ، مدعیۂ نبوت ، کذب میں ضرب المثل : ھو اکذب من سجاح (وہ سجاح سے زیادہ کاذب ہے -)
۲ - اسود عنسی اور مسیلمہ ابن کثیر دونوں مدعی نبوت تھے -
۳ - ریت کے ذروں اور سنگ ریزوں کے برابر -

جس رہ‌گزر میں بیٹھا تو غول راہ بن کر
صنعاں[۱] سے راست‌رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا
فرہادِ کوہ‌کن کی لی تو نے جانِ شیریں
اور قیس‌عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
یعقوب[۴] سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسف[۴] سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا
لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دل‌گداز تیرے
پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رلا کے چھوڑا
عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی
عقل و خرد کا تو نے خاکہ اڑا کے چھوڑا
علم و ادب رہے ہیں دلبے[۲] ترے ہمیشہ
ہر معرکے میں تو نے ان کو دلا[۳] کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دل کش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا
اک دست‌رس سے تیری **حالی** بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

٦

دیکھ اے امید کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا
یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

---

۱ - ایک بزرگ تھے جن کے بارے میں روایت ہے کہ ایک عیسائی لڑکی کو دل دے بیٹھے اور مدت تک اس کے سؤر چراتے رہے -

۲ - وہ پرند جس پر دوسرے لڑنے والے پرندوں کو لڑائی کا طریقہ سکھاتے ہیں -

۳ - کشتی میں دلانا یعنی پچھاڑنا - کشتی کا لفظ حذف کر کے صرف ”دلانا“ بھی بولتے ہیں -

مے خانے کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا
مدت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضارا
اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے
اے زاہدو! تمھارا ہے اس میں کیا اجارا
دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اول
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
توفیق نے ہمیشہ لی تنت پر خبر یاں
جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا
انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
افسوس! اہل دیں بھی مانند اہل دنیا
خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا
امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمھارا
کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا
حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اس کے کیا کام
اچھا ہے یا برا ہے، پھر یار ہے ہمارا

۷

رونا نہ ہو گا **حالی** شاید یہ کم تمھارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمھارا
الفت میں دم بہ دم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی
چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمھارا
عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ
ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمھارا

دل جو نہیں کوئی یاں ، حیف اے صنم پرستو!
دل کش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمہارا
گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہو گا گر وزن کم تمہارا
دشت طلب کے رستو! طے ہو گے کس طرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمہارا
دو بے نواؤں کو بھی کچھ جم کے جانشینو!
بس جام جم ہمارا اور ملک جم تمہارا
روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا
کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو! ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا
ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیے سوارو
ہے لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا
رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گزرا ابھی ہے یاں سے خیل و حشم تمہارا
پھرتے ادھر آدھر ہو کس کی تلاش میں تم
گم ہے تمہی میں یارو باغ ارم تمہارا
جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو **حالی**
کچھ کر کے بھی دکھائے زور قلم تمہارا

۸

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا
خود مہر وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یا رب طلب وصل ہو یا ہو طرب وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و ارماں
چھل بل میں تم اس زالِ فسوں گر کی نہ آنا

افسوس کہ غفلت میں کٹا عہد جوانی
تھا آب بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا

دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا خبردار! کہ نازک ہے زمانا

ڈھارس سی کچھ اے ہم قدمو! تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

۹

جہاں میں **حالی** کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی، نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجیے گا

سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعویٰ
یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

اسی میں ہے خیر حضرت دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد، اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تمکو واعظ کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانے کی خو ہے نکتہ چینی ، کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضد بے کمالی ، نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد ، نہ درد الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجیے گا

تمھارا تھا دوست دار **حالی** اور اپنے بیگانے کا رضا جو
سلوک اس سے کیے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجیے گا

۱۰

ہو عزم دیر شاید کعبے سے پھر کر اپنا
آتا ہے دور ہی سے ہم کو نظر گھر اپنا

قید خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم
وحشت رہے گی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیر مغاں سے ہو کر تب سرخ رو ملیں گے
فضل و ہنر کا ہو گا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ وش ہے گر وہ تو ہے ہمارے ڈھب کا
ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی
کر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

غیروں کو لیں گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہے **حالی** کچھ دل مکدر اپنا

۱۱

معنی کا تم نے **حالی** دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے بانگ طبل شاہی دن ہو گیا جب آخر
خواب گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یاد گل کا دور خزاں میں کس کو
اے عندلیب نالاں! یہ تو نے گل کھلایا

ویراں ہے باغ تس پر پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یا رب بلبل کو کیا سنایا

اے عشق! دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی سزا سے
احسان اُس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم
کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

آیا نہ تھا کبھی یاں گویا قدم خزاں کا
دو دن میں یوں پلٹ دی کس نے چمن کی کایا

تقلیدِ قوم ہی پر گر ہے مدار تحسیں
تو ہم نے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں **حالی** جچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہم کو ان کا نشاں نہ پایا

۱۲

نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ آترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا

حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی
چپکے چپکے نفس خائن کا کہا کرتا رہا
طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہ خطا
وار اُن کا اس لیے اکثر خطّا کرتا رہا
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی
اس کو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا
منہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں
اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
تھا نہ استحقاقِ تحسیں، پر سنی تحسیں سدا
حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں
کبرِ نفس اتنا ہی یاں نشو و نما کرتا رہا
ایک عالم سے وفا کی تو نے اے **حالی** مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

۱۳

کہیں الہام منوانا پڑے گا
کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا ق (۱)
نہ ہو صوفی صفا گو تجھ میں لیکن
کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا (۲)
نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا
جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا
اُنھیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

عوام الناس کا ہوگا جنھیں منہ
انھیں خاصوں پہ منہ آنا پڑے گا

رہے وصف جناں کی مشق واعظ
تمھیں بچوں کو پھسلانا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
نہی باتوں کو دہرانا پڑے گا

قطعہ

تعلق کا ہے پھندا پیچ در پیچ
یہ عقدہ ہم کو سلجھانا پڑے گا

بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے
بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا

نہیں بو انس کی اس غم کدے میں
کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے
ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا

زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند
وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا

جو منصوبے ہیں یہ **حالی** تو شاید
ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

۱۴

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی
تمھیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا

رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی
بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑے گا

بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن
جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں **حالی**
مگر اب مری جان! ہونا پڑے گا

۱۵

کب تک اے ابر کرم ترسائے گا
مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا

پھل کچھ اے نخل وفا تجھ میں نہیں
جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا

دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام
آج اگر آیا نہیں کل آئے گا

ذوق سب جاتے رہے جز ذوق درد
اک یہ لپکا دیکھیے کب جائے گا

واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے
پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا ق—(۱)

آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت
اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا (۲)

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم
ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا (۳)

دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف
رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل
جی قفس میں اس کا کیا گھبرائے گا

رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا
شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا ق۔(۱)

ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ
دیکھیے برسے گا یا برسائے گا (۲)

مشکلوں کی جس کو **حالی** ہے خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

۱۶

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
منہ اسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں باقی ہے وہی حرصِ گناہ
پھر کیے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا

آؤ اس کو لیں ہمی جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے اُنس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے **حالی** غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

۱۷

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سر راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل، ناصح
اُس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دُکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو!
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اُس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دنیا
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگر مے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غم عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا **حالی**
کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا!

۱۸

راحت کا جہاں میں یونہی اک نام ہے گویا
راحت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا
کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دنیا میں نکو نام ہے گویا
ناچیز ہیں وہ کام، نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام ہیں ان کا یہی انعام ہے گویا
ہے وقت رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا
اٹھا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بری طرح
آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا
ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا
جب دیکھیے **حالی** کو پڑا پائیے بے کار
کرنا اسے باقی یہی اک کام ہے گویا

۱۹

درد دل کو دوا سے کیا مطلب
کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
چشمۂ زندگی ہے ذکر جمیل
خضر و آب بقا سے کیا مطلب

بادشاہی ہے نفس کی تسخیر
ظلِّ بالِ ہما سے کیا مطلب

جو کریں گے بھریں گے خود واعظ!
تم کو میری خطا سے کیا مطلب

جن کے معبود حور و غلماں ہیں
ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

کام ہے مردمی سے انساں کی
ق۔(۱) زہد یا اتقا سے کیا مطلب

ہے اگر رند دامن آلودہ
ہم کو چون و چرا سے کیا مطلب (۲)

صوفیِ شہر با صفا ہے اگر
ہو، ہماری بلا سے، کیا مطلب (۳)

نگہت مے پہ غش ہیں جو **حالی**
اُن کو دُرد و صفا سے کیا مطلب

۲۰

یہ ہیں واعظ، سب پہ منہ آتے ہیں آپ
ناصحِ قوم اس پہ کہلاتے ہیں آپ

بس بہت طعن و ملامت کر چکے
کیوں زباں رندوں کی کھلواتے ہیں آپ

ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو
چڑھ کے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ

واعظو ہے ان کو شرمانا گناہ
جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں اک اک کی تکفیر آپ کیوں؟
اس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ ق۔(۱) .

کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ (۲)
چھیڑ کر واعظ کو **حالی** خلد سے
بستر اکیوں اپنا پھنکواتے ہیں آپ

۲۱

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

زیر برقع تو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

ہٹ پہ اس کی اور پس جاتے ہیں دل
راس ہے کچھ اس کو خودرائی بہت

سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت

چور تھا زخموں میں اور کہتا تھا دل
راحت اس تکلیف میں پائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف[۴] سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

جاں نثاری پر وہ بول اٹھے مری
ہیں فدائی کم، تماشائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

۲۲

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت[1]
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

ہے غمِ روز جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخ! مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہد قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

میں بچا تیر حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

---

۱ - یہ مصرع عموماً اس طرح پڑھا جاتا ہے: "اُن کے جاتے ہی - - -" (مرتب)

حملہ اپنے پہ بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر ہے صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی[1] ہے بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی[2] اور آپ کے گھر کی صورت

۲۳

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

رچ رہی ہے کان میں یاں لے وہی
اور مغنی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہ گئی
راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اُچاٹ

جو کہے تجھ کو بنا دیں اے امیر
ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ

---

۱ - ''ڈراؤنی'' کی جگہ حالی نے اکثر ''ڈرانی'' باندھا ہے۔
(مرتب)

۲ - متداول نسخوں میں ''آپ کو'' چھپا ہے اور یہ غلطی بھی عام ہو گئی ہے - (مرتب)

ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

تیغ میں بـرش یہ اے حالی نہیں
جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

۲۴

باپ کا ہے جبھی پسر وارث
ہو ہنر کا بھی اس کے گر وارث

گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا
تیرا ہے کون اے ہنر وارث

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی
لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث

ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگہ
کریں میراث سے حذر وارث

خاک و کرمان گور و خویش و تبار
ایک میت اور اس قدر وارث

واعظو! دین کا خدا حافظ
انبیاؑ کے ہو تم اگر وارث

قوم بے پر ہے، دین بے کس ہے
گئے اسلام کے کدھر وارث

ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف
جیسے مردے کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث

۲۵

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث
دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث
جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی
رات بھر یاروں کو چھکوایا عبث
شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث
کوئی پنچھی آ کے اب پھنستا نہیں
آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث
نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث
کھیتیاں جل کر ہوئیں یاروں کی خاک
ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث
قوم کا حالی پنپنا ہے محال
تم نے رو رو سب کو رلوایا عبث

۲۶

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج
بول کر ہم نے منہ کی کھائی آج
چپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ
بات بگڑی بنی بنائی آج
شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

بزم ساقی نے دی الٹ ساری
خوب بھر بھر کے خم لنڈھائی آج

معصیت پر ہے دیر سے یا رب
ق۔(۱) نفس اور شرع میں لڑائی آج

غالب آتا ہے نفس دوں یا شرع
دیکھنی ہے تری خدائی آج (۲)

چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاربار[۱] ہیں سب بند
کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

زد سے الفت کی بچ کے چلنا تھا
مفت **حالی** نے چوٹ کھائی آج

۲۷

تلخیِ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج
یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج

رنج و شادی یاں کے ہیں سب بے ثبات
اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

تھا قناعت میں نہاں گنج فراغ
پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج

فکر و سن بڑھتے تھے شاید ساتھ ساتھ
ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج

ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا
جب کبھی جیتے تھے ہم، اے بذلہ سنج!

۱۔ مطابق طبع اول (ص ۷۸) و نسخۂ الناظر (ص ۶۰)۔ طبع سوم (ص ۶۳) اور متداول نسخوں میں ''کاروبار'' درج ہے۔ (مرتب)

آ گئی مرگ طبیعی ہم کو یاد
شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج

راہ اب سیدھی ہے **حالی** سوے دوست
ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

۲۸

بزم سے اچھی ہے ، گو دنیا ہے اے مے خوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ

نفس سے سربر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن برسرِ کیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ

شیخ ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دکاں اور رونق بازار ہیچ

شاہد معنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
سبحہ و سجادہ ہیچ اور جبہ و دستار ہیچ

ہو گرجتے جس قدر اتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو! ہے یہ سب گفتار بے کردار ہیچ

روئی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پسیجا دل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب ، اے چشم گوہر بار ، ہیچ

خوان نعمت نے ترے اے عامل مردار خوار
کر دیے آفاق کے سب خوان و خوان سالار ہیچ

ہے ادب مسند پہ ، جو کچھ ہے رئیس شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ **حالی** اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

۲۹

کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

منزلِ دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہاں سرا میں میہمانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو
ہیں اسے پانی دیے جاتے کسانوں کی طرح

ان کے غصے میں ہے دل سوزی، ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے ان کو، گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سن سن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کیجے کیا **حالی** نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں تھی پس بیانوں کی طرح

۳۰

مئے مغاں کا ہے چسکا اگر برا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ
ریا کو صدق سے ہے جام سے بدل دیتا
تمھیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ
غرور فقر و غرور غنا میں فرق ہے کیا
تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ
زباں پہ ہوتی ہے مہر ان کی جو ہیں محرم راز
پھر ایسا کیجیو ہرگز نہ ادعا اے شیخ
خبر بھی ہے تمھیں کیا بن رہی ہے بیڑے پر
ق۔(۱) ہیں آپ جون سے بیڑے کے ناخدا اے شیخ
وہ ڈوبتوں سے الگ رہتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا یہی گر ہے، مرحبا اے شیخ! (۲)
گوزن و گور ہیں بچپن سے تارک دنیا
نہایت آپ کی ہے ان کی ابتدا اے شیخ
کمال حسن عقیدت سے آیا تھا **حالی**
پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

۳۱

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا، رجا کے بعد
ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

---

۱ - ''جس'' کے معنی میں، ''جون سے'' (بر وزن کون سے) گفتگو میں مستعمل ہے لیکن تحریر میں نہیں - (مرتب)

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

یاد خدا میں جب نہ گئی دل سے اس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح ! خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفس خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکم قضا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دل کش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

۳۲

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد
تیرا قبلہ ہے جدا ، میرا جدا اے زاہد

درگزر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے
تو ترا اور کوئی ہوگا خدا اے زاہد

ہم دکھا دیں گے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روز جزا اے زاہد

قرب حق کے لیے کچھ سوز نہاں بھی ہے ضرور
خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں بھلا تم سے
تو ہی کہہ اس میں ہے کیا میری خطا اے زاہد

جال جب تک ہے یہ پھیلا ہوا دیں داری کا
فکر دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب **حالی** کے بہت آج کیے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد

۳۳

پیاس تیری بوے ساغر سے لذیذ
بلکہ جام آبِ کوثر سے لذیذ

جس کا تو قاتل ہو پھر اس کے لیے
کون سی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب
ہم کو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ

قند سے شیریں نری پہلی نگاہ
دوسری ، قند مکرر سے لذیذ

جھانجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو
بھوک ہے وہ شیر مادر سے لذیذ

ہے یہ تجھ میں کس کی بو باس اے صبا
بوے بید و مشک و عنبر سے لذیذ[1]

جو قناعت کے ہیں **حالی** میہماں
اُن کو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

۳۴

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر
وہی اصرار ہے خطاؤں پر

رہیں نا آشنا زمانے سے
حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر

۱- مطابق طبع اول متداول نسخوں میں "بوے بید مسک..." چھپا ہے -

رہرو و باخبر رہو کہ گماں
رہزنی کا ہے رہنماؤں پر
ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا
مرتے ہیں ہم انھی اداؤں پر
اس کے کوچے میں ہیں وہ بے پر و بال
اڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر
شہسواروں پہ بند ہے جو راہ
وقف ہے یاں برہنہ پاؤں پر
نہیں منعم کو اس کی بوند نصیب
مینہ برستا ہے جو گداؤں پر
نہیں محدود بخششیں تیری
زاہدوں پر نہ پارساؤں پر
حق سے درخواست عفو کی **حالی**
کیجے کس منہ سے ان خطاؤں پر

۳۵

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اس کے ہیں نہ اس کے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر
خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر
اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر

عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوئے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر

دوست اک عالم کے ہر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر، یارو حذر

عیب **حالی** اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہش تحسیں ہے حضرت کو مگر

۳۶

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
دام اٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر

گو ہو شفا سے یاس پہ جب تک ہے دم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کیے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر

آمادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی
مبروص کو رہے گا نہ عریاں کیے بغیر

عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آ پڑی ہے ضد
چھوڑیں گے نیم جاں کو نہ بے جاں کیے بغیر

مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیے بغیر

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دل ربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابناے وقت کی
چھوڑے گا وقت انھیں نہ مسلماں کیے بغیر

حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بیستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر

۳۷

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ
ہو گئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آج تک قصر امل ہے ناتمام
بندھ چکی ہے بارہا کھل کھل کے پاڑ

ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار
پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ

عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اجاڑ

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ
بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی
ان دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ
تم نے حالی کھول کر ناحق زبان
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

۳۸

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیر صف مژگاں کی نہ جانا ہرگز
چاہت اک طلعت مکروہ ہے برقع میں نہاں
کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا[1] ہرگز
جتنے رسنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

---

۱ - متداول نسخوں میں ''لگانا'' چھپا ہے اور محاورے کے لحاظ سے یہ بہتر ہے - لیکن طبع اول (صفحہ ۸۷) اور دونوں قدیم لکھنوی نسخوں میں ''بسانا'' آیا ہے - (مرتب)

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی، مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے **حالی**
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

۳۹

رنجش و التفات و ناز و نیاز
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز
شیخ! اللہ رے تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اک پتے کی جو ہم نے کہہ دی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری
تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز

آج منکر بھی ناچ اُٹھیں گے
گر مغنی کی ہے یہی آواز

قطعہ'

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف
چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

---

۱ - مولانا حالی نے ۲ اکتوبر ۱۹۱۲ع کے ایک خط میں جنگ بلقان کے واقعات پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا ہے - (مکتوبات حالی حصہ اول - صفحہ ۱۰۸) چوں کہ یہ قطعہ بھی اسی قسم کے تاثرات کا ترجمان ہے ، لہٰذا بعض حضرات نے مذکورہ خط کے حوالے سے اس قطعے کو جنگ بلقان سے متعلق قرار دیا ہے - (ملاحظہ ہو حالی کا ذہنی ارتقا صفحہ ۲۳۶ ، حالی بحیثیت شاعر صفحہ ۹۲) لیکن اول تو دیوان حالی میں اس کی شمولیت ہی اس کے تقدم کا ثبوت ہے - علاوہ ازیں دیوان میں اس قطعے پر جو حاشیہ درج ہے ، اس سے بھی اس کے صحیح پس منظر کا سراغ ملتا ہے - حاشیے کی عبارت درج ذیل ہے :

''یہ قطعہ اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ ٹرکی کو سلطان عبدالعزیز خاں کے قتل کے بعد سرویہ ، مانٹینگرو اور روس وغیرہ کے مقابلے میں اخیر صدمہ پہنچا -'' (دیوان حالی صفحہ ۸۹)

یہاں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ۱۸۷۶ع میں رونما ہوئے تھے - لیکن مورخین کا بیان ہے کہ سلطان عبدالعزیز خاں مقتول نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی جبریہ معزولی کے پانچویں دن ، قید کی حالت میں (۴ جون ۱۸۷۶ع کو) خودکشی کر لی - پھر سلطان عبدالحمید دوم کے تخت نشین ہوتے ہی جولائی ۱۸۷۶ع میں روس کے اشارے پر سرویہ اور مانٹینگرو نے ترکیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا - چند ماہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا
ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زورمند ضعیف
بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے
گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
ہے نہتوں کو رہگزر میں خطر
رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز
ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم
بھیڑیوں کے ہیں خوں میں ترلبِ آز
ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے
گھائلوں پر ہیں ہیز تیر انداز
تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے
حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس
اور یاروں کے یار ہیں غماز
ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ
ہے پر آشوب جب کہ یہ آغاز
لے ابھی تک کھلی نہیں، لیکن
غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ سے آگے)

بعد جنگ بندی کا معاہدہ ہو گیا ۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

(1) The Structure of the Ottoman Dynasty by A.D. Alderson (London 1956) p. 110

(2) History of Ottoman Turks by Edward Creasy p. 548-49

(مرتب)

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر
موج ہائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے لے آبھرے
یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

کام اسے اپنے سونپ دو **حالی**
نہیں جس کا شریک اور انباز
ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے
چارہ یاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

۴۰

جاذب **رحمت** ہے مقناطیس عصیاں اپنے پاس
رکھتے **ہیں** عاصی کمند صید غفراں اپنے پاس
عاجزوں سے مقتدر کرتے ہیں اکثر درگزر
عجز اپنا ہے کلید باب رضواں اپنے پاس
ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرماں کے
عذر خواہ اپنا ہے خود فرمان سلطاں اپنے پاس
بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند
رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس
خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس
دست برد اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمداللہ وہ مہر سلیماں اپنے پاس
دیکھنا **حالی** نہ دینا وضع فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویز استخلاف رحماں اپنے پاس

۴۱

چھیڑ اب نہ اے تصور مژگان یار بس
کافی ہے خار خارِ غمِ روزگار بس

یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے
غمخواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس

ہر داغ فصل گل کی نشانی ہے اے صبا
گلگشت کو بہت ہے دل داغ دار بس

ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں
اے آسیاے گردش لیل و نہار بس

دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ
یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر
کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

۴۲

اک ہم کو مہم برسر ایام ہے درپیش
بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش

غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے
اور معرکۂ گردش ایام ہے درپیش

وہ دن گئے جب تھا مرض صعب کا آغاز
اب اس مرض صعب کا انجام ہے درپیش

گو صبح بھی تھی روز مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش

وہ وقت گیا نشہ تھا جب زوروں پہ اپنا
اب وقت خمار مئے گلفام ہے درپیش

اُمید شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے
اب موت کا سننا ہمیں پیغام ہے درپیش

جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ **حالی** کو کوئی کام ہے درپیش

۴۳

ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دنیا سے مگر
رہزنِ دل ہیں ابھی اس کی ادائیں خاص خاص

گو زمانے نے بھلا دی دل سے اپنے فصل گل
یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص

زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص

یوں تو ہے امید سب کچھ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے **حالی** خطائیں خاص خاص

۴۴

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

حور و غلماں کے لیے لائیں دل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برآ ایک ہی شخص

قافلے گزریں وہاں کیوں کہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہے مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ سہی شیخ ، مگر ہے بخدا ایک ہی شخص
اعتراضوں کا زمانے کے ہے **حالی** پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

۴۵

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض
چرخ گرداں کو سکوں سے کیا غرض
دل میں ہے اے خضر گر صدق طلب
راہرو کو رہنموں سے کیا غرض
حاجیو ! ہے ہم کو گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض
گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
اُن کو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض
نیک کہنا ، نیک جس کو دیکھنا
ہم کو تفتیشِ دروں سے کیا غرض
دوست ہیں جب زخم دل سے بے خبر
ان کو اپنے اشک خوں سے کیا غرض
عشق سے ہے مجتنب زاہد **عبث**
شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض
کر چکا جب شیخ تسخیر قلوب
اب اسے دنیاے دوں سے کیا غرض
آئے ہو **حالی** پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

۴۶

دوست کا ناروا نہیں اعراض
دوستوں ہی کا کام ہے اغماض

چاہیے ایک سب کا ہو مقصود
گو ہوں سب کی[1] جدا جدا اغراض

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دیے ایک دکھ نے سب امراض

دیکھیے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

لا آبالی بان یّدعا تبنی
کل ناس و انت عنّی راض[2]

منعمو! بذل خیر میں یہ دیر
اپنا مطلب اور اس پہ سو اغماض

حق میں اپنوں کے سخت ممسک ہیں
جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض

رائے ہے کچھ علیل سی تیری
نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض

وعظ میں گل کترتے ہیں واعظ
منہ میں ان کے زباں ہے یا مقراض

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
ھل لنا فی نزاعنا من قاض[3]

ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد
خار کش تجھ سے ہے سوا مرتاض

---

۱ - مطابق طبع اول ، طبع سوم (صفحہ ۷۵) : ''سب کے''۔

۲ - جب تو مجھ سے راضی ہے تو پروا نہیں ، اگر زمانے بھر کے لوگ مجھے معتوب ٹھہرائیں ۔

۳ - کیا ہمارے جھگڑے کا کوئی فیصلہ کرنے والا ہے ۔

شیخ کی تھی یہ آخری تلقین
چاہیے زر تو اس سے کر اعراض

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں **حالی**
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

۴۷

رات گزری ہو چکا دورِ نشاط
طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط

دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط

دن اب اے دل منقبض رہنے کے ہیں
ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط

غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں
فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط

زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ
جانیو واعظ اسے راہِ صراط

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

کوچ کی **حالی** کرو تیاریاں
ہے قویٰ میں دم بدم اب انحطاط

۴۸

چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ
برا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
نہ ستّار ہے تو نہ غفار واعظ

نکل آئے گی سے کشی کی بھی حلت
کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ
کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ
ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن
یہ جبّہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ
نہ چھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو
یہی ہے اگر حسن گفتار ، واعظ
مسلماں نہ ہم کاش **حالی** کو کہتے
ہوئے بات کہہ کر گنہ گار واعظ

۴۹

اے بہار زندگانی الوداع — اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاض صبح پیری السلام — اے شب قدر جوانی الوداع
السلام اے قاصد ملک بقا — الوداع اے عمر فانی الوداع
روزگار ضعف و سستی الصلا — وقت سعی و جاں فشانی الوداع
فرصت عشق و جوانی الفراق — دور عیش و کامرانی الوداع
تجھ کو سمجھے تھے نعیم جاوداں — اے نعیم جاودانی الوداع
تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں — اے خدا کی مہربانی الوداع
آ لگا **حالی** کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

۵۰

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ
دیکھ اس خرام ناز پہ اتنا نہ کر دماغ
ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں
حملے سے یاں اجل کے نہیں ایک دم فراغ

یا رب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

دو چار گام نقش قدم مل کے رہ گئے
آگے چلا نہ آہوے مشکیں کا کچھ سراغ

آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہل ظرف ہوں
ساقی بھرے کھڑا ہے مئے لعل سے ایاغ

جنگل میں تختۂ گلِ خود رو کو دیکھ کر
تازہ ہوا زمانے کی ناقدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں
باری تب اُن کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

۵۱

حق نہ ملا نے کچھ بتایا صاف
اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف

آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھلی
مہرِ روشن نظر نہ آیا صاف

کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم
صاف تھے آپ، سب کو پایا صاف

زاہدو! ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

کیوں فقیہوں سے رک گئے **حالی**
بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

۵۲

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لائق
نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لائق

کرے گا کیا ترا کحل الجواہر اے کحال
نہیں یہ آنکھ ہی دیدارِ یار کے لائق

مکانِ عاریتی اور لباسِ بوسیدہ
بہت ہے زندگیِ مستعار کے لائق

غرور و حرص ہیں زیور عروس دنیا کے
بناؤ تھے یہی اس نابکار کے لائق

کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز
رہا نہ باغ قدومِ بہار کے لائق

بس اب ہے فضلۂ روباہ و گرگ پر گزراں
رہا نہ شیر ژیاں خود شکار کے لائق

گنہہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے
ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لائق

گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے **حالی**
تمھی تو شہر میں ہو اعتبار کے لائق

یہ ہم نے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ
مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لائق

۵۳

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں
جہاں ہے راہ زنِ خلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر
بنا ہے غوثِ زماں آج کل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی، اے شیخ! پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے اُمید ہے اُس وقت
کہ یار یار سے ہو جائے گا جدا ایک ایک

چھپا کے اُس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے
جب آپ منہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اس کی بندگی کا ادا
کیا ہے جس نے حقِ خواجگی ادا ایک ایک

امیر حاج کی ہمت میں گر نہ آئے قصور
تو موجِ بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ
جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا ایک ایک

وہ عشق ہے نہ جوانی، وہ تُو ہے اب، نہ وہ ہم
یہ دل پہ نقش ہے اب تک تری ادا ایک ایک

نہ ہم رہیں گے نہ **حالی**، یہ دل خراش جہاں
رہے گی **حالی** دلگیر کی صدا ایک ایک

۵۴

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلایشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں، سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو
ہے عشیرہ اور اُن کا دودماں سب سے الگ

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور اُن کا رازداں سب سے الگ

جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں
رکھتے ہیں اپنا طریق امتحاں سب سے الگ

اک چمن بھر تفرج رکھتے ہیں زیر بغل
روضہ و بستان و فردوس و جناں سب سے الگ

کلبۂ احزاں ہے روشن اُن کا جس مہتاب سے
ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ

سیکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل ان کا تو واں سب سے الگ

شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے **حالی** نے دکاں سب سے الگ

۵۵

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

عہدِ گیتی پر نہ پھولیں کامراں
آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ

علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

روکیے بدخو کو بد خوئی سے کیوں
آپ اپنی خو سے آ جائے گا تنگ

زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ
یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ

پاک بازوں کو نہیں کچھ قید وضع
جو ہیں اچھے ان پہ سب کھلتے ہیں رنگ

کام کا شاید زمانہ ہو چکا
دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی اُمنگ

وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل
دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ

عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ
ہے ابھی کم[1] حاصل افیون و بنگ

بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت
ہو گی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ

قوم کو **حالی** نہیں راس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

۵٦

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل
یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل

رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثار سلف
اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل

اک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں
ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل

کب تک آخر ٹھہر سکتا ہے وہ گھر
آ گیا بنیاد میں جس کی خلل

---

۱ - دیوان حالی، طبع سوم (صفحہ ۸۰) اور متداول نسخوں میں
"کم" کی جگہ "کچھ" لکھا ہے - (مرتب)

ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار
تیری حد بھی ہے کچھ اے طول امل

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی
لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

دیکھیے نبھتا ہے کب تک پاس وضع
ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل

کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں
وقت کوشش کا گیا شاید نکل

اب سنو **حالی** کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

۵۷

مدرسے میں دہر کے رو بر قفا بیٹھے تھے ہم
اٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ
زال دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم

صحبتیں اہل ورع کی سب گئیں نظروں سے گر
بزم رنداں میں یونہی اک روز جا بیٹھے تھے ہم

شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکا دور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم

ہم نہ تھے آگاہ زاہد زشت خوئی سے تری
آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم

ہم سے خود دنیا ہی پتیائی نہ **حالی** ورنہ یاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

۵۸

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوف خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پر گنہہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم

دل میں درد عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی
جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا ان دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اک جہاں سے آپ کو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
اپنے میں گر شمۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم

بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانے کو سدا
گر کبھی توفیق ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر
دردِ خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھہرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے
حال نفس دوں کا اتنا ہی برا پاتے ہیں ہم

جس قدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے
کبر و ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم
گو بھلائی کر کے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہے جی
تہ نشیں اس میں مگر دُردِ ریا پاتے ہیں ہم
ہے ردائے نیک نامی دوش پر اپنے، مگر
داغ رسوائی کے کچھ زیر ردا پاتے ہیں ہم
راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھیے کیا ڈھونڈتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم
نور کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے **حالی** مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں کا نیا پاتے ہیں ہم

۵۹

یاروں کو تجھ سے **حالی** اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشم تر تو مانوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
غیبت ہو یا حضوری دونوں بری ہیں تیری
جب بد گمانیاں تھیں اب بد زبانیاں ہیں
کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
رحمت تری غذا ہے، غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں جتنی تیری جانِ جہانیاں ہیں
ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر، ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش
حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے **حالی** لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں‌فشانیاں ہیں یا گل‌فشانیاں ہیں

٦٠

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یاں ڈھونڈتے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں

چل کے نئی اک چال فلک نے کھو دیے ہوش حریفوں کے
زد سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس انہیں گر اپنا ذرا ہو جاں اپنی بھی ان پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

دادطلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

یاں تو بدولت زہد و ورع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا پر کل کے لیے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سُر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب **حالی** یاں سمجھو تم مہمان ہمیں

٦١

کی تو ہیں ہم نے بھی **حالی** کوچ کی تیاریاں
سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

خواب راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار
ناگوار ان سے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی
سب کو کرنی ہوں گی پوری اپنی اپنی باریاں

زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال
اتنی بھی اے عاقلو! اچھی نہیں ہشیاریاں

بے مزہ ہے اہل دیں کی ترش روئی بھی مگر
اُس سے پھیکی اہل دنیا کی ہیں ظاہرداریاں

گو طبیعت سے گئے سب مادّے فاسد نکل
کم ہوئیں **حالی** نہ لیکن نفس کی بیماریاں

٦٢

رازِ دل کی سر بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جتنی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

جرم خالق سے سوا پاتے ہیں جرم فقہا
جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں

کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ
بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں

زہد و طاعت کا سہارا نہیں جب سے زاہد
یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب، ہنر دکھلاؤ
ورنہ یاں عیب تو سب فرد بشر کرتے ہیں

غمزدو! رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی جس میں کہ گھر کرتے ہیں

جی رکاوٹ سے جو ان کی کبھی رک جاتا
اک لگاوٹ میں ادھر سے وہ آدھر کرتے ہیں

اک یہاں جینے سے بیزار ہمی ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں

قیصر و زار کا یاں پیٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی گزر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ **حالی**
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں[۱]

۶۳

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اس میں

کی نصیحت بری طرح ناصح
اور اک بِس ملا دیا بِس میں

ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشم انسان و چشم نرگس میں

بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اس میں

نہ ہو قبضے میں جب عنان فرس
ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں

جس سے نفرت ہے اہل نعمت کو
وہی نعمت ہے چشم مفلس میں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

---

۱ - مولانا حالی نے بہ زمانۂ ملازمت اینگلو عربک ہائی سکول دہلی، ۱۸۸۰ع کے موسم گرما کی تعطیل میں علی گڑھ، اٹاوہ، کان پور، مین پوری، الور وغیرہ کا سفر کیا تھا۔ رمضان کا مہینہ سفر میں گزارا۔ (حالی کا ذہنی ارتقا۔ صفحہ ۷۵) مقطعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل اسی سفر کے دوران میں کہی گئی۔ (مرتب)

آج کل چرخ صلح جو ہے بہت
دیکھیے ہو بگاڑ کس کس میں
کی ہے خلوت پسند **حالی** نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

۶۴

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
ہیں مے ناب کے دلّال قدح خوار نہیں
شہر میں ان کے نہیں جنس وفا کی بکری
بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں
کون سے وہ گل رعنا پہ نواسنج نہیں
کون سی نرگس شہلا کے وہ بیمار نہیں
کبھی لیلٰی پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا
اور جو پھر دیکھو تو دونوں سے سروکار نہیں
اٹھ نہیں سکتی سزا جرم وفا کی ان سے
دل پھنسا کر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں
عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ
اور جو ہو کیل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں
نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا ان کو
در بدر جھانکتے پھرنے سے انھیں عار نہیں
بوالہوس ، کام طلب ، بندۂ نفس ، اہل ہوا
ایک عالم ہے اسی رنگ میں ، دو چار نہیں
دعوی عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے ، کردار نہیں
کہے **حالی** بھی اگر عاشق صادق ہوں میں
کہہ دو واللہ کہ صادق نہیں زنہار نہیں

٦٥

پھونکا ہے فصل گل نے صور آ کے پھر چمن میں
اک حشر سا بپا ہے مرغان نغمہ زن میں

بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے
بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں

باد صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا
پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

چپ ہے زبان سوسن حیراں ہے چشم نرگس
قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

ہیں اور تو ادائیں ساری سہی قدوں کی
پڑتی ہے جان باقی بس سرو و نارون میں

ہے عید اہل اسلام یا موسم بہاراں
جنگل بسا ہوا ہے سب عطر یاسمن میں

منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نام اسلام
بارود بجھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

پھر زخم پھوٹ نکلا **حالی** نہ چھیڑنا تھا
فصل خزاں کا قصہ ذکر گل و سمن میں

گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدر انجمن تھی
تم نے سنا بھی اس پر کیا گزری انجمن میں ؟

پائین بزم بھی اب ملتی نہیں اسے جا
روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

روبہ کی جون[1] میں ہے مرعوب اب وہ ملت
تھی سہم ناک کل تک جو شیر کے برن میں
وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمن[2] کی
ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں
وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے
ہے کال موتیوں کا اب سربسر عدن میں
قبر اویس پر ہے بس فخر اب قرن کو
زندہ اویس کوئی باقی نہیں قرن میں
اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑا دی
فصل بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں
ڈالی نہ ہوگی آگے اے دور چرخ شاید
جو اب کے تو نے ہلچل ڈالی ہے انجمن میں
فوج اور بہیر[3] دونوں پھرتی ہیں بے سری سی
گویا امیر لشکر مارا گیا ہے رن میں
خرد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا
لٹنے کی قافلے کے پہنچی خبر وطن میں
بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب
جائیں کدھر کہ ہر سو دوں لگ رہی ہے بن میں
حالی بس اب نہیں یاں سننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

---

۱ - جون ہندی میں جنم ، پیدائش یا جسم و قالب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے - برن (اصلاً ورن) بھی ذات اور فرقہ کے علاوہ بھیس اور قالب کے معنی میں آتا ہے - (مرتب)

۲ - یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ ''الایمان یمان والحکمۃ یمانیۃ'' یعنی ایمان ہے تو یمن کا ہے اور حکمت ہے تو یمن کی ہے -

۳ - بہیر : خدمت گاروں اور مزدوروں کا لشکر -

نوک زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

٦٦

وحشت میں تھا خیال گل و یاسمن کہاں
لائی ہے بوے آنس نسیم چمن کہاں
ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوق دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں
اہل طریق جس کو سمجھتے ہیں زاد راہ
واں دخل دست‌برد کو اے راہ زن کہاں
فصل خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں
مرغ چمن کو فرصت سیر چمن کہاں
لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرف آشنا
لے جائے ہم کو دیکھیے ذوق سخن کہاں
جی ڈھونڈھتا ہے بزم طرب میں انھیں، مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
دل ہو گیا ہے لذت غربت سے آشنا
اب ہم کہاں ہواے نشاط وطن کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں
روکا بہت کل آپ کو **حالی** نے واں مگر
جاتا ہے محو شوق کا دیوانہ پن کہاں

٦٧

حکم ہے پیر مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ
خیر کفارۂ عصیاں ہے پیؤ اور پلاؤ

دل کو کس طرح سمجھیے کہ وہی ہے یہ دل
وہ امیدیں ہیں نہ ارماں، وہ امنگیں ہیں نہ چاؤ

یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر
تو تو اچھا ہے مگر تیرے برے ہیں برتاؤ

دوست ہوں جس کے ہزاروں وہ کسی کا نہیں دوست
سچ بتا تجھ کو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ

تو وہی برق جہاں سوز ہے بن خواہ نہ بن
ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ

ایک ہی دوست اور اس سے ہمیں چھٹواتے ہو
ناصحو! اب تمھیں دشمن کہیں یا دوست، بتاؤ

ہو گیا ذکر قیامت تو اجیرن واعظ!
باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ

تجھ کو اے ابر بلا دیکھ کے جی چھوٹ گیا
ایک ہی بار تم اے بادلو! اس طرح نہ چھاؤ

پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا
ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ

دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشت امید
آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ

اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک
آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ

قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ **حالی** کو نہ محفل میں بلاؤ

٦٨

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ

ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں، دیتے ہیں تب کچھ

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

یہ طبلِ تہی ہیں جو بنکارتے ہیں
جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

دیا تو نے یاں جس بہانے سے چاہا
ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی خسّت سے واعظ
وہ گرمائے گا، یہ پسیجیں گے جب کچھ

تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو! تم پہ الزام اب کچھ

یہ ہے میر مجلس کہ چینی کی مورت
ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمۂ چرب تاکا ہے شاید
یہ **حالی** کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

٦٩

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو! پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتسابِ شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

یہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا
مبادا کہ ثابت ہو خسّت زیادہ

پھر اوروں کی تکتے پھرو گے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن
جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا
جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ

نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے
خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ

ہے اُلفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم
پہ اُلفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ
غزل میں وہ رنگت نہیں تیری **حالی**
الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ

۷۰

ہے اُن کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی
وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ ان کی مہربانی
بے جرم کوئی آخر کب تک سنے ملامت
ناصح سے ہم کو اپنی کہنی پڑی کہانی
عاشق کے دل کو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے
دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی
امید وصل سے ہے کچھ جی چھڑائے دیتا
جو کچھ سنا ہے ہم نے مشّاطہ کی زبانی
ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی
صبر و سکوں سے ہم کو یہ بھی نبیڑنے دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہشِ نہانی
پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویران
ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے
کیا جانے کس ادا سے کی اُس نے دل‌ستانی
اک نکتے کے بیاں سے سربر نہ ہوگے **حالی**
چلتا نہیں کسی کا یاں لافِ نکتہ‌رانی[1]

۷۱

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گر مے نہیں، دے زہر ہی کا جام بلا سے
جو کچھ ہے سو ہے اُس کے تغافل کی شکایت
قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے
دلالہ نے اُمید دلائی تو ہے لیکن
دیتے نہیں کچھ دل کو تسلی یہ دلاسے
ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہہ خوباں
یاں ہیں تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے
پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں
ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آبِ بقا سے
درگزرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے
درگزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے
اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو
تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے
حالی دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین
شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے
جب وقت پڑے دیجیے دستک درِ دل پر
جھکیے فقرا سے نہ جھجکیے امرا سے

۱۔ مطابق طبع اول و نسخۂ الناظر۔ بعض نسخوں میں "نکتہ دانی" چھپا ہے۔

۷۲

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتادے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردش دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے، بدخشان و ختن کس کا ہے

دم سے یوسفؑ کے جب آباد تھا یعقوبؑ کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیت حزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذات خدا
ورنہ بے عیب زمانے میں چلن کس کا ہے

آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق
عزم تسخیر پھر اے شیخ زمن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے

عشق ادھر عقل ادھر دھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھیے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مرغ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و **حالی** دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

۷۳

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سپاہ و میر سپہہ باغ باغ ہیں لیکن
بہیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب
کہا زمانے کی عادت بدلتی جاتی ہے

قلق انھیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیے خلجان بے نوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بار امانت سے تیرے سب عاجز
زمیں بھی اپنے خزانے اگلتی جاتی ہے

اڑے گی خاک تقدس کی اب سر بازار
فقیہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ **حالی**
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

۷۴

بری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی

ملے گا نہ گل چیں کو گل کا پتا
ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی

رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی

ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر
یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی

بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ
یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی

نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں
یونہی عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ **حالی** کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

۷۵

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاق
کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی ، لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاق
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گلچیں! یا ہے قزاقی
کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی
رہی دانائی آخر غالب آکر پہلوانی پر
گئے چیں مان سب چینی و فرغانی و قبچاقی
ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ
لنڈھائے خم پہ خم غیروں پہ کیوں ممسک ہو گر ساقی
مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے **حالی**
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

۷۶

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی
اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز
اس میں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی
اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے
گھات میں ان کی[1] لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی

دوست گر بھائی نہ ہو دوست ہے تو بھی، لیکن
بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

اے غمِ دوست تجھی پر نہیں اپنی گزران
کچھ فتوح اس کے سوا اور ہے بالائی بھی

دل غنی رکھتے ہیں اے دولت دنیا جو لوگ
تیور ان کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

عقل ہے اپنی حماقت کے چھپانے کی انھیں
جن میں کچھ ساتھ حماقت کے ہے خود رائی بھی

عقل اور حسن پہ جن کے بھری مجلس ہو گواہ
ان کو خودرائی بھی پھبتی ہے خودآرائی بھی

ملنے دے گی نہ اجل تم سے ہمیں جی بھر کر
فرصت اے دوستو! دنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم، پہ رہے مُردوں سے بدتر[2] **حالی**
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

۷۷

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی
بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

برائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن
کہاں یہ برائی کہاں وہ برائی

---

۱ - "اُن کے"۔ دیوان حالی، طبع سوم، صفحہ ۹۷ - (مرتب)
۲ - اپنے دائم المرض ہونے کی طرف اشارہ ہے - (حالی)

گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب
عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی
رکا ہاتھ جب بن گئے پارسا تم
نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی
بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے
سوا اس کے منعم میں ہے کیا بڑائی
جو کہیے تو جھوٹی جو سنیے تو سچی
خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی
ہوئی آ کے پیری میں قدر جوانی
سمجھ ہم کو آئی پہ ناوقت آئی
وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت
وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی
جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح
جو واں دل پہ لی تھی تو یاں منہ کی کھائی
قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو **حالی**
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

۷۸

وصل کا اس کے دل زار تمنائی ہے
نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
قطع امید نے دل کر دیے یک سو، صد شکر
شکل مدت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے
قوتِ دستِ خدائی ہے شکیبائی میں
وقت جب آ کے پڑا ہے یہی کام آئی ہے
ڈر نہیں غیر کا جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے
ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے

نشے میں چور نہ ہوں، جھانجھ[1] میں مخمور نہ ہوں
پند یہ پیر خرابات نے فرمائی ہے

نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی
بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی
سچ میں **حالی** کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

۷۹

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دوچار
آئے اس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے

چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن، خدا کی شان ہے

تجھ میں جوت اے شمع ہے کس برق عالم سوز کی
جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں **حالی** کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

۸۰

تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایمان باقی
رہ گیا کیا ہے اب اے گبر و مسلماں باقی

---

۱ - جھانجھ: غصہ، تندی و تیزی، جھنجھلاہٹ۔

بزم دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اس وقت
میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی

حق ادا اک نگہ لطف کا ہوگا کیوں کر
دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی

ظاہرا درد ہی الفت کا نہیں چارہ پذیر
ورنہ چھوڑا نہیں ہم نے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے **حالی** نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی

۸۱

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تف کیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے

واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار
اس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجیے

ضبط کیجے درد دل تو ضبط کی طاقت نہیں
اور کھلا جاتا ہے راز دل اگر اُف کیجیے

دوست کے تیور ہیں ہم ہر رنگ میں پہچانتے
بے تکلف ملیے ہم سے یا تکلف کیجیے

جب کہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول
شیخ لگتے ہاتھ اس پر بھی تصرف کیجیے

وقت تھا جو کام کا **حالی** گنوا بیٹھے اسے
جائیے اب عمر بھر بیٹھے تاسف کیجیے

توبہ حضرت کی یونہی اک دودھ کا سا ہے ابال
ہم دکھا دیں گے ذرا دم بھر توقف کیجیے

۸۲

فکر فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جان کو ہم نے لگا لی ہے یہ علت کیسی

جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیم خزاں
جن کی قسمت میں ہو کلفت انہیں راحت کیسی

جی کا الفت کو سمجھتے تھے ہم اک بہلاوا
وہ تو آفت تھی ہمارے لیے الفت کیسی

جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع نادار
قید ہستی میں مری جان فراغت کیسی

عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ
جن کو کچھ کام نہیں یاں، انہیں فرصت کیسی

جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا
وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی

جانتا ہے وہی دل پر ہے گزرتی جس کے
ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیسی

ہم نے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک
ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی

جب کہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح
وحی بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے **حالی** انجام
یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

۸۳

سعی سے بہتر تن آسانی مری کفر سے بدتر مسلمانی مری
تھا نہ محتاج سبب عفو کریم کچھ نہ کام آئی پشیمانی مری
خلد میں بھی گر رہی یاد اسکی زلف کم نہ ہو شاید پریشانی مری

ہے لباس جسم تک مجھ پر گراں	دور جا پہنچی ہے عریانی مری
مانع گلگشت ہے بیم خزاں	موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدر نعمت ہے بقدر انتظار	حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری
خندہ زن ہے اس مسلمانی پہ کفر
جیسی ہے **حالی** مسلمانی مری

۸۴

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا کیے اور مہرباں رہے
کیا کیا ہیں دل میں دیکھیے ارماں بھرے ہوئے
ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید
اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاس وضع کی
اتنے ہی ہم سُبک ہوئے جتنے گراں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے
نرخ متاع عشق، الٰہی گراں رہے
حالی سے مل کے ہو گے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اس میں کہاں رہے

۸۵

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہل وعظ
یا آپ بھی ملازم پیر مغاں رہے
وصل مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آب خضر میں اور نیم جاں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
حالی کے بعد کوئی نہ ہم درد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

۸۶

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
افسوں شب وصال کے واں کارگر نہیں
نالے شب فراق کے تاثیر کر چکے
اے دل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحان برش شمشیر کر چکے
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کرچکے
بھولے رہے تصور مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے
جاں لب تک انتظار میں آتی ہے بار بار
مشاطہ جلدتر کہیں تقریر کر چکے
دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے
حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

غزلیات دور آخر
(۱۸۹۳ع تا ۱۹۱۴ع)

۱

کہاں فکر میں اب وہ جولانیاں
وہ دریاے معنی کی طغیانیاں
کہاں وہ طبیعت کی رنگینیاں
وہ بزم سخن میں گل‌افشانیاں
کہاں اب وہ جلسوں میں احباب کے
سخن سنجیاں اور سخن رانیاں
دکھائی جونہی دور گردوں نے آنکھ
گئے بھول ساری غزل خوانیاں
جھکے بن زمانے سے بنتی نہیں
رگڑنی ہیں یاں سب کو پیشانیاں
لگے بڑھنے جیسے کہ ہوش و خرد
لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی
بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں
اگر راست گوئی کی جرأت نہیں
تو جھوٹی ہیں• واعظ کی لسانیاں
منادی نہیں حق کی کچھ دل لگی
بہت یاں ہیں درکار قربانیاں
گئے جھیل چپ چاپ گر مشکلیں
یہی مشکلیں پھر ہیں آسانیاں

ہو ناپید جو ملک میں اتفاق
ہیں آبادیاں واں کی ویرانیاں

بھریں خرقہ پوش اب کوئی اور روپ
یہ شکلیں تو ہیں جانی پہچانیاں

وہی لے گئے یاں سے زاد سفر
گئے جھاڑ جو اپنی ہمیانیاں

لگاؤ نہ اس دار فانی سے دل
عیاں اس کی ہیں سست پیمانیاں

جو یاں آج ہے جوش عیش و نشاط
تو کل حسرتوں کی ہیں طغیانیاں

پھر آرام برسوں نہیں یاں نصیب
اگر چار دن ہیں تن آسانیاں

چمن ہے کہ ہے سیمیائی نمود
یہ کہتی ہیں نرگس کی حیرانیاں

گل آواز بلبل پہ ہیں ہنس رہے
کہ کے دن کی ہیں یہ خوش الحانیاں

متاع وفا کا ہے دنیا میں کال
مگر گاہکوں کی ہیں ارزانیاں

لگا دیتے ہیں اس کی قیمت میں جو
شہنشاہیاں اور سلطانیاں

کھلونوں پہ مرتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ
یہ داناؤں کی یاں ہیں نادانیاں

جھپٹتے ہیں مردار کی پا کے بو
یہ ہیں شیرمردوں کی جولانیاں

بنی نوع کے دوست کرتے ہیں آہ
بنی نوع پر آتش افشانیاں

کلیجے کے ٹکڑوں سے ہوتی ہیں یاں
سدا چیل کووں کی مہمانیاں

جہاں سوزیوں کا ہے گویا کہ نام
جہاں داریاں اور جہاں بانیاں

ڈبوتی ہیں آخر کو منجدھار میں
یہ فرعونیاں اور ہامانیاں

محبت کا دنیا کے حالی مآل
پشیمانیاں ہیں پشیمانیاں[1]

۲

نفس کی فرماں روائی ہو چکی
خود پسندی خود نمائی ہو چکی

اب ہیں پیری کی عبودیت کے دن
بس جوانی کی خدائی ہو چکی

گرم جوشی ، لطف صحبت ہو چکا
ناخوشی ، خفگی ، لڑائی ہو چکی

موت کی راحت فزائی کا ہے وقت
زندگی کی جاں گزائی ہو چکی

۱- یہ غزل ۱۹۰۰ء تک لکھی جا چکی تھی کیونکہ مولانا حالی نے اپریل ۱۹۰۰ء میں دیوان انور کے تبصرے میں اس غزل کا چھٹا اور ساتواں شعر نقل کیا ہے ۔ (بحوالہ حالی کا ذہنی ارتقا ، صفحہ ۲۷۲) ۔

قطرہ اب دریا میں مل جانے کو ہے
تیری میعاد اے جدائی ہو چکی

جلتے ہیں جبریل کے شہپر جہاں
بے پروں کی واں رسائی ہو چکی

دیکھنا ہے تجھ کو اب اے جذب عشق
عقل کی زور آزمائی ہو چکی

قید خانے میں گیا دل جن کا لگ
اُن اسیروں کی رہائی ہو چکی

دیر میں بھی لیجیے قسمت آزما
مسجدوں میں جبہہ سائی ہو چکی

خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو
باپ دادا کی بڑائی ہو چکی

وقت ہے اے زاہد اب تشہیر[1] کا
شہرتِ زہدِ ریائی ہو چکی

ہے چڑھائی علم کی مذہب پہ اب
شرک و بدعت کی چڑھائی ہو چکی

فلسفے سے اس کی اب مُٹ بھیڑ ہے
سفسطے[2] سے ہاتھا پائی ہو چکی

رہ گئی ہے مذہب و ملت کی جنگ
ملک و دولت کی لڑائی ہو چکی

ہو نہ مذہب کی صفائی جب تلک
اہل مذہب کی صفائی ہو چکی

---

۱ - جواہرات حالی (صفحہ ۸۳) میں ''تشہیر'' درج ہے - ظاہر ہے کہ تشہیر سے یہاں مراد رسوائی ہے - (مرتب)

۲ - سفسطہ : استدلال و قیاس جس کی بنیاد مغالطے پر ہو -

اب نہیں سننے کا اے **حالی** دماغ
بس بہت ہذیاں سرائی ہو چکی

۳

مستیِ جہل میں غفلت کا نشا اور سہی
شبِ تاریک میں گھنگھور گھٹا اور سہی
دوستو! روگ بظاہر نہیں جانے والا
ہوچکیں ختم دوائیں تو دعا اور سہی
کم نہ تھے روگ جوانی میں بھی کچھ اے پیری
رعشہ اب اور سہی لغزشِ پا اور سہی
گر گنہ عفو کی امید پہ کرنا ہے خطا
ہیں جہاں لاکھ گنہ ایک خطا اور سہی
شہ کو ہے خوف عدو، خوف اجل، خوف زوال
کہہ دو اے بے خبر! کہ خوف خدا اور سہی
بے وفا کون سی خوبی ہے، نہیں جو تجھ میں
وصف اتنے ہیں جہاں ایک وفا اور سہی
ترک دنیا کے علائق تو کیے سب زاہد
گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی
تیرے انفاس نے مردوں کو کیا ہے زندہ
ایک جھونکا ادھر اے بادِ صبا! اور سہی
مدرسے میں نہ ملا کچھ تو نہ توڑ آس اے دل
اک درِ دولتِ ساقی پہ صدا اور سہی
تم تو **حالی** یہی طرز اپنی نباہے جاؤ
طرز شعر فصحا و بلغا اور سہی

۴

نہ عیش کیخسروی رہے گا نہ صولت بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو! تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی

ہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گے تارے تم آسماں کے
کسی کی آگے بنی رہی ہے ، نہ اب تمھاری بنی رہے گی

گرایا تورانیوں کو تو نے ، پچھاڑا مازندرانیوں کو
کہاں تلک اے شراب غفلت یہ تیری مردافگی رہے گی

رہے گی کس طرح راہ ایمن ، کہ رہ نما بن گئے ہیں رہ زن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہ زنی رہے گی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی ، دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

کرے گی کچھ عقل رہ نمائی ، نہ علم سے ہوگی کچھ صفائی
گناہ کی گندگی میں دنیا یونہی ہمیشہ سنی رہے گی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے، نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
رہو گے گر حسن ظن کے طالب تو تم سے یاں بدظنی رہے گی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت ان کی غنی رہے گی[۱]

---

۱ - یہ غزل ۱۹۰۴ء تک لکھی جا چکی تھی - حالی نے ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء کے خط میں (مکتوبات حالی ، صفحہ ۲۲) مولوی عبدالرحیم خاں بیدل کو اس غزل کی ایک نقل بھیجی تھی - مذکورہ خط میں لکھتے ہیں : '' فصیح الملک (داغ) کی ایک غزل کبھی دیکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے :

کب تک کھنچے رہو گے کب تک تنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

مگر جب فکر کرنے لگا تو اس کی بحر یاد نہ رہی - آپ کے مشغلے کے لیے غزل مذکور ارسال خدمت کرتا ہوں...'' (بحوالہ حالی کا 'ذہنی ارتقا' صفحہ ۲۰۶) -

۵

کہنے کی بات ہو تو اسے کہہ سنائیے
جو دل پہ بن رہی ہے وہ کیوں کر دکھائیے

دنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوائیے
یاں کھوئیے بہت سا تو کچھ جا کے پائیے

یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبے میں مقام
ہو رہیے بس وہیں کے جہاں دل لگائیے

گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو
ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بیزار، جائیے

اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا
بس آ گیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھائیے

بھر پائے بس زمانے سے جو مانگتے تھے حق
فارغ خطی ہم اپنی ابھی لکھ دیں، لائیے

مشکل ہے پاک ہونا اگر دل نہیں ہے پاک
زمزم میں غسل کیجیے کہ گنگا نہائیے

پھرتا ہو جو کہ کودتا غیروں کی آگ میں
خیر اس اجل گرفتہ کی کب تک منائیے

ہوتی ہجوم غم میں ہے کیوں زہر کی تلاش
حالی بتائیں آپ کو گر کچھ کھلائیے

۶

وصف چمن قفس میں سنو عندلیب سے
پوچھو وطن کی قدر مسافر غریب سے

نالوں سے ایک دم نہیں مسکیں کو قرار
کیا کہہ گئی چمن میں صبا عندلیب سے

لاگ اور لگاؤ ساتھ گئے سب شباب کے
نفرت رقیب سے نہ اب اُلفت حبیب سے

اب دل سے دور رکھو خیال نشاط عمر
آواز دے رہا ہے یہ کوئی قریب سے

شادی ہے ایک کی وہی جو دوسرے کا غم
دنیا کے بھی ہیں شادی و غم کچھ عجیب سے

دوں بڑھنے درد دل کو مروں اس میں یا جیوں
پانڈے[1] سے لوں صلاح نہ پوچھوں طبیب سے

کہتا ہوں، دیکھتا ہوں جسے خوار و بے وقار[2]
ہے کوئی خاندان شریف و نجیب سے

طالب میں صدق ہے نہ عقیدت مرید میں
ہیں آج کل کے پیر بھی کچھ بد نصیب سے

پڑھیے وہ خطبہ جس میں کہ صدق و صفا نہ ہو
کہہ دو یہ جا کے برسر منبر خطیب سے

فاقے میں تم کو دیکھ کے جاتی ہے بھوک بھاگ
پہنچا ہے نسخہ آپ کو یہ کس طبیب سے

اب جس کے جی میں آئے بھرے شاعری کا دم
میدان آج کل ہے یہ خالی نصیب سے

نعم البدل ہے داغ کا، حالی، کلام داغ
ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے[3]

---

۱ - برہمنوں کی ایک اونچی ذات، عالم فاضل - یہاں آیور ویدی معالج مراد ہے - (مرتب)

۲ - جواہرات حالی (صفحہ ۸۷) میں "خوار و بے وفا" درج ہے - ازروے قیاس یہاں بے وفا کی جگہ "بے وقار" ہونا چاہیے - (مرتب)

۳ - یہ غزل داغ کی وفات (۱۷ فروری ۱۹۰۵ع) کے بعد کہی گئی -

۷

تیر پیہم لگائے جاتا ہے
نظروں نظروں میں کھائے جاتا ہے

دیکھیے اور کیا دکھائے فلک
ابھی آنکھیں دکھائے جاتا ہے

دوستوں[1] کو رلا چکا لیکن
دشمنوں کو ہنسائے جاتا ہے

ہو چکی قوم مردہ ، پر جلاد
ابھی دُرّے لگائے جاتا ہے

گو کہ حالی میں دم نہیں باقی
ڈور اپنی ہلائے جاتا ہے

گو نہیں آس خیر کی لیکن
خیر سب کی منائے جاتا ہے

اب سنے اس میں' کوئی یا نہ سنے
وہی راگ اپنا گائے جاتا ہے

★

---

۱ - یہ مصرع تمام نسخوں میں اسی طرح درج ہے - ایسے موقعوں پر ''اس میں'' محاورۃً بولا جاتا ہے لیکن یہاں ''اس کی'' زیادہ مناسب ہوگا - (مرتب)

فصل دوم

قطعات و رباعیات

قطعات

★

(ا) تنقیدی

---

۱ - شعر کی طرف خطاب

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ سازباز تو
نا ک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان ان کو جو ہے چارہ ساز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر عَلَمِ امتیاز تو

جو نابلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا، تو لے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے، اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر، پہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو
جو قدرداں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

۲ - مشاعرے کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف
طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ
سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو، ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیے درد جدائی کی کبھی نقّالی
تا کہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی[1]

۳ - نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں
جس طرح بن آئے بیٹا! نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعیِ بلیغ
اس میں ایک اپنا پسینہ اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا
اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

۴ - بے تمیزیِ ابنائے زماں

از رہِ فخر آبگینے سے یہ ہیرے نے کہا
ہے وجود اے مبتذل! تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا
امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم

---

۱ - بازاری عورت جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو دلالی کا پیشہ اختیار کرتی ہے -

مسکرا کر آبگینے نے یہ ہیرے سے کہا
گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم!
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز
ہیں مبصر ایسے اس بازارِ ناپرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑ رہتے ہیں ہم

۵ - چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط اک دانا نے　　کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھو لو ان میں جتنے ہیں خط　　کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی جو بے ہاتھ لگائے　　دے یونہی چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے جتنے خط تھے بڑے　　اٹھ کے دیا ایک ایک کو مٹا
جب نہ رہا واں پیش نظر　　خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھا اُٹھا کر آنکھ جدھر　　تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہے یارو بات کہ تھی　　قوم میں باقی جان ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اب　　آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں　　اخطل و اعشیٰ[1] کے ہمتا
منشیوں میں ایسے تھے بہت　　جن پہ کہ نازاں تھی انشا
شعر میں تھے استاد اکثر　　سحر بیاں اور نکتہ سرا
لے گئی ان کو آخر کار　　بحر فنا کی موج بہا
اہل ہنر کا نام و نشاں　　قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زید و عمرو بنے　　صاحبِ دیواں نام خدا
اب چاہو استاد گنو　　یا ہمیں سمجھو تم یکتا
ہم ہیں وہی ناچیز مگر　　کَبَّرَنَا مَوْتُ الْکُبَرَا[2]

---

۱ - دو مشہور عرب شاعروں کے نام -
۲ - بڑے لوگوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا -

۶ - دلی کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالی کے کہا از رہ انصاف
کرتے ہیں پسند اہل زباں اس کے سخن کو

چند اہل زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا
بولے کہ نہیں جانتے تم شعر کے فن کو

شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہل زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیر زباں اس کے دہن کو

معلوم ہے حالی کا جو ہے مولد و منشا
اردو سے بھلا واسطہ حضرت کے وطن کو

اردو کے دھنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑے
پنجاب کو مس اس سے نہ پورب نہ دکن کو

بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے
کیا عالم گلشن کی خبر زاغ و زغن کو

حالی کی زباں گر بہ مثل نہر لبن ہو
خالص نہ ہو تو کیجیے کیا لے کے لبن کو

ہرچند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
پہنچے گا نہ وہ نافۂ آہوے ختن کو

مانا کہ ہے بے ساختہ پن اس کے بیاں میں
کیا پھونکیے اس ساختہ بے ساختہ پن کو

یہ دوست نے حالی کے سنی جب کہ تعلّی
حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو

کچھ شعر تھے یاد ان کے، پڑھے اور یہ پوچھا
کیوں صاحبو! عزت اسی اردو سے ہے فن کو؟

سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے
کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو[1]

۷ - شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہے رائے
چاہیے گر رونقِ عالمِ زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجے رکن
جن پہ اس کی سب رکانیں[2] ہیں عیاں
رائے صائب ہے بظاہر اور متیں
گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ
ہے بہت کم برخلاف اس کے گماں
سلطنت کا پر خدا حافظ ہے جب
شاعروں کے ہاتھ ہو اس کی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے
شعر و انشا کو بھی ہے خوف زیاں

---

۱ - شیخ محمد اسماعیل صاحب کا بیان ہے کہ مولانا حالی نے کلیات نظم اردو مرتب کرنے کے خیال سے دیوان پر بھی نظر ثانی کی اور یہ شعر کاٹ کر اس کی جگہ حسب ذیل شعر لکھا:

ہو بولی ٹھٹھولی کا جہاں نام فصاحت
واں کون لگا ماننے حالی کے سخن کو

(جواہرات حالی ، صفحہ ۱۰۴)

۲ - ''رکان'' ہندی لفظ ہے بہ معنی قاعدہ ، قانون ، طور ، طریقہ۔
بحوالہ : A Dictionary of Urdu ... by John T. Platts
(Oxford University Press, 1960) Page 596

ایک پر ان میں سے چل سکتا نہیں
دوسرے کا جادوے حسنِ بیان

ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی
پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

★★★

(ب) سیاسی

---

۸ - پولٹیکل اسپیچیں

اے بزمِ سفیرانِ دول کے سخن آرا
ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے

یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن
کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے

ظاہر ہے نہ غصے میں بیاں سے تری رنجش
نے لطف میں کچھ طرز بیاں اس سے جدا ہے

ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار
اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے

جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں
اور جنگ میں کچھ لطف سخن اس سے سوا ہے

گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں مفر کے
اور سنیے تو زنجیر سے ہر قول بندھا ہے

دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
گونگا نہیں، گویا نہیں، کیا جانیے کیا ہے

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں میں
اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

تھے لب پئے اظہار پہ اب آکے کھلا یہ
انسان کو اخفا کے لیے نطق ملا ہے

۹ - آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں
قدر داں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
''تعرف الاشیاء بالاضداد''[1] ہے قول حکم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سن کے اک آزاد نے یہ لاف، چپکے سے کہا
ہے سقر موری کے کیڑے کے لیے باغ ارم

۱۰ - انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آ کر، کرامت ہے یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جونہی رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی
قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

---

۱ - ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔

۱۱ - نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے
اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
کہ نیشن وہ جماعت ہے ، کم از کم
زباں جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہے
نہیں جو رائے میں اپنی مذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی
کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب
زباں اس کی نہ ہو مفہوم اس کو
ہوں آدم تک جدا سب کے جد و اب
جو واحد لا شریک اس کا خدا ہو
تو لاکھوں اس کے ہوں معبود اور رب

۱۲ - کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

دو ملازم ، ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل ، مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار

آخر ش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جان دار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

۱۳ - قانون

کہتے ہیں ہر فرد انساں پر ہے فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا
اس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا!
پر اسے دیتے ہیں توڑ ایک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کمزوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زورمندوں کی ہے لا[۱]

---

۱ - 'لا' عربی حرف نفی ، بمعنی ہیچ ہے - اور انگریزی میں (Law) بمعنی قانون ہے - مراد یہ ہے کہ بڑے لوگ قانون کو ''لا'' اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی نظروں میں وہ ہیچ ہے -

۱۴ - تدبیر قیام سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

۱۵ - قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہل ملک کو
گو کہ ان کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانے کا یہ راجس کے کبھی چاقو نہ لیں
اس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انھیں
ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا، قصہ مختصر
سن کے **حالی** نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبع بشر

مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاس قوم میں،
اچھے اچھے راست باز اور حق پرست اور دادگر
ہاں بری اس عیب سے لے دے کے اس دنیا میں ہے
چشمِ بد دور آمت مرحوم ، اے جان پدر
اور قوموں سے انھی لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ، کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہوگا خوف ایسانہ دشمن سے کسی دشمن کو بھی
جس قدر ہے ان سے اپنوں اور یگانوں کو خطر

★ ★ ★

(ج) معاشرتی و اصلاحی

---

۱۶ - بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانے میں یہ تھی رسمِ عرب
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اسے گود سے لے کر ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن
جو کہ اندھے ہیں ہیئے[۱] کے نہیں کچھ ان کو خبر
لوگ بیٹی کے لیے ڈھونڈھتے ہیں جب پیوند
سب سے اول انھیں ہوتا ہے یہ منظور نظر
ایسے گھر بیاہیے بیٹی کو جو ہو آسودہ
اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانے کے سارے زن و مرد
ان کو معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر

---

۱ - ہئی یا ہیا (سنسکرت ، ہندی) بمعنی دل ، روح ، باطن ، ہستی -
(A Dictionary of Urdu ... by J. T. Platts : بحوالہ)

ایک ہی شہر میں ہوں دونوں گھرانے آباد
دونوں نزدیک قرابت میں ہوں باہم دیگر
جیتے جی مر گئی بس ان کی طرف سے گویا
جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر
چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر
بد مزاجی ہو، جہالت ہو کہ ہو بدچلنی
کچھ برائی نہیں ذتونتا[1] ہو داماد اگر
وہ یہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر
جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر
اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

۱۷ - یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست
دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا
جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں وسوسے
ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا
تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست
جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا

---

۱ - اونچی ذات والا -

وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر
گو حاجت اس کی ان سے ہوئی ہے نہ ہو روا
آتا نہیں یقین میں اس کے کبھی قصور
امید اس کی روز فزوں ہے اور التجا
تو بندۂ غرض ہے، وہ راضی رضا پہ ہے
وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندۂ خدا

۱۸ - استفادہ

لیجیے بھیک دوڑ کر گر ہے گداگری کا یہ
جس سے ملے جہاں ملے، جو ملے، اور جب ملے
ہے یہی اصل اکتساب ہوجیے سب سے مستفید
زک ملے یا سزا ملے، درس ملے، ادب ملے

۱۹ - لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول اک حکیم کا ہے کہ گر غور کیجیے
ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
اول تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو
اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب
سو سو طرح سے وہ اسے کرتا ہے جلوہ گر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال
رکھتا ہے جو کہ دوست کے عیب اس سے مستتر
گو قول ہے متین پہ جو تھی سخن کی تہہ
افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ واں نظر

دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
عیب ان کے دوست کیوں نہ جتائیں گے بے حطر
اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور
جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت ان کی نہ دشمن نہ دوست پر

۲۰ - عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں
اپنے دعووں پہ بیاں کر کے دلیل و برہاں
کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی
درد ہیں تیرے اسی واسطے سب بے درماں
ہے غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
جس کا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں
سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز
تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں
نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
یہ بھی ہے نیند کوئی موت کا ہے جس پہ گماں
نہ جوانی میں تجھے صبر نہ پیری میں شکیب
کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں
کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو
دیکھ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں
ہاتھ دھو لذتِ فانی سے نہیں گر منظور
عیشِ باقی و حیاتِ ابدی سے حرماں
نفس نے عقل سے کی عرض کہ اے خضر طریق
وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجیے جاں

پر نہیں حکم ترا کوئی عمل کے قابل
گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیان

نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی آمید
کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز نادان

ہے یہ ایک ایک مری لذت فانی وہ بلا
سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جس پر قربان

ایک اب بھوک سے کہتا ہے کہ لے قاب طعام
ایک مدعو اسے کرتا ہے پس از سال رواں

کیوں کہ آمید پہ اک مائدۂ نعمت کی
سال بھر صبر کرے گرسنگی میں انساں

عقل نے سن کے کہا خوف ہے تجھ سے اے نفس
جزبزہ تیرا تجھے دیکھیے پہنچائے کہاں

حق کے پیرایے میں ہوتا نہیں باطل سرسبز
کیجیے لاکھ بیاں اس پہ دلیل و برہاں

جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر
زہر دانستہ کرے نوش، نہیں یہ امکاں

نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمۂ نقد
اس کے کھانے میں نہیں جان کی خیر اے ناداں!

۲۱ - عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جائے

ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھ سے الگ
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے

۲۲ - حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفس دوں ہمارے بس میں ہے
گر کبھی حملے پہ اس کے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اس کے ٹھہراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زور بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

۲۳ - جس قوم میں افلاس ہو اس میں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بہ خلاف آپ کے سب اگلے سخن ور
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کم تر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لیے ہے یہ بیاں موجبِ رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر
پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

۲۴ - برکت اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جن میں ملاپ
دولت و بخت ہے ہر حال میں ان کے ہمراہ
نہ انھیں حاجتِ اعوان، نہ تلاشِ انصار
نہ انھیں خوفِ بداندیش نہ بیمِ بدخواہ
پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یک‌جہتی
اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ
نہ ملاذ ان کے لیے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
نہ مفید ان کے لیے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک ملّا نے سنا جب یہ سخن فرمایا
تکیہ اور اس قدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
دستِ قدرت کے ہے سب ہاتھ سفید اور سیاہ
واں نہ ملت کی ضرورت ہے نہ کچھ پھوٹ کا ڈر
پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر
کر دیں افراد پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم
اس کو جب دیکھا ہے دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

۲۵ - بُعدِ صوری مانعِ قربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیے شہر میں اک گھر
جا اپنے محلے سے کہیں دور بنایا
جب اہلِ محلہ سے چلا ہو کے وہ رخصت
دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا

ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس
اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا

بلی کہ جو بے عقل ہے دم دیتی ہے گھر پر
اتنی بھی محبت تمھیں گھر سے نہیں آیا؟

حالی نے کہا انس ہے چیز اور، وفا اور
بلی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا

اس مہر و وفا کی نہیں بلی پہ پڑی چھینٹ
کتے نے ہے جس کا کہ سبق ہم کو پڑھایا

ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی
گھر بھول گئے ہم، تو نہیں تم کو بھلایا

گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

۲۶ - اُمرا اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خردمند
وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت

پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں
ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت

بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبا
بیمار کو کچھ اس سے سوا ان کی ہے حاجت

۲۷ - خوشامد کے معنے

خوشامد کرتے ہیں آ کے جو لوگ
تمھاری ہردم، اے اربابِ دولت!

خوشامد پر نہ ان کی بھولنا تم
وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت

کہ جو ہم نے بیاں کیں خصلتیں نیک
نہیں ان میں سے تم میں ایک خصلت

۲۸ - مغرور کی پہچان

غرور زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو
تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اظہار
جنھوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا
بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

۲۹ - کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیوں کر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

۳۰ - اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی
پر بھول چوک ہے بشریّت کا مقتضا
ہوتا ہے اس سے کار نمایاں کوئی اگر
کرتا ہے بار بار بیاں اس کو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیے
ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اک جدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اس کو یاد
یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد پہ انسان کو چاہیے
آخر بشر کا خاصّہ ہے سہو اور خطا

۳۱ - فضول خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف
جہاں سے ہو کے گزرتے تھے سب صغیر و کبیر

ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش
سخی ہو اس میں کہ ممسک، غریب ہو کہ امیر

فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولت مند
کہ جس کا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر

ہوا جو ایک دن اس راہ سے گزر اِس کا
دُرم اک اس نے بھی چاہا کہ کیجے نذر فقیر

کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت
کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر

پہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار
کہ دوت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پزیر

یہی اللّے تلّلے رہے تو آپ کو بھی
ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر

سو وقت ہے یہی لینے کا خود بدولت سے
دکھائے دیکھیے پھر اس کے بعد کیا تقدیر

۳۲ - اختلاف مذاہب رفع نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اٹھ جائے دلیل و بحث سے
جو چلا آتا ہے باہم اہل مذہب میں خلاف

ہو نہیں سکتا مطابق جب کہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیوں کر ہزاروں اختلاف

۳۳ - انسان جو اشرف المخلوقات ہے ، سب سے زیادہ مورد آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
دو ہیں ان میں سے نہایت جاں گزا
ایک فکر اس آنے والے وقت کی
شک نہیں ہے جس کے آنے میں ذرا
دوسرے چوٹیں زبان خلق کی
زخم جن کا زخم ہے تلوار کا
اور بھی حیوان ناطق کے لیے
ہیں بہت سی زحمتیں ان کے سوا
پر گدھے اور اور حیوانات سب
رہتے ہیں دور ان گزندوں سے سدا
کیسا ان آلام سے رہتا نچنت
اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

۳۴ - چنڈو بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈو کے ، وہ تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ اس کام کا آخر انجام!
بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام
آنکھ میں اپنے پرائے کی ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام
جس سے عقبیٰ ہو درست ایسا نہ بونا کوئی بیج
جس سے دنیا میں ہو نام ایسا نہ کرنا کوئی کام
ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا
نفس سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر
لے نہ اس زہر ہلاہل کا کوئی بھول کے نام
یہ تو کہتے ہو کہ انجام برا ہے ، لیکن
یہ بتاؤ کہ برا ہوتا ہے کیسا انجام
برے انجام کی تب ہوگی حقیقت روشن
برے انجام سے جب آ کے پڑے گا خود کام
مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

★★★

(د) طنزیہ و مزاحیہ

---

۳۵ - تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا زینت و اسباب پہ جو لوگ
اتراتے ہیں ، اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے
حالی نے کہا جن کو ہے اترانے سے نفرت
اترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے

۳۶ - سید احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں
بعض کے نزدیک توحید اس کی حدِّ تام ہے
ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول
جو ہیں قائل اس کے ان پر کفر کا الزام ہے
کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اس رحمت کو عام
جس سے غیر از اہل قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ شر سے تیرے سب ایمن رہیں
بس مسلمانی و دیں داری اسی کا نام ہے

پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عندالفحول
کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اسے وہ خام ہے
ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ
اور 'سب' کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے
بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہے لباس
جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے
بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ
حصر کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے
مذہب منصور[1] ہے لیکن بیاں کرنا ضرور
جو مسلّم آج کل نزدیک خاص و عام ہے
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

۳۷ - قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت

قریب موسم حج قرض لے کے اک دیں دار
چلا بہ نیت حج گھر سے سوے بیت اللہ
کہا یہ اس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت!
کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ
کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوے حجاز
وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بہ حال تباہ
نہ نان و نفقۂ فرزند و زن سے خاطر جمع
نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ
سنا یہ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
کہ روکتا ہے مسلماں کو حج سے اے گمراہ!
وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

---

۱ - مختلف اقوال میں سے قول راجح کو "مذہب منصور" کہتے ہیں۔

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی
پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے بر و بحر کی راہ
جنھیں فراغت و تنگی میں ہے اسی سے امید
جنھیں سلامت و آفت میں ہے اسی کی پناہ
وہ سن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو
امید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ
ذلیل ہوتے ہیں جو بن بلائے جاتے ہیں
طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت و جاہ
یہ سن کے شیخ نے دیکھا ادھر اُدھر کہ کہیں
ہو مدعی نہ تجسس میں یاں کوئی ہمراہ

بلا کے پاس پھر آہستہ اس سے فرمایا
ابھی زمانے کی چالوں سے تو نہیں آگاہ

قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے
جوانِ خام کی واں تک نہیں پہنچتی نگاہ

خدا کے حُکم ہیں مبنی تمام حکمت پر
فتوح جن میں ہے دنیا و دیں کی خاطرخواہ

نماز و روزہ ہو یا ہو طواف و عمرہ و حج
حصول جیسے کہ ہوتا ہے ان سے قرب الٰہ

اسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام
نہ جن میں چاہیے محنت نہ کوشش جاں کاہ

مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے، ورنہ
ہزاروں پھرتے ہیں حجاج سادہ لوح تباہ

یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
وگرنہ علمِ معیشت وسیع ہے واللہ

۳۸ - سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

ید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ

کس لیے سیّد سے صاف اے حضرت والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھہراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں
آپ بھی نام خدا ، ہیں تارک صوم و صلٰوۃ
اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں
خود نبوت پر سنے ہیں ہم نے ایراد آپ کے
اور الوہیت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں
چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب وسیع
پھر یہ سیّد پر تبرّا آپ کو زیبا نہیں
سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہے، سن لو صاحب، تم سے کچھ پردا نہیں
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

۳۹ - قحطِ اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشم پُرنم ، اپنا تھا یا پرایا
دنیا سے اٹھ گئے سب جو تھے مریدِ صادق
یہ کہہ کے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اس کو بھی رلایا

۴۰ - سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہِ معاش کی

وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اس کی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اس نے کیے سینکڑوں جتن
پر کی نصیب نے کہیں اس کے نہ یاوری
راہ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اک خضر بے خجستہ نے کی آ کے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ کو اس کے چتھیڑ کر
تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گرد و پیش سے
لگتی ہے کیسی آ کے زر و سیم کی جھڑی
دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی

۱۴ - لوگ کسی کی خوبیاں سن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اس کے عیب سن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنوں **حالی**
اس قدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکرگزار
لوگ جب عیب ہمارا کوئی سن پاتے ہیں
گو کہ کرتے ہیں تأسف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو رنج ان کو کمال
گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار

اور جو ہو گوش زد ان کے کوئی خوبی اپنی
خوش تو پڑتی ہے بنانی انھیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم ان کے
کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار
للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا
نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ تیار

۴۲ - اسراف

ایک مُسرف نے یہ مُمسک سے کہا
کب تک اے ناداں یہ حبِ مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ
ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر؟
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح
زر لٹانا رائگاں اور اس قدر؟
آج ہی گویا، نصیب دشمناں
آپ کا دنیا سے ہے عزم سفر

۴۳ - پاس نیک نامی

اے نیک نام! شکر کر اللہ کا ادا
جس نے بنایا نیک تجھے کرکے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نام نیک کا
پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھ کو خوف خدا کا ہو اس قدر
جتنا کہ خوف طعنہ و تشنیع خاص و عام

۴۴ - غرورِ نیک نامی

گئی ہے حد سے گزر شیخ کی نکونامی
گمانِ بد کبھی اس کی طرف نہیں جاتا

جو اس کے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی
خود اس کو عیب کا اپنے یقین نہیں آتا

۴۵ - خود ستائی

اے دل! بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا

جو زیورِ خرد سے معرّا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا

جو ان سے تیز ہوش ہیں، سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا

کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا

کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈب میں میں نے دیا مال جب دکھا

پردے میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ
اور بن کے بےوقوف جتاتا ہے وہ سخا

کچھ اس لیے کہ ہم بھی انھی میں سے ہوں شمار
اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا

کچھ اس لیے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا

کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی
ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا

کہتا ہے ایک گُر ہے خوشامد کا اور ہی
پرچاتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم برا

دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ
اور منہ سے دُرد کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا

چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہ
اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
قانع ہے وہ اُنھی پہ، ہوئے وصف جو بیاں
اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
کہتا ہے زید، عمرو ہے شدت سے سادہ لوح
گنتا ہے سب کو نیک وہ اچھا ہو یا برا
کہتا ہے عمرو زید بھی کتنا ہے عیب بیں
بد ہو کہ نیک اس کی زباں سے نہیں بچا
یہ اُس کا اور وہ اس کا بیاں کر کے کوئی عیب
ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا
غیبت، امید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پُتلا نہ خود ستا
حالی جو پترے کھول رہے ہیں جہان کے
شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مدعا
یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا
القصہ جس کو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بے چارہ مبتلا

۴۶ - رؤساے عہد کی فیاضی

کی رئیس شہر کی تعریف یاروں نے بہت
بر سبیل تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا
بولے آج اس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر
عاملان شہر مدعو اس کے رہتے ہیں سدا

ضلع کے حکّام کا ادنیٰ اشارہ چاہیے
پھر کوئی دیکھے سخاوت اس کی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیان دولت کی بنیں
ان میں صرف اس کی رقم ہے سب کے چندے سے سوا
پالکی یا ویگنٹ[1] ہے جو سواری اس کے پاس
اہل کاروں کے لیے ہے وقف ، بے چون و چرا
کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس[2]
اس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رو و ریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ ان سے **حالی** نے بصد منت کہا
عیب بھی اس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں
سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

۴۷ - ایمان کی تعریف

فقیہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف
تو دی چراغ سے اس کو بہ آب و تاب مثال
کہا فتیلۂ اقرار باللسان ہے ضرور
جہاں ہو آتش تصدیق و روغن اعمال[3]
کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل
نہیں ضرور فتیلے کا جس میں استعمال[4]

---

۱ - چار پہیوں کی کھلی ہوئی گھوڑا گاڑی جس میں دو طرفہ نشستیں ہوتی ہیں (Wagonette) -

۲ - کوتوال -

۳ - یعنی ایمان کے لیے دل سے تصدیق ، زبان سے اقرار ، اور عمل سے اثبات ضروری ہے -

۴ - یعنی مٹی کا تیل جو بغیر بتی کے بھی جل سکتا ہے - گویا مجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے -

۴۸ - شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھّارہ سال کا ہو
تختِ پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ اُن مقنّنوں نے
عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی
کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک اُن کے گویا بر رغم عقل و دانش
ہے کنگڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

۴۹ - حرص

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ
قدر قلیل ہے سب مال و منال دنیا
گویا کہ حرص اس کی اس سے بجھی نہیں ہے
ہے جس قدر فراہم پاس اس کے مال دنیا

۵۰ - عصمت بی بی از بے چادری

اے بے نواؤ! ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم
اخلاق میں کچھ ان کے اگر آگیا بگاڑ
تم زد سے نفس کی ہو جبھی تک بچے ہوئے
ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے مفلسی کی آڑ
اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش
گر تم کو ہو نصیب تو دنیا کو دو اجاڑ

۵۱ - سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے

سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

۵۲ - اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

ٹھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقت باز پرس
اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

۵۳ - بے اعتدالی

تم اے خود پرستو! طبیعت کے بندو!
ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
تو چیخ اٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جب تک
کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر
تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو
کہ بس ٹھن گئے عزم جنگ تتر[1] کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو
کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے

---

۱ - تاتاریوں سے لڑنے کا ارادہ۔

جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی
رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے[1]

۵۴ - طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمے سے ہوتا ہے ہر بشر کو ملال
کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے
تو اور بھی اسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہے کہ ہوتے نہیں طبیب ملول
جو چل بسے کوئی ان کے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ تھپ جائے گی خطا ہم پر
کیا ملال کا اپنے گر اس جگہ اظہار

★ ★ ★

(۵) حکایات و مطائبات

۵۵ - ایک خود پسند امیر زادے کی تضحیک

کہتے ہیں اک امیر زادے کو
تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیر زادوں میں
لازمی ہیں سو اس میں بھی سب تھیں
گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی
اس پہ تھا خود پسند اور خود بیں

۱ - یعنی پیٹ بھر کے احمق - احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں - گویا مخاطب کے سوا کسی پر اس کی حماقت ظاہر کرنا نہیں چاہتے -

کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ
علم تیر و کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سنتے سنتے یاروں کی
ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں

الغرض ایک روز صحرا میں
جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
مشق تیر افگنی میں تھا مُصروف
کر رہے تھے خوشامدی تحسیں

آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال
وجہِ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
تیر جتنے کماں سے چھوٹے
پائے سب بے اصول و بے آئیں

جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا
تیر آماج گہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چھٹ کے سوے شمال
ایک جاتا تھا پھٹ کے سوے یمیں

کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی
رکھ کے بالاے طاق سب تمکیں
خاک تودے پہ جا کے ہو بیٹھا
لوگ کرتے رہے چناں و چنیں

ناوک انداز بولا چلاّ کر
کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے
یا کہ دوبھر ہے تجھ کو جان حزیں

عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا
جب کہ جائے گریز ہو نہ کہیں

زد سے ان بے پناہ تیروں کی
کہیں جاں‌دار کو امان نہیں

مجھ کو ہر پھر کے شش جہت میں حضور
امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

۵۶ - بدی کرکے نیک نامی کی توقع رکھنی

نا منصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم
برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیت

جب دورے کو اٹھتا تھا تو دیہات میں جا کر
تھا پوچھتا ہر ایک سے از راہ شرارت

ہیں پرگنے کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا
کرتے ہیں ہماری وہ ستایش کہ مذمت

تھی اس کی مثال ایسی کہ اک شخص بد آواز
جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت

گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے
ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سرعت

ہو تا کہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری
آواز خوش آیند و یا قابلِ نفرت

۵۷ - نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگزر تھی اور نہ ساتھ ان کے رعایت تھی کہیں

بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف
کام سے مہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں

حسن خدمت پر اضافہ یا صلہ تو در کنار
ذکر کیا، نکلے جو پھوٹے منہ سے اس کے آفریں

پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اس سے دوچار
نتھنے پھولے، منہ چڑھا، ماتھے پہ بل، ابرو پہ چیں

تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیے کوئی فتوح
آ کے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں

رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
فرض جس میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں

گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواست گار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں

حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں
تاکہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں

واں سوا تنخواہ کے، تھا جس کا آقا ذمے دار
تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمے تھیں

دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مار آستیں

ایک دن آقا تھا اک منہ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دست نازنیں

دفعتاً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
اور گرا اسوار صدر زیں سے بالائے زمیں

کی بہت کوشش نہ چھوٹی پاؤں سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آ کر معیں

تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں

دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

۵۸ - صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گزرا کہیں میلا کچیلا اک غلام
اس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اس کو کی
عرض کی ایک اک رواں ہو جس بدن کا ملکِ غیر
اختیار اس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونکہ جسم آدمی میں پیشِ اہلِ معرفت
کوئی چیز اس کی نہیں ، ہے سب امانت گور کی

۵۹ - سخن سازی

ہے مرد سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو
موجود سخن گو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو
دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونوں

۶۰ - شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال
انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اس کی جب یہی دیکھی گئی روش
پوچھا کسی نے اس سے کہ اس کا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اس لیے کی ہے یہ اختیار
چھٹ جائے مجھ سے تاکہ یہ لپکا سوال کا

پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک
آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کے اس قوم پر مدار
منت سے ، عجز سے ، کبھی ملتا نہیں ٹکا
امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت
گر چند روز اور رہا ان سے سابقا
آیا جواب سن کے یہ اس کا بہت پسند
کی آفریں اور اس سے مخاطب نے یوں کہا
نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ
حق میں ترے مفید ہیں یہ ان سے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل
اہل وطن پہ ان کی مگر جان ہے فدا
پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ
دل بھائیوں پہ بھی نہیں ان کا پسیجتا
انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور
جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا
اہل غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ
شائستگی کا زہر ہے جب سے انھیں چڑھا

۶۱ - ناصح مخلص اور اھل غرض میں تمیز

منصور[1] نے یہ جعفر صادق سے عرض کی
محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور

۱- ابو جعفر منصور: عباسیہ خاندان کا دوسرا خلیفہ (عہد خلافت : ۷۵۳ع تا ۷۷۴ع) -

فرمایا ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرف نصیحت زبان پر
اور جن سے ہے امید نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری حذر

۶۲ - خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدام ماموں[1] کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
کوئی آقا جب کہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیش خدمت اس کے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا
پر جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم
ہے دلیل اس کی کہ ہے خود خُلق آقا کا برا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جس نے اور تمکین کو
اس نے گویا ڈھا دیا رکنِ رکیں اخلاق کا

۶۳ - خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکل[2] کا تیر چڑیا پر
ہو گیا اتفاق سے جو خطا
ابن حمدوں ندیم تھا حاضر
کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
جن کو خلق خدا پہ شفقت ہے
خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
جا نہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ
تو نے دی قصداً اس کی جان بچا

---

۱ - عبداللہ المامون بن ہارون ، ساتواں عباسی خلیفہ (عہد خلافت : ۸۱۳ع تا ۸۳۳ع)
۲ - متوکل علی اللہ بن معتصم ، دسواں خلیفہ (۸۴۷ع تا ۸۶۱ع) -

ابن حمدوں نے کی یہ دانائی
کہ خوشامد سے یوں اسے تھپکا
دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے
ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا
جائے کنجشک ابن حمدوں پر
تیر کا اپنے امتحان کرتا
ابن حمدوں کی جان گو جاتی
دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

۶۴ - رعیت پر نا اہل کو مسلط کرنا

ہارون[1] نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اس کے
فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطۂ ملعون تھا یہی جس کی بدولت
تھا دل میں خدائی کا خیال اس کے سمایا
میں بھی اسے اس باغیِ طاغی کے علی الرغم
اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خصیب ایک غلامِ حبشی تھا
جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنتِ مصر کی باگ اس کے حوالے
نا اہل کے پنجے میں اہالی کو پھنسایا
باڑی گئی بہہ ایک برس نیل کی رو میں
یہ حادثہ آ اس کو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اون
ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا

---

۱ - ہارون الرشید بن مہدی ، خاندان عباسیہ کا پانچواں خلیفہ (عہد خلافت : ۷۸۶ع تا ۸۰۹ع) -

ہارون نہ سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی
محکوم ہے جو میری رعایا و برایا
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا
اپنے کو خدا ، جس نے ہے عالم کو بنایا
جڑ کھود میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی
اک سفلۂ ناکس کی بنا اس کو رعایا

٦٥ - رشک

ظاہرا مردوں کی طینت میں نہیں رشک اس قدر
ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں

ایک شہزادی کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
تختِ شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں

سلطنت میں اس کی تھا مردوں کو کلی اختیار
عورتیں اصلا دخیل اس کی حکومت میں نہ تھیں

مرد ہی تھے اس کے محرم ، مرد ہی اس کے مشیر
تھا نہ عورت کا پتا دربار میں اس کے کہیں

تخلیے میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
ہنس کے فرمایا کہ اے دولت کے ارکانِ رکیں

مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں
بلکہ ہے آنس اس لیے تم سے کہ تم عورت نہیں

بات کی حسن بیاں سے اس نے دی صورت بدل
تا کہ کوئی سوء ظن اس پر نہ کر بیٹھے کہیں

ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اس لیے نفرت کہ ہے مردوں کی صورت دل نشیں

٦٦ - مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے، سبب کیا ہے کہ اکثر
مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی بُری گت
لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج
واں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار
قبضے میں ہے واں عورتوں کے دولت و مکنت
اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی
سمجھو کہ ہے اس ملک میں مردوں کی حکومت

٦٧ - گدائے مبرم

اک برہمن مورتی کے سامنے با صد نیاز
مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں
آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا ادھر
دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں
جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے
تاکہ پوچھے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں
مورتی کے سامنے جب کرچکا وہ التجا
بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں
مورتی کچھ تجھ کو دے گی اور نہ دے سکتی ہے وہ
ق تنی التجائیں اس کے آگے تو نے کیں
ہنس کے برہم نے کہا، ہے مانگنا بندے کا کام
دے نہ دے وہ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں
ہم نہیں دیتے ڈھئی تم جیسے ڈھیٹوں کی طرح
ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پاؤں پھیلاتے نہیں

★ ★ ★

رباعیات

دور اول (۱۸۶۳ع تا ۱۸۷۲ع)

۱

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جا!
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

۲

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ ، وفا پہ ، جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روتے تھے تو اب روئیں گے

۳

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے
اک خستہ جگر کی رات کیوں کر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی[1]
یہ چار پہر کی رات کیوں کر گزرے

---

۱ - رباعیات حالی (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی طبع اول - ۱۹۳۵ع صفحہ ۱۱۵) میں یہ مصرع یوں درج ہے :

گزری نہ ہو جس بغیر یہاں ایک گھڑی

غالباً یہاں دیوان حالی ، طبع اول (صفحہ ۱۵۳) کی پیروی کی گئی ہے ، لیکن شیخ صاحب کے مرتبہ مجموعوں میں ''یہاں'' اور ''یاں'' ، ''وہاں'' اور ''واں'' میں تحریف و تبادل کی صورت عام ہے - اس تحریف سے ہر جگہ مصرعے وزن سے خارج ہو گئے ہیں - (مرتب)

۴

یاد اس کی یہاں ورد مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے[1]
کس طرح نہ لیجیے کہ ہے نام اس کا
کس طرح نہ کیجیے کہ کام اپنا ہے

۵

کیا پاس تھا قول حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ؟
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

۶

حُر کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
گمرہ نہ ہو رہبر حق آگاہ سے مل
سرگشتگیِ کوے ضلالت کب تک
اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

۷

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا
اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحر غفلت کی یزید
واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

★

---

۱ - دیوان حالی ، طبع سوم (صفحہ ۲۴۸) میں ''خالی نہ ہوا کبھی''، رباعیات حالی (صفحہ ۱۱۶) میں ''خالی نہ ہو کبھی'' چھپا ہے لیکن دیوان حالی ، طبع اول (صفحہ ۱۵۳) میں ''خالی نہ ہو جو کبھی'' درج ہے اور یہی صورت بہتر ہے - (مرتب)

دور دوم (۱۸۷۲ع تا ۱۸۹۳ع)

۸ - توحید

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

۹ - ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

۱۰ - ایضاً

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

۱۱ - ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
منکر بھی پکار اٹھتے ہیں تجھ کو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ
خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور

۱۲ - ایضاً

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال
لیکن انھیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

۱۳ - ایضاً

مٹی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں
کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک
گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

۱۴ - ایضاً

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے
طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

۱۵ - ایضاً

کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد
دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر جو کہ ہیں تجھ سے لو لگائے بیٹھے
رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

۱۶ - نعت

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا
اور اُمّیوں کو خیر اُمم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلّے کو بہم تو نے کیا

۱۷ - ایضاً

زہاد کو تو نے محوِ تمجید کیا
عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی
توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

۱۸ - ایضاً

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری اَبوّت سے شرف

۱۹ - صلح کل

ہندو سے لڑیں ، نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

۲۰ - ترکِ شعرِ عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعرخوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

۲۱ - پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل ان کے ہیں ظرف ان کے جو کرتے ہیں تیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

۲۲ - نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

۲۳ - امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں
پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے، کہیے اب کیا ہے صلاح؟
فرمایا کہ بھائی جان! جی ہے تو جہاں

۲۴ - عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پر اتنی ہے خبر
اک مشغلہ دلچسپ ہے بے کاروں کا

۲۵ - نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد، اے فرزند!
اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

۲۶ - دوستوں سے بیجا توقع

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے
جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

۲۷ - شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو! مفتوں
گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
خود عہد شباب اک جنوں ہے ، اب تم
کرتے ہو فزوں، جنوں پہ اک اور جنوں

۲۸ - غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
پر عیب سے بچیے تا بہ‌مقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

۲۹ - گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ ، زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع ، دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

۳۰ - شرط قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں
پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہے، مگر
عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

۳۱ - طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بنانا چاہیے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہل عرفان و یقیں
پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہو نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

۳۲ - عالم و جاہل میں کیا فرق ہے؟

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہم سر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

۳۳ - موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجامِ ترقیِ بشر
یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انسان میں عیب
ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

۳۴ - مسرف کو کیوں کر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

اک منعم مسرف نے یہ عابد سے کہا
کر میرے لیے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوے چرخ
محتاج کر اس کو جلد اے بار خدا!

۳۵ - کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج، تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

۳۶ - غرض

ہے نفس میں انساں کے جبلّی یہ مرض
ہر سعی پہ ہوتا ہے طلب گارِ عوض
جو خاص خدا کے لیے تھے کام کیے
دیکھا تو نہاں ان میں بھی تھی کوئی غرض

۳۷ - انقلاب روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہے نوبت تو کل اُس کی باری
بن بن کے یوں ہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

۳۸ - تقاضاے سِن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید
وہ وقت گئے، اب اور موسم آیا

۳۹ - جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں، وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا

دنیا کو ہمیشہ نقش فانی سمجھو[1]
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

۴۰ - آثار زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو سستی پہ قناعت کا گماں
بچے آوارہ اور بے کار جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہماں

---

۱ - دیوان حالی کے ہر مطبوعہ نسخے میں یہ مصرع یوں چھپا ہے: ''دنیاے دنی کو نقش فانی سمجھو'' لیکن مولانا حالی نے دیوان کے ذاتی نسخے میں بعض ترسیمیں کیں - رباعیات حالی میں یہ مصرع ترمیم شدہ نسخے کے مطابق درج ہے - (رباعیات، صفحہ ۴۴)

۴۱ - شان ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
برسات میں سبزے کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان
یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

۴۲ - نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا
شیریں سخنی سے شہدِ فائق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق
آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

۴۳ - مسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں پکّا
ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے
سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکّا

۴۴ - مکر و ریا

حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا
خطرہ انھیں گرگ کا، نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر
بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

۴۵ - جوہر قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں
پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباس تربیت سے، ورنہ
ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

۴۶ - علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا ’تو جہاں سے واں آیا زوال'[1]
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

۴۷ - ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمۂ نعما و آبادی تو ہے
آسائشِ دوجہاں ہے سائے میں ترے
دنیا کا وسیلہ ، دین کا ہادی تو ہے

۴۸ - ایضاً

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہ نخشب[2] کی طرح
رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

۴۹ - خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اس کو باپ کی عزت سے

---

۱ - دیوان حالی ، طبع اول (صفحہ ۱۴۱) میں معمولاً اور طبع سوم (صفحہ ۱۱۳) میں سہواً ، ”وہاں آیا زوال“ چھپا ہے - رباعیات حالی (صفحہ ۵۱) میں یہ مصرع اور زیادہ مسخ ہو گیا ہے - ملاحظہ ہو :

”غائب ہوا تو جہان سے آیا وہاں زوال“ (مرتب)

۲ - وہ چاند جو حکیم ابن عطا معروف بہ مقنع نے شہر نخشب میں بنایا تھا اور جو باقاعدہ ایک کنویں سے طلوع و غروب ہوتا تھا ، اس کی روشنی چند میل تک محدود رہتی تھی -

سوچو تو ہے فضلے کا نسب بھی عالی
پر اُس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

۵۰ - عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا، مجھ سے ہے عزت ہے جہاں
فرمایا ہنر نے، میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی، غلط ہے دونوں کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

۵۱ - توقع بے جا

ہیں یار رفیق، پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز، لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوع بشر کی خود جبلت میں نہیں

۵۲ - عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی
اتنی ہی مغایرت ہے یاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکر مآل
ضدین ہیں دوستی و دوراندیشی

۵۳ - عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

---

۱ - دیوان حالی، طبع اول (صفحہ ۱۴۱) و طبع سوم (صفحہ ۱۱۴) میں فضلے کی جگہ ''کھات'' (یعنی کھاد) چھپا ہے رباعیات حالی میں یہ مصرع ترمیم شدہ صورت میں درج کیا گیا ہے - (مرتب)

۵۴ - ایضاً

اے عیش و طرب! تو نے جہاں راج کیا
سلطاں کو گدا ، غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل
بغداد کو ، قرطبہ کو تاراج کیا

۵۵ - غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

۵۶ - عشق

اے عشق! کیا تو نے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خرف[۱] اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری[۲]
قوموں کو ذلیل ، خاندانوں کو تباہ

۵۷ - سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی 'برکت کا قدم'
یا تو کوئی 'بیگم' ہے مشیر دولت
یا ہے کوئی 'مولوی' وزیرِ اعظم

---

۱ - سترا بہترا : مخبوط الحواس۔

۲ - دیوان حالی ، طبع سوم (صفحہ ۱۱۵) اور رباعیات حالی (صفحہ ٦۱) میں یہ مصرع یوں درج ہے : دیکھا سدا سلامتی میں تیری لیکن ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصرعے کا وزن پورا نہیں ہوتا۔(مرتب)

۵۸ - دین و دنیا کا رشتہ

دنیا کو دیے دین نے اسرار و حکم
دنیا نے کمر دین کی تھامی جس دم
گر دین کی ممنون بہت ہے دنیا
دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

۵۹ - آزادگانِ راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب وگناہ
کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت
لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

۶۰ - بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظم جہاں کا ہے مدار
اس قوم کا جیتنا ہے **حالی** دشوار
عزت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پروا
ذلت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

۶۱ - عفو باوجود قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بار خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

۶۲ - سختی کا جواب نرمی سے

فتنے کو فرو کیجے بہ ضبط و تمکیں[1]
زہر اُگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں

---

۱ - یہ مصرع رباعیات حالی (صفحہ ۶۷) سے ترمیم شدہ صورت میں نقل کیا گیا ہے ۔ دیوان حالی (طبع اول ۔ صفحہ ۱۴۴) میں یوں درج ہے :
فتنے کو جہاں تلک ہو دیجے تسکیں ۔ (مرتب)

غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے
اس عارضے کا علاج بالمثل نہیں

۶۳ - ہمت

تیمور نے اک مورچہ زیر دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سر بام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں کوئی پیش ہمت دشوار

۶۴ - کم ہمتی

جبریّہ و قدریّہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

۶۵ - پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا
ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے ندامتوں کی جانا ہم نے
دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

۶۶ - تاسف بر وفات نواب ضیاءالدین احمد خاں مرحوم نیرّ تخلص دھلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طناز
آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبلِ زار
سو اس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

۶۷ - ایضاً

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی[۱]
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

۶۸ - محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

۶۹ - گدائی کی ترغیب

اک مرد توانا کو جو سائل پایا
کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا اُن کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

۷۰ - تکفیرِ اہلِ اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں
سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا مرقد میں سوال
تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں ؟

---

۱ - یہ اُن شعرائے دہلی کے نام ہیں جن کے ساتھ راقم کو ربط و اختصاص رہا ہے، عام اس سے کہ وہ مشہور و نام ور ہوں یا نہ ہوں - (حالی)

۷۱ - ترک عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو
کچھ چشم جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہ کن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

۷۲ - تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

۷۳ - اول کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے
پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوح نے طوفاں سے

۷۴ - کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لیے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح
مُردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

۷۵ - جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سمونے والے
بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام
اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

۷۶ - چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بدظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دوچار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

۷۷ - سکوتِ درویشِ جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ
خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت
معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

۷۸ - ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکرِ قرآن و خبر
کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ
کتّا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

۷۹ - دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا
ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر
اس سے بھی گیا جس کے ہزاروں ہوں خدا[1]

۸۰ - دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق، سماعت نہ ہو جب کانوں میں
دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں

---

۱ - یہ مصرع بھی رباعیات حالی (صفحہ ۸۴) میں ترمیم شدہ ہے۔ دیوان حالی (طبع اول - صفحہ ۱۴۷) میں یوں درج ہے:
اُس سے بھی گیا کہ جس کے لاکھوں ہوں خدا۔ (مرتب)

غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح
دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

۸۱ - رفارم کی حد

دھونے کی ہے، اے رفارمر! جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

۸۲ - اپنی تعریف سن کر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں نادان فی الفور
داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سن کر ناخوش
مقصود یہ ہے کہ ہو ستایش کچھ اور

۸۳ - حسنِ ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں
نیکی میں شک اس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکۂ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ
پر اس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں

۸۴ - دینداروں کی برائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام
اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار
اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

۸۵ - فکرِ عقبیٰ

منزل ہے بعید باندھ لو زاد سفر
مواج ہے بحر رکھّو کشتی کی خبر

گاہک چو کس ہے لے چلو مال کھرا
ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہ گزر

۸۶ - انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہوجائے فرشتہ انساں
ممکن ہے بدی کا نہ رہے اس میں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے
انسان ہے اب تک وہی قرن الشیطاں

۸۷ - سلاطین کا عشق

ہرچند برا ہے عشق کا سب کے مآل
پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سلطاں ہے اگر ظل الٰہی تو عشق
ہے ظل الٰہی کے لیے وقتِ زوال

۸۸ - وقت کی مساعدت

اے قوت بگاڑ کا ہے سب کے چارا
پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہوجائے گر ایک تو ہمارا ساتھی
پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

۸۹ - بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے

کی طاعت نفس میں بہت عمر بسر
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اٹھا چکے اب **حالی**
مجلس کرو برخاست ہوا وقتِ سحر

۹۰ - دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا

جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک[1]
ہے جوہر انسان کی کسوٹی سونا

۹۱ - حد سے زیادہ غصہ قابلِ عفو ہے

غصے پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں
جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر
پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

۹۲ - سفہا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری
کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر، نصیبِ اعدا
رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

۹۳ - مرض پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال
آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

۹۴ - اسراف

مسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ ان کے ہنسیں بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

---

۱ - رباعیات حالی (صفحہ ۹۵) میں سہو کتابت سے مہک (بجائے محک) چھپا ہے - (مرتب)

۹۵ - ردِّ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے، نہ صواب
زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار اے دوں ہمت!
سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

۹۶ - کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں
جو دیکھ کے چکھ کے دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک!
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

۹۷ - علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو، نہ ہو خوفِ زوال

۹۸ - اچھوں کو برا سننے میں بھی مزہ آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
جو کر کے بھلا، خلق سے سنتے ہیں برا
ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا **حالی**
آتا نہیں ان کو کچھ دعاؤں میں مزا

۹۹ - شکریۂ مدحِ کلامِ راقم

جوش خم بادہ، جام خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دلِ **حالی** میں ہوا

تسلیم[1] نے کچھ اس طرح سے دی داد سخن
مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

۱۰۰ - قیامِ جے پور

دل کہتا ہے حالی سے کہ پچھتائیے گا
جے پور میں ٹھہرنے کی جو ٹھہرائیے گا
جس طرح کہ غربت میں وطن کی ہے یاد
غربت کو وطن میں یاد فرمائیے گا[2]

۱۰۱ - احسانِ بے منت

احساں کے ہے گر صلے کی خواہش تم کو
تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اسے عام
اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

۱۰۲ - قانون بداخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بے کار
حاشا کہ ہو ان پہ نظم عالم کا مدار
جو نیک ہیں ان کو نہیں حاجت ان کی
اور بد نہیں بنتے نیک ان سے زنہار

---

۱ - ''مولوی سلیم الدین مرحوم نارنولی ، مقیم جے پور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستائش میں اس وقت بھیجے تھے جب کہ مدت سے فکر شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا ۔ ان قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی'' - (حالی)

۲ - یہ رباعی دیوان حالی ، رباعیات حالی یا اور کسی مجموعے میں شایع نہیں ہوئی - حالی نے یہ رباعی اس وقت کہی تھی جب کہ وہ بہ زمانۂ قیام جے پور، مولوی سلیم الدین نارنولی ، المتخلص بہ تسلیم کے یہاں ان کی ادبی صحبتوں میں شریک ہوئے تھے اور قاضی فرزند علی فقیر کے مکان پر فروکش تھے - (بحوالۂ تذکرۂ شعراے جے پور - مصنفہ احترام الدین احمد شاغل ، صفحہ ۱۴۸) - (مرتب)

۱۰۳ - مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں
بھڑکے گی مدافعت سے اور آتشِ کیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہلِ خلاف
جز ترکِ جواب کوئی تدبیر نہیں

۱۰۴ - ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل
اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل[۱]
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور
ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

۱۰۵ - انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

۱۰۶ - بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ! بھرتے نہیں یوں
دل دیتے ہیں پر جی سے گزرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

۱۰۷ - واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام

---

۱ - دیوانِ حالی (طبع سوم صفحہ ۱۳۲) میں یہ مصرع یوں درج ہے:
اک وقت سے اپنے تو نہیں ٹلتی اجل (مرتب)

بولا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے
ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

۱۰۸ - نواب وقارالامرا اقبال‌الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اس کی چھوڑ دی ہمراہی
اقبال پہ جس نے فتح یابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی ان سے
ہے جن کی رگوں میں خون آصف جاہی[1]

★ ★ ★

۱- ”یہ رباعی ۱۳۰۹ھ میں جب کہ راقم حیدرآباد میں مقیم تھا اور نواب وقارالملک بمبئی سے پولو میں بازی جیت کر آئے تھے، لکھی تھی - مگر ان کی خدمت میں بھیجی نہیں گئی - خون آصف جاہی میں اس بات کا اشارہ ہے کہ حضور سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں ان کے خطاب کی طرف اشارہ ہے“ - (حالی)

دور سوم : ۱۸۹۳ع تا ۱۹۱۴ع

۱۰۹ - توحید

ہستی تری گو نہیں ہے محتاجِ دلیل
صبرِ دلِ مضطر کی مگر کیا ہے سبیل
یہ طبعِ خسیس مطمئن ہو کیوں کر
بے دیکھے ہوا نہ مطمئن جب کہ خلیل [1]

۱۱۰ - ایضاً

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور
ادراک سے اوجھل تو نظر سے مستور
یہ حسرت دید دل میں قائم رکھیو
بس یاس کی ظلمت میں یہی ہے اک نور

۱۱۱ - ایضاً

سقراط منادی میں تری کام آیا
سر تیرے لیے حسین نے کٹوایا
مر کر کوئی پائے یا سر کٹوا کر
پایا تجھے جس نے اس نے سب کچھ پایا

---

۱ - رباعیات حالی (صفحہ ۱۲۰) میں یہ مصرع غیر موزوں صورت میں یوں درج ہوا ہے :

بے دیکھے نہ ہوا مطمئن جب کہ خلیل (مرتب)

۱۱۲ - ایضاً

دریا سے اٹھا کے بھاپ مینہ برسایا
پیراہنِ سبز خاک کو پہنایا
دانے کو کیا نخلِ تناور تو نے
پانی جڑ سے پھننگ تک دوڑایا

۱۱۳ - خدا کی بے نیازی

منوائی ہے ہار سب سے بازی نے تری
طبقے الٹے ہیں ترکتازی نے تری
ہے کالوری[1] و کربلا اس پہ گواہ
جو گھر گھالے ہیں بے نیازی نے تری

۱۱۴ - طالبِ صادق کامیاب ہوتا ہے

طالب کا رہے گا پڑ کے پاسا آخر
دے گا اسے صدقِ دل دلاسا آخر
جھوٹی نہیں گر پیاس تو آگے پیچھے
دریا پہ پہنچ رہے گا پیاسا آخر

۱۱۵ - تشنگیِ طلب

کب تک کوئی سوزشِ نہانی کو چھپائے
کب تک اپنے کو تشنہ سیراب دکھائے
"کج دار و مریز" سے تری اے ساقی
پتھر کا کلیجا ہو تو پانی ہو جائے

۱۱۶ - پیری

علم و عمل و کتاب سے نفرت ہے
لکھنے پڑھنے کے نام سے وحشت ہے

---

۱ - وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے -

تو نے ہر دردِ سر سے دی آ کے نجات
پیری! رحمت ہے تجھ کو صد رحمت ہے!

۱۱۷ - ایضاً

پیری نہیں منزلِ فنا ہے گویا
اب کوچ کا وقت آ لگا ہے گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کافور
اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

۱۱۸ - انسان کی عظمت کا راز

دولت کی ہوس اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے، تو ہے یہ شاہنشاہی[1]
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

۱۱۹ - کینچلی میں سانپ

محنت سے وصول ایک پیسہ ہو اگر
کر اشرفیوں کی نیولی پر نہ نظر
یہ کینچلی میں بھرا ہوا سانپ ہے سانپ!
ہاں سوچ سمجھ کے ڈالنا ہاتھ اس پر

۱۲۰ - دولت کی تعریف

دولت خرمن بھی، برقِ خرمن بھی ہے
تلوار کی دھار بھی ہے جوشن بھی ہے
تھوڑا سا ہے اس میں شر تو ہے خیر بہت
گر سانپ ہے یہ تو سانپ کا من بھی ہے

---

۱ - رباعیات حالی میں شاہنشاہی کی جگہ، شہنشاہی درج ہے - اس تحریف سے مصرع وزن سے خارج ہو گیا - (مرتب)

۱۲۱ - قناعت مفقود ہے

حاصل ہے اگر خوشی تو ہے غم کی تلاش
گر شہد میسر ہے تو ہے سم کی تلاش
قانع نہیں کوئی حالتِ نقد پہ یاں[1]
جنت میں بھی شاید ہو جہنم کی تلاش

۱۲۲ - خوش رہنے کا نسخہ

اولاد کا ہے ایک کے دل میں ارماں
اور دوسرے پر ہے بارِ اولاد گراں
گر چاہے عالمِ تعلق میں خوشی
رکھے نہ یہاں خوشی کی امید انساں

۱۲۳ - سب صحبتیں برہم ہونے والی ہیں

نقشے ہیں خوشی کے سب بگڑنے والے
پودے نہیں اس کے جڑ پکڑنے والے
مل بیٹھنا ہے یہ ناؤ ندی سنجوگ
ہیں اب کوئی دم میں سب بچھڑنے والے

۱۲۴ - اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ

حاکم سے بھلائی کی توقع ہے محال
جب تک کہ رعیت کے بھلے ہوں نہ خصال
تم اپنے سوا کسی کے محکوم نہیں
عمّال ہیں بس یہی تمھارے اعمال

۱۲۵ - موجودہ مصائب کی وجہ

ہیں برف سے، یخ سے ملک پامال کہیں
طاعون ہے نازل کہیں، بھونچال کہیں

---

۱ - رباعیات حالی میں 'یاں' کی جگہ 'یہاں' درج ہے جس سے مصرع وزن سے خارج ہو گیا ہے۔ (مرتب)

ابتر ہے کچھ ان دنوں نظام عالم
عمال نہ ہوں خلق کے اعمال کہیں

۱۲۶ - افسون محبت

ہے جن کو کہ صیدِ دلِ انساں کا خیال
لازم ہے کہ پھیلائیں محبت کا جال
اُستاد کو یاد ہو اگر حُبّ کا عمل
تعطیل میں بھی نہ چھوڑیں مکتبِ اطفال

۱۲۷ - زخارف دنیوی کی بے ثباتی

گلشن میں نہیں ہے تری اے گل! جوڑی
تو نے نہیں آنِ حسن کوئی چھوڑی
تھا جی میں کہ تجھ سے باندھیے عہد وصال
پر کیجیے کیا، عمر ہے تیری تھوڑی

۱۲۸ - ابدی حیات کس چیز میں ہے

گر چاہو کہ جیتے جی بھلے کہلاؤ
اپنوں کو سلوکِ نیک سے پرچاؤ
پر مدِ نظر ہو گر حیاتِ ابدی
بیگانوں کو آشنا بناؤ، جاؤ!

۱۲۹ - کُنْ یَداً وَّ لا تَکُنْ لساناً

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ
موقع ہے اخیر فکرِ انجام کا یہ
بس حبِ وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

۱۳۰ - ذلیل زندگی موت سے بدتر ہے

نکبت میں ہے رنج و غم، خوشی سے اولیٰ
رونا یاروں کا ہے ہنسی سے اولیٰ

ہیں دیس میں بے وقار، پردیس میں خوار[1]
مرنا ہے بس ایسی زندگی سے اولیٰ

۱۳۱ - قدرِ نعمت بعدِ زوال

دو چار اگر ہیں کام کرنے والے
ہیں اُن کو ہزاروں نام دھرنے والے
تب قوم کی شاید کہ کھلیں گی آنکھیں
مر جائیں گے جب قوم پہ مرنے والے

۱۳۲ - قومی خدمت کا صلہ

کہہ دو جنھیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ
طعنے جھیلو، برا سنو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سرِ دست
گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ!

۱۳۳ - مصلحت کی بات مانی لازم ہے

گر پیر مغاں کہے "مریز و کج دار"
ہے مصلحت اس میں کچھ نہ کچھ اسے بے خوار
ہوتا نہ مساکین کا گر خیر اندیش
خضر اُن کا نہ توڑتا سفینہ زنہار[2]

۱۳۴ - انصاف کی پکار

پاؤ گے نہ کوئی قاف سے لے تا قاف
حق تلفیوں کے دل میں نہ ہوں جس کے شگاف

۱- رباعیات حالی (صفحہ ۱۴۱):
"ہیں دیس بے وقار - پردیس میں خوار" (مرتب)
۲ - قرآنی تلمیح - حضرت خضر نے کشتیِ مسکیں میں سوراخ کر دیا تھا تاکہ ظالم حاکم اسے اپنے تصرف میں نہ لائے۔

گر غور سے سنیے، غل ہے یہی چار طرف
انصاف ! انصاف !! آہ انصاف انصاف !!

۱۳۵ - خود اعتمادی

آترو دریا سے اپنے بل تیر کے پار
کب تک تیرو گے ہو کے تونبوں پہ سوار
تم ڈوبنے کے یہ کر رہے ہو ساماں
اوروں کا سہارا تکنے والو ہشیار !

۱۳۶ - پیری میں نفس کا اغوا کرنا

پیری میں نہ عقل چین لینے دیتی
کرتا رہتا نہ دل کو گر نفس قوی
کہتا ہے یہ، جب موت کا آتا ہے خیال
بابا 'کے آمدی و کے پیر شدی'

۱۳۷ - مردہ اور زندہ اقوام کا فرق

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں
چونک اٹھتے ہیں اک 'ہاں' پہ وہاں پیرو جواں[1]
کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں وہ کام
جو کام اک کارتوں کرتا ہے وہاں

۱۳۸ - نفس کی خواہشیں دولت کی دشمن ہیں

یا نفس کی خواہشوں کو روک اے زردار
یا فاقہ و فقر کے لیے رہ تیار
لاگے ہوئے ہیں چار طرف گھات میں چور
گھر سے ہشیار ! مال و زر سے ہشیار !

۱- رباعیات حالی (صفحہ ۱۴۸) میں یہ مصرع یوں درج ہے:
"چونک اٹھتا ہے ایک ہاں پہ وہاں پیر و جواں"
لیکن وزن پورا کرنے کے لیے ایک کی 'ے' یا وہاں کی 'ہ' کو حذف کرنا ضروری ہے۔ (مرتب)

۱۳۹ - دنیا کی بے ثباتی

گھر بار اپنا ہے اور نہ دولت اپنی
کنبا اپنا ، نہ ہے قرابت اپنی
اپنی نہیں کوئی چیز ، یاں دو کے سوا
اک موت اپنی ہے ، ایک تربت اپنی[1]

۱۴۰ - تشنگیِ طلب

ساقی ! اے سب کے کام آنے والے
خم اپنے پرائے پہ لنڈھانے والے
چھینٹا اک ادھر بھی بادۂ گلگوں کا
او تشنہ لبوں کی دوں بجھانے والے

۱۴۱ - حسن کا تسلط

ہے حسن کا یہ کرشمہ ، چشم بددور
عشاق کی بے خودی ، حسینوں کا غرور
یہ وہ مئے تند ہے نشے میں جس کے
عاشق بھی ہے چور اور معشوق بھی چور

۱۴۲ - علم کی ترقی کا نتیجہ

بڑھتا جاتا ہے جس قدر علم بشر
کرتے جاتے ہیں شک خیالات میں گھر
ہوتی جاتی ہے دھندلی اتنی ہی فضا
جتنی کہ وسیع ہوتی جاتی ہے نظر

۱- رباعیات حالی (صفحہ ۱۵۰) میں تیسرے مصرعے میں 'یاں' کی جگہ 'یہاں' اور چوتھے مصرعے میں 'اک موت' کی جگہ 'ایک موت' درج ہے ، لیکن اس صورت میں دونوں مصرعے وزن سے خارج ہو گئے - (مرتب)

۱۴۳ - دنیا سراسر شر ہے

دنیا ہے وہ شر جس میں نہیں نام کو خیر
رشتہ ہے بدی سے اُس کا نیکی سے ہے بیر
اور سب سے بڑا یہ عیب ہے اس میں کہ آہ
سرتی نہیں یاں کسی طرح اُس کے بغیر

۱۴۴ - تَخَلَّقُوا بِاَخْلاقِ اللہ

ہے عام بد و نیک پہ حق کی رحمت
پہنچاتا ہے رزق سب کو وہ بے منت
تم بھی یونہی رکھو سب سے یکساں برتاؤ
بندے جس کے ہو اس کی سیکھو عادت

۱۴۵ - عقلِ خودبیں

ہے عازمِ راہِ دور عقلِ خودبیں
آگے مگر اپنی حد سے بڑھ سکتی نہیں
ہے شیش محل میں بند گویا کہ مگس
جب اُڑتی ہے رہ جاتی ہے ٹکرا کے وہیں

۱۴۶ - در شانِ انیس لکھنوی

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیس
ور لکھنؤ کا انجمن آرا تھا انیس
دلی تھی جڑ اس کی لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کا ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

۱۴۷ - ایضاً

اُردو کو راج چار سُو تیرا ہے
شہروں میں رواج کُو بہ کُو تیرا ہے

منسوب ہے لکھنؤ سے جب تک کہ انیس[1]
تو لکھنؤ کی ہے، لکھنؤ تیرا ہے

۱۴۸ - ایضاً

اُردو کو انیس نے گراں قدر کیا
پائیں سے اٹھا کے لائق صدر کیا
قوت جو نہاں تھی اس میں دی سب کو دکھا
دانے کو شجر، ہلال کو بدر کیا

۱۴۹ - محسن الملک کی وفات پر

ہیہات وہ تعلیم کا حامی مہدی
سید کا وصی، قوم کا ہادی مہدی
برسوں یہ صدا رہے گی کالج میں بلند
مہدی! مہدی! دریغ، مہدی! مہدی!

۱۵۰ - ایضاً

مر کر **مہدی** نے زندگانی پائی[2]
جی کھو کے جزائے جاں فشانی پائی
زندہ تھے تو چند روزہ مہماں تھے یہاں
جب مر گئے، عمر جاودانی پائی

۱۵۱ - ایضاً

بے عذر ہر ایک کام انجام دیا
تھکنے کا نہ بھول کر کبھی نام لیا

---

۱ - یہ مصرع عام طور پر یوں مشہور ہے:
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی
لیکن مرتب رباعیات حالی نے مولانا حالی کے قلمی مسودے سے اسے نقل کیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ مولانا نے نظر ثانی کے وقت مصرعے کو بدل دیا تھا۔ (مرتب)

۲ - رباعیات حالی میں 'زندگانی پائی' کی جگہ 'زندگی پائی' درج ہے جس سے یہ مصرع غیر موزوں ہو گیا۔ (مرتب)

جو کام پہ اس کے نکتہ چیں تھے شب و روز
دی جان انھی کے کام میں ، کام کیا

۱۵۱ - ایضاً

مہدی کے گئی نہ دل سے کالج کی لگن
یاں تک کہ ہوا اس کے کفن زیب بدن
پورا کیا جیسے **پال** نے دین مسیح
اس نے یونہی پورا کیا **سید** کا مشن

۱۵۳ - ایضاً

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا
خدمت کے لیے قوم کی ، مر مر کے جیا
پیری ہوئی سد راہ اس کی ، نہ مرض
صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

۱۵۴ - ایضاً

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر
غل علم کا برہما میں مچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی
واں آب حیات اُن کو پلایا جا کر[1]

۱۵۵ - ایضاً

پیری میں جوانوں کو کیا مات اُس نے
آرام پہ اپنے مار دی لات اُس نے
تدبیر سے، محنت سے، دکھا دی سب کو
کالج کی ترقی میں کرامات اُس نے

---

۱ - رباعیات حالی (صفحہ ۱۶۵) میں یہ مصرع یوں درج ہے :
وہاں آب حیات ان کو پلایا جا کر (مرتب)

۱۵۶ - ایضاً

جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں
خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کوچے میں
یوں رہتے ہیں، یوں جیتے ہیں، یوں مرتے ہیں

۱۵۷ - روزنامۂ ہمدرد دہلی کا اجرا

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب
اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یا رب
ہمدرد کو اسم بامسمیٰ کیجو!
اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب

۱۵۸ - ہنگامۂ مسجد کان پور

یاران وطن نے قوم کا ساتھ دیا
دی قوم نے دادِ قوم بے رو و ریا
ہر سو بھڑک اٹھی آگ ہمدردی کی
ہنگامۂ کان پور نے کام کیا

۱۵۹ - ایضاً

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا
گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے
جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا

۱۶۰ - ایضاً

تائید میں حق کے جو بلا آتی ہے
ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے
روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

★★★

فصل سوم

قصائد و منظومات مدحیہ ، سپاسیہ و وداعیہ وغیرہ

(ا) قصائد

★

۱ - قصیدۂ نعتیہ[1]

(۱۲۸۱ھ مطابق ۶۵-۱۸۶۴ع)

بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے
وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں
عداوت اس کی عذاب الیم جاں کے لیے
وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام
محبت اس کی حصار حصیں اماں کے لیے
وہ چاند جس سے ہوئی ظلمت جہاں معدوم
رہا نہ تفرقۂ روز و شب زماں کے لیے
وہ پھول جس سے ہوئی سعیِ باغباں مشکور
رہی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کے لیے
ہلال مکے کا، ماہِ دو ہفتہ یثرب کا
فروغ قوم کے اور شمع دودماں کے لیے
گھر اس کا مورد قرآن و مہبط جبریل
در اس کا کعبۂ مقصود انس و جاں کے لیے

---

۱ - یہ قصیدہ ۱۲۸۱ھ یا ۱۲۸۲ھ کا لکھا ہوا ہے - اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا - اس کو اپنی قدیم شاعری کا نمونہ سمجھ کر بدستور سابق رہنے دیا ہے، کہیں کچھ تصرف نہیں کیا گیا - (حالی)

سپہر گرم طواف اس کی بارگاہ کے گرد
زمین سربسجود اس کے آستاں کے لیے
وہ لحظہ لحظہ تفقد وہ دم بدم الطاف
رضائے خاطرِ یارانِ جاں فشاں کے لیے
وہ گونہ گونہ مدارا وہ بات بات میں مہر
کشایشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لیے
گہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے
گہ انکسار مدارات میہماں کے لیے
کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لیے
صفائے قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ
دعائے خیر بداندیش و بدگماں کے لیے
کہیں مقدمۃ الجیش[1] انبیا و رسل
کہیں وہ خاتمۃ الباب[2] داستاں کے لیے
مدینہ مرجع و ماوائے اہلِ مکہ ہوا
مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیے
اسی شرف کے طلب گار تھے کلیم و مسیح
نوید امتِ پیغمبرِ زماں کے لیے
بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہ زن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لیے
شفیع خلق سراسر خدا کی رحمت ہے
بشارت امت عاصی و ناتواں کے لیے

---

۱ - لشکر کا اگلا حصہ -

۲ - خاتمہ ، آخری حصہ ، آنحضرت سب سے پہلے پید ہوئے تھے اور سب سے آخر میں مبعوث ہوئے۔

شفاعت نبوی ہے وہ برقِ عصیاں سوز
کہ حکم خس ہے جہاں کفر دو جہاں کے لیے
خدا کی ذات کریم اور نبی کا خلق عظیم
گنہ کریں تو کریں رخصت انس و جاں کے لیے
اسی کا دیں ہے کہ ہے گلشنِ ہمیشہ بہار
وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لیے
عبور لجۂ عصیاں سے کس طرح ہو اگر
وہ نا خدا نہ ہو اس بحرِ بےکراں کے لیے
مریض حرص و ہوا پائے کب شفا جب تک
وہ چارہ گر نہ ہو اس درد جاں ستاں کے لیے
نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام ولب میں سکت
حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیے
ارادہ عرش پہ اک آن میں پہنچنے کا
کیا تھا عزم اولوالعزم نے کہاں کے لیے
کرم کا دیکھیے دامن کہاں تلک ہو فراخ
ہو میزبان خدا جب کہ میہماں کے لیے
زمیں پہ ٹھہرا ہے ماوائے شاہِ عرش نشیں
رہی نہ اب کوئی فوقیت آسماں کے لیے
اسی سے ہوتا ہے ظاہر عیار استعداد
محک ہے حبِّ نبی دل کے امتحاں کے لیے
اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربت مرگ
پیوں نہ آب بقا عمر جاوداں کے لیے
اگر بقیع[1] میں گز بھر زمیں میسر آئے
کروں نہ طولِ امل روضۂ جناں کے لیے

---

۱ ۔ جنت البقیع : مدینۂ منورہ کا مبارک قبرستان ۔

سمایا اس کا جو نقش قدم تصور میں
ہجوم شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے

حریف نعت پیمبر نہیں سخن **حالی**
کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لیے

نبی کا نام ہو ورد زباں، رہے جب تک
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

★

۲ - قصیدۂ نعتیہ[1]

(۸۸ - ۱۲۸۷ھ مطابق ۷۱ - ۱۸۷۰ء)

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور
مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور

خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور

---

۱ - اس قصیدے کی تمہید ۱۲۸۷ھ یا ۱۲۸۸ھ (مطابق ۷۱ - ۱۸۷۰ء) کے ہذیانات میں سے ہے - یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے - مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے - انھی دنوں میں سیتا رام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا - مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھی گئیں - جن لوگوں کی جا و بے جا تحسین و آفریں سے دماغ میں خلل آ گیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرے میں نہ آئے - بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعر ان لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدرداں سمجھتا ہے - اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی - مطلب یہ تھا کہ اگر یہ لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیوں کہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح آج کل

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے
میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنو اہل عصر میں مجھ کو
میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
چشمۂ آب خضر کی مانند
چشم اہل جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثل یوسف دکھائے جوہر ذات
جس کو بکنا ہو مفت یاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر
ہوں زمانے کے ہاتھ سے مجبور
کبک و قمری کو رخصت پرواز
بال و پر مفت صعوہ و عصفور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور
لذت مے سے جو نہ ہو آگاہ
اس کو کیا قدر خوشۂ انگور
جس کے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روز روشن ہے یا شب دیجور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے)

تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعے سے ہوتی ہے اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے۔ لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعۃً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا لہٰذا قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تا کہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔ (حالی)

پہلے ہوگی کسی کو قدر ہنر
اٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور

درد دل کا بیاں کروں کس سے
بات کھونی نہیں مجھے منظور

سخن حق کی داد لوں کس سے
سن چکا ہوں فسانۂ منصور

دلِ آبادِ مفتِ بے ہنراں
ہو چکا خانۂ ہنر معمور

مژدہ خسرو کو وصل شیریں کا
ہوچکی سعیِ کوہکن مشکور

ہم نے دیکھی تمیز اہل نظر
ہم نے دیکھا مذاق اہل شعور

ہے غرض ان کو صوت موزوں سے
نالۂ دل ہو یا نوائے طیور

ہو کسی شے سے ان کی گرمیِ بزم
داستاں ہو وہ یا کہ درس زبور

ہے فقط روشنی سے ان کو کام
موم ہو اصل شمع یا کافور

ہے یہاں قائلِ انا مردود
ہو وہ فرعون وقت یا منصور

آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ
دل اصحاب گو نہ ہو مسرور

یاں اگر کام ہے تو شیریں سے
قصر خسرو کے اور ہیں مزدور

دلِ احباب پر نہیں چلتا
سحر میرا کہ رہیو غیر سے دور

ہوں تماشاے شہرِ نابینا
ہے برابر مرا خفا و ظہور

در یکتا ہوں اور ہوں بے آب
ماہِ کامل ہوں اور ہوں بے نور

چشمہ پیدا و کارواں تشنہ
بادہ پرزور و انجمن مخمور

اس زمانے میں وہ غریب ہوں میں
جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور

صاحب قدر و جاہ ہے جب تک
کارفرما ہے چین میں فغفور

کاش اس عہد میں مجھے پاتے
تھا سخن جب کہ قبلۂ جمہور

کاش واں دیکھتے مجھے کہ جہاں
متنبی[1] تھا مادحِ کافور

کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپور

کون دیکھے مرے چمن کی بہار
مر گیا عندلیبِ نیشاپور[2]

---

۱ - متنبی عربی کا مشہور شاعر ہے - کافور حبشی والیِ مصر کی ایک مدت تک مدح کرتا رہا - آخر اس سے ناراض ہو کر چلا گیا اور وہ وہ ہجویں لکھیں کہ حیا اُن کے تصور سے بھی آنکھیں بند کر لیتی ہے -

۲ - عندلیب نیشاپور سے مراد نظیری ہے لیکن اگر وہ ہوتا تو اس سے زیادہ اور کیا قدر کرتا جیسا کہ شیخ علی حزین نے سودا کی نسبت کہا تھا کہ در پوچ گویان ہند غنیمت است - (حالی)

جس سے ہوتا ہے خستہ سینۂ ہوش
ہے زباں میری وہ دمِ ساطور

جس سے ہوتا ہے کور پروانہ
ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور

شرح نقطے کی گر کروں تحریر
تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور

ترکِ عشقِ بتاں کریں عشاق
مجھ سے سن پائیں گر ستایش حور

گر کروں ذکرِ لذتِ طاعات
تلخ کر دوں مذاق فسق و فجور

چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد
دل خسرو میں ڈال دوں ناسور

کرنے جاؤں جو حق سے عذر گناہ
لے کے آؤں نوید عفو قصور

لوں ملائک سے داد حسن کلام
گر لکھوں نعت سرور جمہور

وہ شہنشاہ، آستی جس کا
یاں گنہگار اور واں مغفور

وہ خداوند، خدمتی جس کا
یاں سبک سار اور واں ماجور

مژدہ اے امت ضعیف کہ یاں
سعی ہوتی ہے بے کیے مشکور

لبِ شیریں کلام سے اس کے
دوست بھی شاد غیر بھی مسرور

اثرِ فیضِ عام سے اس کے
کعبہ آباد ہے کدہ معمور

چرخ کو دے اگر وہ حکم سکوں
ہو غلط نسخۂ سنین و شہور

صرصرِ قہر گر چلے اس کی
بند ہو مسلکِ صبا و دبور

جس طرف ہو وہ گرمِ نظارہ
جلوہ گر ہو ادھر سے لمعۂ طور

ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن
موج زن ہو وہاں سے چشمۂ نور

بات پوچھو تو سوے چرخ نگاہ
سینہ دیکھو تو علم کا گنجور

ہو سکے اس کی خوبیوں کا شمار
نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور

اے ترا پایہ فہم سے برتر
اے ترا نام عرش پر مسطور

میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں
نام تیرا شفیعِ روزِ نشور

کچھ نہیں زاد راہ پاس اپنے
مگر امیدِ عفوِ ربِ غفور

طبع غالب ہے اور میں مغلوب
نفس قاہر ہے اور میں مقہور

بحر غفلت میں ہوں سراسر غرق
نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور

چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن
ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

مہر فرزند و خواہش زر و سیم
طمع جاہ و فکرِ عیش و سرور

ایک بیمار اور سو آزار
ایک رنجور اور سو ناسور

نفسِ امارہ اور دیوِ مرید
یہ ہے افعی تو وہ ہے کلب عقور

مجھ سے جو کام چاہیے لیجے
جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور

حسد و بغض و غیبت و بہتان
بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور

ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی
ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہو مامور

دل لگے بندگی میں کیا امکاں
لب ہلے ذکر حق میں کیا مذکور

مایۂ عقل ہے نہ شور جنوں
دلِ بیتاب ہے نہ جانِ صبور

نہ معاصی میں تلخیِ خجلت
نہ عبادت میں چاشنیِ حضور

فی المثل ہے مری مسلمانی
جیسے زنگی کا نام ہو کافور

ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے
تیرے زمرے میں گر ہوا محشور

جب ترے کارواں میں جا پہنچا
پھر رہا باب خلد کتنی دور
دوریِ آستانِ والا سے
ہے بہت تنگ حالیِ مہجور
اب دعا یہ ہے اے شفیع امم
بس کہ بیتاب ہے دلِ رنجور
جا لگے تیرے در پہ کشتیِ عمر
جب کروں بحر زندگی سے عبور
جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

★

۳ - قصیدۂ مدحیہ نا تمام[1]

نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کی شان میں
(۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ع)

ظل حق کلب علی خاں جس کے بذل و جود پر
ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا
صاحب علم و عمل اور تابع احکام دیں
زائرِ قبرِ نبی اور حاجیِ بیت الہدیٰ

---

۱ - یہ قصیدہ ۱۲۹۱ھ میں اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ نواب ممدوح ، علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے اور بارہ سو روپے سال کی جاگیر ہمیشہ کے لیے مدرسے کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپے نقد بطور چندہ کے دے چکے تھے - مگر مصلحتاً ان کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لیے ناتمام رہا - اس کے اول و آخر کے کچھ اشعار ضائع بھی ہو گئے ہیں - (حالی)

شاعری میں فرد ، موسیقی میں فارابی عصر[1]
صوت ، روح افزا و صورت ، آیۂ صنع خدا
دولت برطانیہ پر اس کی فرزندی کا حق
دولت عثمانیہ کو اس سے پیوندِ ولا
اس کی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس
اور مروت پر ہیں نازاں مجرم و اہل خطا
مرجع ارباب علم و فن ہے اس کا باب فیض
ق (۱) یہ وہ دعویٰ ہے کہ خود دربار ہے اس کا گوا
کل زمینِ ہند میں تھے جو درخت بارور
ان کو چن چن کر یہاں لایا چمن بندِ سخا (۲)
گر مُناظر ہیں تو ہیں سر دفترِ اہل کلام
(۳) اور محدث ہیں تو ہیں سرچشمۂ علم و ہدیٰ
زمرۂ اہلِ یقیں یا مجمعِ اہلِ سلوک
نکتہ چینانِ مجسطی[2] خردہ گیرانِ شفا[3] (۴)
شاعرِ شیریں نفس یا شاطر سنجیدہ رائے
(۵) فیلسوفِ مستدل یا عارفِ علت ربا
بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اس باغ میں
بلبلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا (۶)
بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلادِ دور دست
اے خوشا وہ سرزمیں جس پر ہو تو فرماں روا

---

۱ - حکیم ابو نصر فارابی (متوفی ۸۷۳ع) ، مشہور عالم اور فلسفی ، ''معلم ثانی'' ، مختلف علوم پر ایک سو سے زاید کتابوں کا مصنف ۔

۲ - حکیم بطلیموس کی مشہور کتاب جس کا ترجمہ محقق طوسی نے کیا تھا ۔

۳ - ابن سینا کی تصنیف 'الشفا' جو طبیعیات ، مابعدالطبیعیات اور ریاضیات کی قاموس ہے اور اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہے ۔

بار محصولات سے یاں تک ہوئی ہلکی کہ اب
بار منت سے ترے پشت رعیت ہے دوتا

خیر تیری ہے حصار عافیت تیرے لیے
سیر ہو کر تجھ کو دیتے ہیں بہت بھوکے دعا

نعمتیں حق کی نہ سمٹیں گی سمیٹی زینہار
ہر بھلائی کی ملی دہ چند گر تجھ کو جزا

خوان نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم
نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ[1] کا

ہے یقیں تجھ پر پڑے اصحاب محشر کی نگاہ
جب کہیں کس نے کیا حق میزبانی کا ادا

دولت و اقبال روز افزوں سے ہے تیری عیاں
جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا

پرورش پاتی تھی جن کے سایۂ دولت میں قوم
لے گئی ان کو بہا کر موجِ سیلابِ فنا

کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر
ہند میں اب تکیہ‌گاہِ امتِ خیرالوریٰ

یہ اگر بنتے نہ کشتی بان اس طوفان میں
کشتیِ اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا

رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل
ورنہ ان کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا

مل گئے تھے گوہرِ درجِ شرافت خاک میں
خاک سے تونے اٹھایا ان کو اور بخشی جلا

---

۱ - حضرت ابراہیم کا دستر خوان - کہتے ہیں کہ انھوں نے مہمان کے بغیر کبھی کھانا نہیں کھایا -

ہو رہے تھے دودمان علم و دولت جاں بہ لب
تو نے اک اک کے چوایا حلق میں آب بقا

کول[1] میں پودا لگا ہے جو پے تہذیب یہ
آبیاری سے ہے تیری ہی اسے نشو و نما

ہے یہ وہ احسان جس کے بار منت سے کبھی
قوم کی گردن نہ ہلکی ہوگی بے رو و ریا

تیرے ظل تربیت میں گر رہا یہ نونہال
ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اس کی طوبیٰ سے سوا

فرض اگر کیجے اسے دیوار کاخ آرزو
تو وہ پشتی باں ہے جس سے اس کی قائم ہے بنا

اور اگر کہیے کہ ہے یہ قوم کی کشتِ مراد
تو ہے اس پر ابر رحمت کی طرح چھایا ہوا

★

۴ - قصیدہ ناتمام[2]

سر سید احمد خاں کی شان میں
(۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۴ع)

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ ورنہ یاں سے کب کا نکل گیا ہے

---

۱ - علی گڑھ کا پرانا نام۔
۲ - یہ قصیدہ اس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب کہ مدرسۃ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سر سید کے کام تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے - مگر بسبب مکروہات دنیوی کے پورا نہ ہو سکا۔ (حالی)

اس پر بھی اے عزیزو! ہے جائے فخر تم کو
دینوں میں دین بیضا حق نے تمھیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمھارا جو گھر ہے سب سے پہلا
ہادی ہے وہ تمھارا جو ختمِ انبیا ہے

دی ہے وہ مصلح کل حق نے کتاب تم کو
جس نے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے

بخشی تمھیں حکومت حکمت تمھیں عطا کی
دوراں سدا موافق تم سے نہیں رہا ہے

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کی گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

درہم سے اور قلم سے، دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اس نے وہ کس سے ہو سکا ہے[1]

ہمدرد قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا
یہ درد اس کو جد کی میراث میں ملا ہے

تعلیم کی تمھاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

بعد از قرون اولیٰ کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے

★

۱- یہ شعر دیوان کے پہلے ایڈیشن (۱۸۹۳ع) اور الناظر ایڈیشن میں موجود ہے، لیکن طبع سوم اور دیگر نسخوں میں چھپنے سے رہ گیا - (مرتب)

۵ - جشن جوبلی[1]

(۱۸۸۷ع)

ہے عید یہ کس جشن کی یا رب کہ سراسر
ہے جوبلی ہی جوبلی ایک اک کی زباں پر
یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب
ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دورِ تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف
وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر
جمشید پہ جب آگ ہوئی سنگ سے ظاہر
ایراں میں کیا جشن سدہ اس نے مقرر
اس عہد ہمایوں میں ہزار ایسے کرشمے
ظاہر ہوئے اس طرح کہ عقلیں ہوئی ششدر
یہ جشن مبارک ہے بہت جشن سدہ سے
وہ آگ نکلنے کا یہ بجھنے کا ہے مظہر
اس دور خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے
تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھ کر
اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع
جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر
بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب
جو لوگ روا رکھتے تھے خوں ریزیِ دختر

---

۱ - جشن جوبلی کے موقع پر مولانا حالی ایچیسن کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ کے اتالیق تھے - یہ قصیدہ انجمن اسلامیہ لاہور کی طرف سے ایک سپاس نامے کے ساتھ ملکہ وکٹوریا کے حضور میں پیش کیا گیا تھا - (مرتب)

جب بیٹیوں نے زندگی اس طرح سے پائی
دی زندگی اک اور انہیں علم پڑھا کر
اس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت
انساں کو نہ سمجھا کسی انسان نے کم تر
دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہد کہن پر
نابود کیا اس نے زمانے سے ٹھگی کو
اک قہر تھا اللہ کا جو نوع بشر پر
اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ
مظلوم نہ اب بیل نہ گھوڑا ہے نہ خچر

اے نازش برطانیہ اے فخر برنزک
اے ہند کے گلے کی شباں، ہند کی قیصر
سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا
محمود نہ تیمور نہ دارا نہ سکندر
تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا
اور تو نے کیا ہے دل عالم کو مسخر
بند اپنے فرائض میں مسلماں ہیں نہ ہندو
معمور مساجد ہیں تو آباد ہیں مندر
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا
سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

گو منت قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار
احساں مگر اسلام پہ اس کے ہیں گراں تر
معلوم ہے جو موروں پہ اسپین میں گزری
جس وقت ازابیلا ہوئی واں صاحب افسر

حالت وہی اس ملک میں پہنچی تھی ہماری
گڑتا نہ اگر اس کا نشان ہند میں آ کر

اب ہند میں کشمیر سے تا راس کماری
ہر قوم کے ہیں پیر و جواں متفق اس پر
اُمید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو
راحت کی کسی سایے میں جز سایۂ قیصر

گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر
کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر
ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک
آزادی و انصاف حکومت کے ہیں ہرجو
قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

★

۶ - قصیدہ

تہنیت عیدالفطر

بہ جناب نواب سر آسمان جاہ مدارالمہام سرکار عالی

(۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ع)

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا
خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا
کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
کہ اپنے صبر کا انعام ہم نے بھر پایا
رہینِ منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام
کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا
گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا

شگفتہ آتے ہیں اس طرح عیدگاہ سے لوگ
کہ گنج انھوں نے ہے گویا خرابے میں پایا

حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج
کہ دن خدا نے نمایش کا ان کو دکھلایا

عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا

حکیم ہیں متفکر نہ زاہد افسردہ
خوشی نے دی ہے زمانے کی کچھ پلٹ کایا

غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کھال میں مست
ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چھکوایا

ادھر ہے فصل بہار اور ادھر ہے عیدالفطر
سماں نشاط کا ہے شہر و دشت پر چھایا

کھلے ہیں اس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول
جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہے کمھلایا

ہزاروں سرو خراماں ہیں شہر میں ہر سو
جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مرجھایا

اگر خوشی کا زمانے کی ہے یہی عالم
تو سمجھو غم کا عوض غم‌زدوں نے بھرپایا

مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب ہیچ
اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اترایا

فریفتہ ہوئے جو ایسی خوشیوں پر
انھوں نے آب کا دھوکا سراب پر کھایا

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی اُن کی
جنھوں نے خلق میں ذکر جمیل پھیلایا

جنھوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
جنھوں نے علم کا بجھتا چراغ اکسایا
جنھوں نے ملک کے امراض کو کیا تشخیص
جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا
جنھوں نے خُلق سے اپنا بنایا غیروں کو
جنھوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا
خبر مریضوں کی لی، جاہلوں کو دی تعلیم
کھلایا بھوکوں کو، بے پوششوں کو پہنایا
ہوا زمین پہ جس سال آسماں ممسک
مینہ اپنی داد و دہش کا انھوں نے برسایا
ہوائے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد
فضائے دہر کو خُلق حَسن سے مہکایا
سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار
لیا سنبھال اسے جس نے ہاتھ پکڑایا
ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا
نہ مانگ سکتے تھے جو اُن کے گھر پہ پہنچایا
نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھ کر
انھوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا
نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے
ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا
وغا میں شیر مگر وقت رحم مور ضعیف
کسی کی آہ سنی اور دل ان کا بھر آیا
وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج
جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا

وہ چونک اٹھے کہ گویا قیامت آ پہنچی
جو در پہ آ کے کوئی داد خواہ چلایا

نشاط و عشرت جاوید کی ہے ان کو نوید
دل ایسا جن کو عنایت خدا نے فرمایا

سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف
سو آنکھ سے وہ وزیر دکن نے دکھلایا

بشیر دولت و دیں، صدر اعظم امرا
نہیں ہے جس کا کوئی قرب شہ میں ہم پایا

جو ظل‌حق ہے رعیت کے سر پہ شاہ دکن
تو اعظم‌الامرا ظل‌حق کا ہے سایا

ہمیشہ جس کو ہے بہبود ملک مدّ نظر
رفاہ و امن ممالک میں جس نے پھیلایا

اٹھایا فتنے نے جب سر فرو کیا اس کو
پڑا عمل میں جہاں عقدہ اس کو سلجھایا

بنائے نظم و نسق جس نے رکھی شوریٰ پر
مشیر کار خرد پروروں کو ٹھہرایا

دکن کو جس نے کیا مرجع خواص و عوام
دکن کا جس نے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا

نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرماں
جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا

بل انتظام کے رشتے میں پڑ رہے تھے بہت
سو تکلے کی طرح اک ایک بل نکلوایا

لگا گئے تھے وزیران رفتہ جو پودا
وہ صاحبی میں وزیر زماں کی پھل لایا

ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے بلدے[1] نے
کہ اپنی حالت پیشیں سے خود ہے شرمایا
زمانِ حال سے ماضی کو دیجیے کیا نسبت
اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا
خدا دراز کرے عمر اعظم الامرا
دکن کو جس کی حکومت نے دن یہ دکھلایا
زمیں پہ سایہ فگن جب تک آسماں رہے
رہے دکن پہ حضور نظام کا سایا
تھی کوئی چیز نہ **حالی** کے پاس لائق نذر
سو یہ چگامہ ناچیز پیش کش لایا
یہی بس اس کے لیے ہوگا مایۂ نازش
جو اعظم الامرا نے قبول فرمایا

★

۷ - قصیدہ[2]

در شکر و سپاس نظام دکن و اعیان سلطنت
(۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ع)

اے صفر کی دوسری روز دوشنبہ مرحبا
ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبح جاں فزا
ہم نے رکھا آ کے جب بلدے کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

۱ - بلدہ : شہر ، مراد حیدر آباد دکن ۔

۲ - یہ قصیدہ ماہ ستمبر ۱۸۹۱ع مطابق صفر ۱۳۰۹ھ میں بمقام حیدر آباد دکن جب کہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مع اکثر رفقا کے جن میں سے ایک راقم بھی تھا ، بطور ڈیپوٹیشن کے محمڈن کالج علی گڑھ کی طرف سے حضور سرکار نظام میں حاضر ہوئے تھے ، ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا جس کے صدر انجمن جناب نواب وقار الامرا بہادر تھے۔ (حالی)

عزت قومی ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے
اس کے کچھ آثار دیکھے ہم نے یاں شکر خدا
کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم
آ کے بلدے کے سوانے[1] میں لگا اس کا پتا
بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گلے میں در بہ در دیتے صدا
پہنچے لینے ان کو وہ اعیان دارالملک سے
دولت عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا
قوم کو ہے جن پہ فخر اور ملک کو ہے جن پہ ناز
سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قوی
صدر اعظم نے ہمیں بخشا اقامت کے لیے
وہ سرابستاں خجل ہو جس سے جنت کی فضا
ہم غریبوں کو سمجھ کر اک سفارت قوم کی
دی وہ عزت شکر جس کا ہو نہیں سکتا ادا
پیشتر مہماں‌نوازی کا فقط سنتے تھے نام
آ کے یاں سمجھے کہ ہے مہماں‌نوازی چیز کیا
کی ہے نواب اقتدارالملک نے جو مرحمت
اس نے کلفت کو سفر کی دل سے بالکل دھو دیا
یہ مقولہ ہند میں مدت سے ہے ضرب المثل
جو کہ جا پہنچا دکن میں بس وہیں کا ہو رہا
ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری
جو دکن میں آ کے دیتی ہے وطن دل سے بھلا
وارث ملک دکن ہے آج وہ محبوب خلق
نام پر دیتا ہے جس کے جان ہر چھوٹا بڑا

---

۱ - حد، کنارہ، منڈیر۔

ہم کہ ہیں وکٹوریا کے عہد رافت میں پلے
امن و آزادی کی ہم نے کھائی ہے برسوں ہوا
جانتے ہیں ہم کہ پلتی ہے رعیت کس طرح
کس طرح ہوتے ہیں مقبول جہاں فرماں‌روا
کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیر قلوب
کس طرح بوتے ہیں دل میں خلق کے تخم وفا
کر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر
تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اس نے ادا
ہے یہی شاہ دکن کی گلہ بانی کی دلیل
گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا
پوچھنے گچھنے کی اہل ملک سے حاجت نہیں
ان کی خوش‌حالی پہ ان کی تازہ روئی ہے گوا
دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار
خلق کو سرسبز دیکھا آ کے یاں ان سے سوا
راہ میں دیکھے تھے ہم نے کوہ اگر گردوں شکوہ
آ کے دارالملک میں دیکھے محل گردوں نما[1]
عاملوں کی سخت‌گیری سے ہیں سب آزاد یاں
بے‌نوا سے منعم اور منعم سے بڑھ کر بے‌نوا
اغنیا میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں
جیسا بے پروا نظر آتا ہے یاں اک اک گدا
جتنی یاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول
بے تعصب ، بے تکلف ، بے تصنع ، بے ریا

---

۱ - یہ اشارہ ہے اس محل کی طرف جو کہ نواب وقارالامرا نے بلدۂ حیدر آباد کے باہر جانب جنوب پہاڑ پر زرخطیر صرف کرکے اپنے رہنے کے لیے بنوایا ہے اور اس کا نام فلک نما رکھا ہے - (حالی)

ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک
ایک کی تقریب میں ہمدم ہیں سب اور ہم نوا

دولت عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیے
ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یاں دوسرا

پارسی، ہندو، مسلماں یا مسیحی کوئی ہو
ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ہم کو یاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ
رہ گزر کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا

قصہ کوتہ بار جب ہم کو ملا دربار میں
کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا

دیکھ کر اپنی رسائی تخت آصف جاہ تک
واقعہ مُور اور سلیماں کا ہمیں یاد آ گیا

حضرت والا نے جس شفقت سے کیں نذریں قبول
اس پہ گر جاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہے بجا

جس توجہ سے سنی رودادِ قومی درس گاہ
شکر سے اس کے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برآ

جب سے کالج کی علی گڑھ میں بنا ڈالی گئی
دولت عالی مدد کرتی رہی اس کی سدا

جو لگایا تھا درخت اس کی ہمیشہ لی خبر
دم بہ دم پانی دیا یاں تک کہ بارآور ہوا

اب کہ وقت آ کر پڑا تھا بانیِ کالج پہ سخت
دولت عالی نے شرط دست گیری کی ادا

مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اول بحل
کی اسی دریا دلی سے ان کی پھر حاجت روا

خود علی گڑھ کالج اور اس کے در و دیوار سب
راگ گائیں گے سدا احسان آصف جاہ کا

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تلک اسلام کی
جیتے جی ہوں گی نہ اس کے طوق منت سے رہا

کی ہے سر سید نے جو کوشش فلاح قوم میں
اس کو ہے اے اہل مجلس اک زمانہ جانتا

پر یہ سر سید سے بیڑا پار ہونا تھا محال
دولت عالی اگر بنتی نہ اس کی ناخدا

تھا پڑا سید کا سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز
دولت عالی نے اس خشکی میں دی گنگا بہا

ہے روایت جب کہ ہجرت کر کے ختم المرسلیں
پہنچے یثرب میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

''جس طرح ہوتی ہے بانبی سانپ کی جائے پناہ
ہوگا ملجا اب مدینہ بھی یونہی اسلام کا،،

ہے بلا تشبیہ دارالملک آصف جاہ بھی
ہند میں اب مرکز اسلام بے رو و ریا

ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستاں میں انتخاب
دولت عالی نے چن چن کر لیا سب کو بلا

تربتیں اور خانقاہیں ، مدرسے اور مسجدیں
سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون و چرا

حج بیت اللہ سے جو ہر مسلماں پر ہے فرض
ہے دکن آنا مقدم شک نہیں اس میں ذرا

اول آنا چاہیے یاں استطاعت کے لیے
کیوں کہ ہے بے استطاعت حج کو جانا ناروا

خرچ سے ہاتھ اک مسلماں کا ہو گر اتر میں تنگ
ہے دکن کی سمت وہ گردن اٹھا کر دیکھتا
خواب آتے ہیں دکن کے اس کو سوتے میں نظر
قوم کا بچہ مڈل سے جب ذرا آگے بڑھا
ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہ خلق میں
اور مدد کو جن کی واں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا
چلتے چلتے ان کی گاڑی بھی اٹک جاتی ہے جب
کھینچنے کو اس کے جاتا ہے یہیں سے بینڈیا[1]
ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یارو وہ مثال
اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں بپا
تھا جہاز اک اس میں معمور اہل فضل و جاہ سے
لطمۂ امواج نے پرزے دیے اس کے اڑا
ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اُچھلے[2] نہ پھر
بچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست و پا
کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں ان کو نظر
اس محیط بے کراں میں ایک زورق کے سوا
ہے وہ زورق فی‌المثل سرکار آصف جاہ کی
ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جس کا آسرا
ہے دعا جس وقت تک پانی سمندر میں رہے
یا رب اس زورق کو تو موج حوادث سے بچا
ختم کر **حالی** سپاس صدر اعظم پر سخن
بال بال اپنا ہے جس کے شکر میں جکڑا ہوا

---

۱ - جب گاڑی یا چھکڑا دو بیلوں سے نہیں کھنچ سکتا تو بیلوں کی جوڑی کے آگے تیسرا بیل لگا دیتے ہیں ؛ اس کو بینڈیا کہتے ہیں - (حالی)

۲ - متداول نسخوں میں ''ابھرے نہ پھر'' چھپا ہے - (مرتب)

تقویت سے جس کی ہر مشکل ہماری حل ہوئی
انجمن کے منعقد ہونے کی دی جس نے رضا

پھر ادا کر جان و دل سے شکر صدر انجمن
جس کے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا

جس نے قومی انجمن میں بن کے صدر انجمن
قوم کو دی عزت اور ان کی امیدیں دیں بڑھا

لے کے اذن صدر مجلس کیجے پھر قصد وطن
ورنہ ہے **حالی** دکن کی دلفریب آب و ہوا

باندھ لیجے جلد اب رخت سفر ، ڈر ہے کہ ساتھ
قافلے سے چھٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

★

۸ - قصیدہ

در تہنیت حضور نظام دکن[۱]

(دسمبر ۱۹۰۵ع)

زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے شادمانی کا
فلک پیری میں دم بھرتا ہے ان روزوں جوانی کا

نظر آتی ہے بے جام و سبو سب خلق متوالی
ہوا میں نشہ ہے گویا شراب ارغوانی کا

نشاط انگیز ہیں ایام دے ، خورداد سے بڑھ کر
نہیں چلتا جہاں میں زور کچھ باد خزانی کا

نہ لے یاں رنج و غم کا بھول کر نام ان دنوں کوئی
کہ قبضہ ہے دکن پر آج عیش و کامرانی کا

---

۱ - یہ قصیدہ ۱۳۲۳ھ (مطابق دسمبر ۱۹۰۵ع) میں آصف جاہ سادس ، نواب میر محبوب علی خاں بہادر، والی حیدر آباد کے جشن سال گرہ چہل سالہ کے موقع پر لکھا گیا - (بحوالہ جواہرات حالی ، صفحہ ۹۸)

بہارِ جشنِ آصف جاہ سے گلزار ہے عالم
کرے کون انتظار اب فصل گل کی گل فشانی کا

خراماں ہیں ہزاروں سروقامت شہر و صحرا میں
جمے گا رنگ کیوں کر آج سر و بوستانی کا

معطر ہے جہاں مشک و عبیر بزم شاہی سے
بھرے باد بہاری دم نہ اب عنبر فشانی کا

الاپیں مطربوں کی جب سنیں چپ لگ گئی سب کو
بہت دعویٰ تھا مرغان چمن کو خوش بیانی کا

نئی دنیا ہے یا یہ کینچلی بدلی ہے دنیا نے
کوئی یاں آن کر دیکھے سنگار اس زال فانی کا

یہ ہے اس تاجور کی جوبلی کا جشن چل سالہ
کہ جو ہے ملک میں ملجئ اقاصی و ادانی کا

دعائے طول عمر شہ پہ ہاتھ اٹھیں نہ کیوں لاکھوں
کہ ذات اس کی نمونہ ہے خدا کی مہربانی کا

رعیت شاد ، ملک آباد اور آزاد ہر ملت
ادا حق کر دیا شاہ دکن نے حکمرانی کا

وہ رہتے ہیں سدا زندہ جو محبوب خلائق ہیں
نظام الملک کو مژدہ حیات جاودانی کا

کھلا اس کی رعیت پروری اور ملک داری سے
جہاں بانی حقیقت میں ہے نام اک گلہ بانی کا

گدا صبر و شکیبائی پہ اپنی پھر نہ ہو نازاں
کرے اندازہ گر شاہوں کے افکار نہانی کا

اُسے ہے فکر بس اپنے لیے نان شبینہ کی
مگر یاں سوچ اک عالم کی ہے راحت رسانی کا

کہاں آگاہ ہو گر حکمرانی کے فرائض سے
نہ بدلے حکمرانی سے تردد قلبہ رانی کا

ہر اک مذہب، ہر اک ملت سے ہے یکساں سلوک اس کا
کوئی گر سیکھ لے اس سے جہاں کی پاس بانی کا

تعصب ، اجنبیت ، اختلاف مذہب و ملت
نہیں کوئی مزاحم اس کے دریا کی روانی کا

جہاں ہے مستحق کوئی وہ ہے روزینہ خوار اس کا
دکن سے ہند تک چرچا ہے اس کی حق رسانی کا

توکل اور قناعت کے بھی دروازے کھلیں شاید
بہت پھیلا ہوا ہے خوان اس کی میزبانی کا

رہے گا ملک میں باقی نہ ہرگز بے ہنر کوئی
یہی انداز ہے یاں گر ہنر کی قدردانی کا

بنا ہے بلدہ خود دارالشفا اس عہد فرخ میں
یہ اک شمہ ہے آصف جاہ کی راحت رسانی کا

نہیں آصف کو جاں اور مال سے ہرگز دریغ اس میں
خلاصہ ہے یہ خود حضرت کے ارشاد زبانی کا

گئے وہ دن کہ تھے حملے وبا کے شہر پر پیہم
پڑا تھا خلق کا جوکھوں میں بیڑا زندگانی کا

نہ بنتا تھا غذا سے خون صالح جسم انساں میں
جوانوں میں نشاں پایا نہ جاتا تھا جوانی کا

ہوا ہے معتدل اب یاں ، تو صحت بخش ہے پانی
مٹا نام و نشاں امراض و ضعف و ناتوانی کا

پیے شہر و سواد شہر کا وہ آن کر پانی
جسے چکھنا ہو دنیا میں مزا کوثر کے پانی کا

تمنا دیکھنے کی ہو جسے فردوس اول کے
سماں دیکھے دکن میں آ کے اس فردوس ثانی کا

ہوئے ہیں جس قدر ابواب خیر اس عہد میں جاری
کریں اُن کو بیاں کیا منہ ہے الفاظ و معانی کا

خزانے کا دیا منہ کھول شہ نے اہل حاجت پر
رعیت کو ہوا جب سامنا قحط و گرانی کا

یتیموں کے لیے دارالیتامیٰ کی بنا ڈالی
رہے گا تا قیامت نام زندہ جس سے بانی کا

شفاخانے ہوئے اور درس گاہیں ملک میں قائم
ہوا بے باق جو حق تھا ہر اک قاصی و دانی کا

وہ کالج جس نے مردہ قوم میں پھر جان ڈالی ہے
اسی منبع سے جاری ہے وہ چشمہ زندگانی کا

وگرنہ قوم میں تعلیم کا ایسا ہی تھا توڑا
ہو کہ گرمی کی شدت میں تراقا جیسے پانی کا

علی گڑھ میں رہے گا بن کے دارالعلم یہ کالج[1]
یہی عالم ہے گر بذل و عطائے خسروانی کا

یہ اک دریافت سمجھی جائے گی دنیا میں لاثانی
پتا گر مل گیا داد و دہش میں اس کے ثانی کا

نہیں ہے کوئی کام اس کا رفاہ خلق سے خالی
اب آگے کام جاں بخشی کا ہو یا جاں ستانی کا

غرض اس سے بنی آدم کی جانوں کی حفاظت ہے
اگر شوق شکار اس کو ہے شیر نیستانی کا

جو ہوتی اس کو فرصت صید دل ہائے خلائق سے
تو ڈر رہتا درندوں کی نہ پھر ایذا رسانی کا

---

۱ - جواہرات حالی (صفحہ ۱۰۰) میں یہ مصرع یوں درج ہے:
”علی گڑھ میں رہے بن کے دارالعلوم یہ کالج“

ہے اس کی قادر اندازی کا شہرہ ایک عالم میں
جسے تاکا کبھی مانگا نہ قطرہ اس نے پانی کا

دعا پر مدحت شہ ختم کرتا ہے بس اب **حالی**
نہیں ممکن کہ ہوا اس سے ادا حق مدح خوانی کا

خدا کی مہربانی کا رہے طالب جہاں جب تک
ہو سایہ شاہ و شہزادہ پہ اس کی مہربانی کا

رہے آباد یہ گھر یا الٰہی رہتی دنیا تک[1]
کہ مرجع ہے یہ اک عالم کے آمال و امانی کا

ہر اک منزل میں شہہ کا ساتھ دے تائید ربانی
رہے مفتوح در ہر دم فتوح آسمانی کا

ہزاروں جشن سالانہ ہوں بعد اس جشن کے یا رب
کبھی ٹوٹے نہ ہرگز سلسلہ اس شادمانی کا

نظام الملک ، آصف جاہ سادس ، آصف ثانی
رہے مالک سدا دیہیم و تختِ خسروانی کا

★

۱ - جواہرات حالی (صفحہ ۱۰۰) میں یہ مصرع یوں درج ہے :
” رہے آباد یہ گھر الٰہی رہتی دنیا تک، “

(ب) منظومات مدحیہ ، سپاسیہ ، وداعیہ وغیرہ

۱ - خمسۂ نعتیہ[1]

(۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ع)

مرحبا زیب دہ مسند عالی نسبی
مرحبا صاحب اورنگ شفاعت طلبی
مرحبا سرور دیں ہاشمی و مطلبی
''مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی''

---

۱ - شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اس نظم کے تعارف میں لکھتے ہیں : ''قدسی کی مشہور و معروف نعتیہ غزل پر سینکڑوں اشخاص نے تضمینیں کہی ہیں - اس قسم کی بہت سی نظمیں قاضی محمد عمر صاحب ، ساکن ضلع مظفر نگر نے جمع کیں اور ۱۲۷۲ھ میں ''مدیث قدسی'' کے نام سے انھیں شائع کیا - اس میں مولانا کے نام سے مندرجۂ ذیل نظم کتاب کے صفحہ ۲۳ پر لکھی ہوئی ہے - لیکن آخر میں تخلص بجائے حالی کے ''خستہ'' ہے - اب نہ معلوم اس وقت مولانا کا تخلص ہی عام طور پر خستہ تھا یا اس خاص نظم میں مولانا نے اپنا یہ تخلص رکھا تھا - بہر حال یہ یقین ہے کہ یہ نظم مولانا ہی کی ہے ، کسی اور کی نہیں...''
(جواہرات حالی - صفحہ ۸۹)

تعجب ہے کہ شیخ صاحب نے خستہ تخلص کے بارے میں تو شبہ ظاہر فرمایا لیکن تضمین کے متعلق اُن کا دعویٰ ہے کہ ''یہ نظم مولانا ہی کی ہے -'' حالانکہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے - دیگر مصنفوں اور تذکرہ نگاروں نے بھی اس تضمین کے حوالے سے حالی کے ، ابتداءً خستہ تخلص اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے - (مثلاً ملاحظہ ہو ''حالی بحیثیت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یونس و یوسف و یعقوب و مسیح و موسیٰ
سب ترے مائدۂ فیض سے ہیں زلہ ربا
حق تو یہ ہے کہ تو بے مثل ہے چوں ذات خدا
''نسبتے نیست بہ ذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی''
ہو گیا بے خود و بے تاب و تواں اور بے دم
اک نظر جس نے ترے نور کا دیکھا عالم
کہا نقاش نے کی جب تری تصویر رقم
''من بیدل بہ جمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی''

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ سے آگے)

شاعر۔'' صفحہ ۲۵ ، ''یادگار حالی'' صفحہ ۲۰ ، ''حالی کا ذہنی ارتقا'' صفحہ ۱۱) لیکن میری رائے میں اس تضمین اور خستہ تخلص کا مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ حالی کے اپنے بیانات یا معاصر تصانیف سے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے کبھی خستہ تخلص اختیار کیا تھا۔

''حدیث قدسی'' ۱۸۵۶ع میں مرتب ہوئی۔ حالی ۵۵-۱۸۵۴ع میں ڈیڑھ برس تک دہلی میں رہے۔ یہ ابتدائی مشق سخن کا زمانہ تھا۔ خود حالی کا بیان ہے کہ ''اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' (ترجمۂ حالی) علاوہ ازیں انہوں نے اپنے پہلے قصیدۂ نعتیہ ، مرتبہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ع (ع : ''بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لیے'') کے حاشیے میں بہ صراحت لکھا ہے کہ ''اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔'' للہذا اس تضمین کو حالی سے منسوب کرنے کا بہ ظاہر کوئی جواز نہیں۔ لیکن چونکہ اس کے خلاف بھی کوئی حتمی دلیل نہیں ملتی اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے کلیات میں شامل کیا جائے۔ (مرتب)

آپ وہ نور مجسم ہیں شہنشاہ امم
دیکھیے خواب میں گر حسن کا اپنے عالم
نکلے بے ساختہ حضرت کی زباں سے پیہم
''من بیدل بہ جمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بو العجبی''

ایک تو یہ کہ فصاحت ہے عرب کی مشہور
دوسرے دینی تھی زک اہل زباں کو منظور
تیسرے یہ کہ بہ فرمان خداوند غفور
''ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبان عربی''

اے شہنشاہ امم ، اے شہہ فرخندہ مقام
فخر دیں ، فخر رسل ، فخر جہاں ، فخر انام
نہیں اعجاز سے خالی ترا جو کچھ ہے کام
''نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرہ بہ آفاق بہ شیریں رطبی''

خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصف نبی
ہاتھ اٹھا سوے مدینہ دم حاجت طلبی
پڑھ زباں سے ز رہ صدق یہ شعر قدسی
''سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوے تو قدسی پے درماں طلبی''

★

۲۔ مبارک باد[1]

(۱۸۷۵ع)

مژدہ کہ وقفِ جہاں گنجِ سعادت ہے آج
فتنۂ ایام سے سب کو فراغت ہے آج

آج کی ایک اک گھڑی سارے برس کا ہے مول
ملک کی مخدومہ کا روز ولادت ہے آج

پودا لگاؤ گے جو ہووے گا وہ بارور
مینہ کی طرح ہر طرف بارش برکت ہے آج

ہوویں گے جو کام آج پھولیں پھلیں گے سدا
سینوں میں کچھ خود بہ خود جوش مسرت ہے آج

قوم کے ہمدرد سب آئے ہیں کس جوش سے
کیسی تمنا بھری گرمیِ صحبت ہے آج

دولتِ جاوید کی پڑتی ہے بنیاد یاں[2]
قوم کی بے طالعی ہند سے رخصت ہے آج

مدرسۂ علم و دیں کرتے ہیں قائم ثقات
مزرعۂ قوم پر بارشِ رحمت ہے آج

۱۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ع کو ملکہ وکٹوریا کی سال گرہ کا دن تھا۔ اسی دن مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے افتتاح کی تقریب بھی منعقد ہوئی۔ مولانا حالی نے یہ نظم اسی موقع پر سرسید کی خدمت میں بھیجی تھی۔ بہ قول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ''حالی کی قومی شاعری کی بنیاد اسی نظم سے پڑتی ہے۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا۔ صفحہ ۴۶)

۲۔ کلیات حالی جلد اول (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) میں ''یاں'' کی جگہ ''یہاں'' درج ہے۔

رہیو مُبارک سدا ساعتِ مسعودیہ
برسوں میں ہوتی[1] وصول یاروں کی محنت ہے آج
دولت برطانیہ روز فزوں ہو جیو
قوم کو یہ دن نصیب جس کی بدولت ہے آج
قوم کے بدخواہ سب مِل کے پڑھیں فاتحہ
نکبتِ و ادبار کی ملک سے رخصت ہے آج

★

۳ - مژدہ قدوم حضور شاہزادہ ویلز در ہند[2]

(۷۶-۱۸۷۵ع)

مژدہ ہو اہل مشرق اب دن پھرے تمہارے
مغرب سے سوے مشرق آیا ہے مہر تاباں
گلے کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے
ہے ایسے گلہ باں پر گلے کی جان قرباں
ہندوستاں بھی تجھ سے کچھ آج کل نہیں کم
اے معدن بزرگی ، اے خاک انگلستان
تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن
ہندی بھی ان دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں

---

۱ - کلیات حالی جلد اول میں ''ہوئی وصول'' چھپا ہے - یہ نظم کسی اور مجموعے میں شامل نہیں - قیاس سے 'ہوئی' کی جگہ 'ہوتی' لکھا گیا - ''ہوئی'' کو ''ہوتی'' (فاعل) کے وزن پر پڑھنا ہر گز روا نہیں -
(مرتب)

۲ - 'شہزادہ ویلز' سے مراد ملکہ وکٹوریا کے ولی عہد اور جانشین ، ایڈورڈ ہفتم ہیں جنھوں نے ۷۶ - ۱۸۷۵ع کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا -
بحوالہ : King Edward VII by Sir Sydney Lee, Page 370

مہماں ہے آج اُن کا اس شاہ کا ولی عہد
روے زمیں کے سلطاں جس کے ہوئے ہیں مہماں

★

۴ - شکریۂ تشریف آوری سر چارلس ایچیسن[1]
(۱۸۸۲ع)

حضور تشریف جب کہ لائیں
تو کیوں نہ آنکھوں کو ہم بچھائیں
خوشی کے کیوں کر نہ گیت گائیں
بدن میں پھولے نہ ہم سمائیں
کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

حضور نے کی جو یہ عنایت
کہ آ کے دی مدرسے کو عزت
گھٹی نہ کچھ اس سے شان حضرت
مگر بڑھا دی ہماری وقعت
کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

یہ دھوم سنتے تھے ہم برابر
کہ آپ تعلیم کے ہیں یاور

---

۱ - یہ نظم ۱۸۸۲ع میں سر چارلس ایچیسن ، لفٹنٹ گورنر پنجاب کی تشریف آوری کے موقع پر اینگلو عربک سکول دہلی کے بچوں کے لیے لکھی گئی - جن بچوں نے نظم پڑھی اُن میں خواجہ غلام الحسنین (نبیرۂ مولانا حالی) بھی تھے - شیخ محمد اسماعیل صاحب نے خواجہ صاحب کی زبانی یہ چند بند 'جواہرات حالی' میں نقل کیے ہیں -
(بحوالہ جواہرات حالی صفحہ : ۱۰۱)

سو آ گیا آج ہم کو باور
کرم کیا آپ نے جو آ کر
کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

حضور پرنور سر ایچیسن
ہوئے ہیں یاں جب سے سایہ افگن
یہ آ رہا شہر پر ہے جوبن
بنی ہے دلی تمام گلشن
کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

★

۵ - قطعہ[1]

به جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدارالمہام سرکار عالی نظام دکن

(۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ع)

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ **حالی** کی ہے عرض
کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے
اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

---

۱ - نواب سر آسماں جاہ کی کوشش سے ۱۸۸۸ع میں ریاست حیدر آباد کی طرف سے مولانا حالی کا ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا - یہ قطعہ سپاسیہ اسی موقع پر نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا - (مرتب)

نہ ہوئی مجھ سے کوئی خدمت سرکار نظام
نہ کیا میں نے کبھی طوف در صدر زماں

نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لائق قدر
اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں

حق نہ تھا دولت عالی پہ کوئی **حالی** کا
جس کے جلدو[1] میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں

ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی
ڈھونڈھ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں

ہیں مربی ہنر و بے ہنری کے، جس طرح
خار و گل دونوں کو کرتا ہے نہال آب رواں

آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکرگزار
ملک میں اس کا ثناخواں ہے ہر اک پیر و جواں

یاں وہ ان کھیتیوں کو دے کے گیا ہے پانی
آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں

قوم اس وقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج
ہے وہ عالم پہ ہویدا، نہیں محتاجِ بیاں

عزت، آسودگی اور مذہب و ملت ان کا
ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں

پھر نہ قدر ان کی کچھ آنکھوں میں خلائق کی بلند
اور نہ وزن ان کا ترازو میں حکومت کی گراں

---

۱ - مطابق دیوان حالی، طبع اول (صفحہ ۱۷۲) و طبع سوم (صفحہ ۱۴۰) - متداول نسخوں میں ''بدلے'' چھپا ہے - (مرتب)

آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے
درد کا جان لیا ان کے کہ یہ ہے' درماں

مدرسے قوم کے اس ملک میں جو ہیں ممتاز
جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشان

ان کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم
چشم عالم میں مسیحائی پہ اپنی برہاں

کرتے ہیں زندۂ جاوید بنی نوع کو، جو
بذل کرتے ہیں پے تربیتِ اہلِ زماں

ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی جس کا
ملک پر قوم پہ تا دیر رہے گا احساں

یہی بخشش ہے یہی جود ہے راس الحسنات
جس پہ موقوف ہے بہبودیِ نسلِ انساں

یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز
یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں

یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف
یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں

دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل
کی ہمیشہ کے لیے ایک نے واں نہر رواں

اُس کی خواہش تھی کہ ہوتے رہیں پیاسے سیراب
اس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں

برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں
نہر جاری سے ہے ذات اُن کی سوا فیض رساں

۱۔ متداول نسخوں میں ''یہ ہے'' کی جگہ ''ہے یہ'' چھپا ہے۔
(مرتب)

بخت اس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر
حامیِ علم و خریدار کمال انسان
اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جب تک
شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احسان
آسماں جاہ سے ہو تقویت ملک دکن
اور رہے ملک دکن ملجا و ماوائے جہاں
دولت قیصری و دولت آصف جاہی
ایک کی ایک زمانے میں رہے پشتی باں

★

۵ - شکریہ حضور لفٹنٹ گورنر بہادر[1]

(از طرف طلبائے اینگلو عربک سکول دہلی)

(۱۸۸۹ع)

نہیں قلم اور زباں میں طاقت
کہ ہو بیاں آج کی مسرت
کہاں یہ اس مدرسے کی قسمت
کہ لائیں تشریف خود بدولت

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

کریں ادا شکر اس کا ہم کیا
کہ قیمتی وقت کھو کے اپنا

---

۱ - دسمبر ۱۸۸۹ع میں سر جیمس لائل لفٹنٹ گورنر پنجاب کی تشریف آوری پر یہ نظم، حسب فرمائش ہیڈ ماسٹر صاحب اینگلو عربک سکول دہلی، طلبہ کے لیے لکھی گئی - (بحوالہ جواہرات - صفحہ : ۲۲)-

ہماری حالت کو تم نے دیکھا
تمھی کو فرماں دہی ہے زیبا
کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

کرم ہو کیا اور اس سے بڑھ کر
کہ جو ہو پنجاب کا گورنر
وہ ایک ناچیز مدرسے پر
ہو لطف سے آ کے سایہ گستر

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

تھے آسرے جتنے اور سہارے
بھلا دیے ہم نے دل سے سارے
بس اب سہارے ہو تم ہمارے
پڑے ہیں سایے میں ہم تمھارے

کریں عریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ ان پر خدا کی رحمت

ہوئی ہے تعلیم جب سے جاری
پھری رہی اُس سے مت ہماری
اب آئی ہے یاں ہماری باری
نظر بس اب چاہیے تمھاری

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

ہے جب سے لائل نے سایہ ڈالا
ہوا ہے پنجاب میں اُجالا

وہ عدل والا وہ رحم والا
رہے سدا بول اس کا بالا
کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

ہمیشہ جب تک کہ علم و حکمت
جہاں میں کرتے رہیں حکومت
حضور قیصر کا ظل رافت
ہمارے سر پر رہے سلامت
کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ ان پر خدا کی رحمت

★

۷ - قطعہ[1]

در تہنیت ولادت فرزند ارجمند

در شبستان اقبال جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مدارالمہام سرکار عالی

(۱۳۰۸ھ مطابق ۹۱—۱۸۹۰ع)

فیض ربِ ذوالمنن سے مژدہ اے اہل دکن
نائبِ دولت کا نخلِ آرزو لایا ثمر
دی بشیر دولت و دیں کو وہ چیز اللہ نے
جس سے پایا دیدۂ یعقوب نے نورِ بصر

---

۱ - یہ قطعہ دیوان حالی کے متداول نسخوں (مثلاً لاہور کے ایم فرمان علی اینڈ سنز اور تاج بک ڈپو ایڈیشن) میں موجود نہیں ہے - (مرتب)

جس کو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہ نے
حق نے دی جس کے عطا ہونے کی سارا کو خبر

جس کے ملنے سے ہوا داؤد ممنون قضا
جس کے پانے سے ہوا ایوب مرہون قدر

جس کے بدلے میں علی الرغم شماتت پیشگان
حق سے ختم الانبیا نے پائے شبیر و شبر

جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی
جو ہے حاصل عمر کا اور زندگانی کا ثمر

جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز
جس سے ہیں اجداد زندہ اور اماجد نامور

صدر اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خلف
خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر

یہ پسر یا رب بحق عترت خیرالوریٰ
پائے عمر خضر زیرِ سایۂ مہرِ پدر

صدر اعظم کی طرح دربار آصف جاہ میں
جایگاہ قرب سلطانی ہو اس کا مستقر

دولت و ثروت کو اس کی ذات سے لگ جائے شان
زیور علم و ادب سے ہو محلی[1] اس قدر

سیرت و عادت میں اس کی نکلے آن اجداد کی
جوہر اخلاق فاروقی[2] ہوں اس میں جلوہ گر

---

۱ - مطابق طبع اول - مختلف نسخوں میں "مجلی" چھپا ہے - (مرتب)

۲ - اس میں یہ اشارہ ہے کہ نواب سر آسمان جاہ بہادر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں - (حالی)

ملک آصف جاہ میں سر آسماں جاہ اور وہ
رات دن رکھیں اجالا صورت شمس و قمر

★

۸ - قطعہ[1] در شکر و معذرت

(حیدر آباد ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ع)

یاں بلا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے
اول اس کا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں
خدمت والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے
عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں
شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال ابنائے دہر
جو لیاقت اس میں ہے درکار وہ ہم میں نہیں
شکر کرنا تھا ہمیں سرکار عالی کا ضرور
چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہم نے پڑھیں
گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت
اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں
رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک قصور
درگزر فرمائیں گے سرکار اس سے، ہے یقیں

---

۱ - ۱۳۰۹ھ میں جو راقم اور مولانا محمد شبلی نعمانی اور دیگر بزرگان قوم آنریبل سرسید احمد خاں بہادر کے ہمراہ علی گڑھ محمڈن کالج کی طرف سے بطور ڈیپوٹیشن کے حیدر آباد دکن میں بحضور سرکار عالی نظام حاضر ہوئے تھے، اس موقع پر ایک عام جلسہ بصدارت نواب وقار الامرا بہادر بشیر باغ میں منعقد ہوا تھا جس میں راقم نے اور مولانا محمد شبلی اور بعض اور صاحبوں نے کچھ نظمیں سرکار عالی کے شکریے میں پڑھی تھیں - جلسے کے بعد جناب صدر انجمن نے مجھ کو اور مولانا محمد شبلی کو خاص طور پر ہماری نظمیں دوبارہ سننے کے لیے دولت خانے پر طلب فرمایا تھا - وہاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اس وقت موزوں کیا گیا تھا راقم نے پڑھا تھا - (حالی)

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں

★

۹ - قطعہ[۱]

در شکر اضافۂ وظیفہ بہ پیش گاہ جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر
(حیدر آباد - ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ع)

اے بشیر دولت و دیں نائب شاہ دکن
اے مہات دکن کا ذات پر تیری مدار
مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار
جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے
پہلے ہو لیتے ہیں صدہا مشکلوں سے وہ دوچار
کوئی دنیا میں نہیں ہوتی بغیر اس کے فتوح
ہے اسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار
پر ملا مقصود جب **حالی** کو اس در سے، ملا
بے تردد، بے تذلل، بے طلب، بے انتظار
قدر دانی گر زمانے میں یونہی ہو جائے عام
پائیں بے مانگے مرادیں اپنی سب امیدوار
یا رب اس سرکار کو، ہے جس سے عالم فیض یاب
جب تلک دنیا رہے دنیا میں رکھیو برقرار

★

---

۱ - مولانا حالی کا وظیفہ ابتدا میں پچھتر روپے (سکۂ حالی) تھا، دورۂ حیدر آباد کے موقع پر سو روپے ہو گیا - (مرتب)

۱۰ - شکریہ' عطاے مدرسہ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع اجمیری دروازہ دہلی[۱]، بحضور سر جیمس لائل لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب از طرف طلباے اینگلو عربی سکول دہلی

(۹۲-۱۸۹۱ع)

آئیے اے دلی کے دل آرا شہر دعا گو سب ہے تمھارا
شکر کا ہم کو گو نہیں یارا پر یہ ہے کہنا فرض ہمارا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا[۲]

ہے دلی کے فخر کا یہ دن شہر میں آیا شہر کا محسن
وصف تمھارا گو نہیں ممکن رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر کیسے کیسے رعیت پرور
جن سے ہے ہندوستان منور فخر ہے انگلستان کو جن پر
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

---

۱ - چونکہ یہ نظم صغیر سن طالب علموں کے لیے لکھی گئی تھی تاکہ وہ ہزہائنس کے رو برو مجتمع ہو کر بطور کورس کے گانے کی لے میں پڑھیں، اس لیے بچوں کی سمجھ کے موافق نہایت سیدھے سادے الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں - (حالی)

سر جیمس لائل ۱۸۸۷ع سے مارچ ۱۸۹۲ع تک پنجاب کے گورنر رہے - چونکہ اس نظم میں جوبلی (منعقدہ ۱۸۸۷ع) کے پنج سالہ وظیفے کی مدت میں اضافے کا ذکر آیا ہے اس لیے قیاس ہے کہ یہ نظم ۹۲-۱۸۹۱ع میں لکھی گئی - (مرتب)

۲ - متداول نسخوں میں نظم کا پہلا بند نہیں چھپا - (مرتب)

آر کلاک احسان کا پتلا آدمی کی صورت میں فرشتہ
تھا دلی پر فضل خدا کا تم نے جو دلی میں اسے بھیجا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

آب و ہوا سے شہر کی ساری آتی تھی خلقت جان سے عاری
تم نے لگا کر نل اک باری چشمۂ حیواں کر دیا جاری
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

یوں تو ہیں سب احسان مسلم سب سے ہے یہ احسان مقدم
تھے تعلیم میں کم سب سے ہم تم نے مدد کی اپنی پیہم
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

جوبلی کے جو خاص وظیفے پانچ برس کو ہم کو ملے تھے
لطف سے میعاد ان کی بڑھا کے جیت لیے دل آپ نے ہم سے
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا
مانگے تانگے پر تھا گزارا مٹ گیا اب خلجان یہ سارا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

درس کے کمرے جس میں ہیں اکثر قدر ضرورت سے کچھ بڑھ کر
بورڈروں کے رہنے کو ہیں گھر کھیلنے کو میدان ہے سراسر
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

شہر میں جا کالج کو عطا کی کیں اصلاحیں آب و ہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی شرط حکومت تم نے ادا کی
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

تم میں ہیں جو موجود فضائل وہ نہیں کچھ محتاج دلائل
لوگ سب ان کے دل سے ہیں قائل او سر لائل ! او سر لائل !
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

★

۱۱ - اشعار مدحیہ[1]

بحضور سر ڈینس فٹز پیٹرک لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب
(انبالے کے ایک بانیِ مدرسہ کی طرف سے)
(غالباً ۱۸۹۲ع)

قیصر ہند کے ہیں سینکڑوں احسان جہاں
اس کا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احسان

---

۱ - اس نظم میں پنجاب کے جن گورنروں کی تعریف کی گئی ہے ان کے عہد حکومت کے سنین درج ذیل ہیں :

سر چارلس ایچی سن : ۱۸۸۲ع تا ۱۸۸۷ع
سر جیمس لائل : ۱۸۸۷ع تا ۱۸۹۲ع
سر ڈینس فٹز پیٹرک : ۱۸۹۲ع تا ۱۸۹۰ع

(List of the Heads of Administration in India and the India Office in England Page 45)

حکمراں آئے ہیں پنجاب میں اب تک جتنے
ایک سے ایک کا پلہ ہے عدالت میں گراں
جب کہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا اس دم
وقت رخصت تھا ہر اک اُن کو بہ حسرت نگراں
حال جو ہوتا ہے بچوں کا بچھڑ کر ماں سے
یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں
جا نشیں اُن کے ہوئے آن کے جب سر لائل
عہد سابق کو گئے بھول سب ابنائے زماں
شکر سے عہدہ برآ اس کے نہیں ہو سکتے
رحم و انصاف ہوا ذات سے جو ان کی عیاں
اٹھ گیا سر سے جب اس ملک کے سایہ ان کا
ہاتھ میں آپ نے لی آ کے حکومت کی عناں
کارفرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ
معدلت آپ کی اس وقت سے مشہور ہے یاں
حیدر آباد میں، میسور میں، کلکتے میں
نیک‌نامی کے کیے کام رہے آپ جہاں
ہے یہ اب آپ سے امید کہ پنجاب میں بھی
مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہوں گی آساں
بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈینس بھی
چھوڑ جائیں گے ہر اک دل پہ عقیدت کے نشاں

★

۱۲ - شکریہ مسٹر برور[1]

(غالباً ۱۹۰۰ء)

سچ ہے کیا نہ شکر بشر جس نے آشکار
اس نے کیا نہ شکر خداوند کردگار

ہم شکر کس زباں سے کریں آپ کا ادا
احسان ہم پہ آپ کے ہیں خارج از شمار

کی یاں حکومت آپ نے دس سال جس طرح
بھولیں گے وہ کبھی نہ سپاہی نہ عہدہ دار

انیسویں صدی کے یہ دس آخری برس
اس ضلع میں رہیں گے ہمیشہ کو یادگار

جو ہے اسے قلق ہے جدائی کا آپ کی
نوکر ہیں مضطرب تو رعیت ہے بے قرار

تھی آرزو لگے رہیں قدموں سے آپ کے
پورا ہو جب تلک کہ یہ انفاس کا شمار

لیکن خوشی کے ساتھ ہے غم بھی لگا ہوا
دکھ جیسے سکھ کے ساتھ ہے اور گل کے ساتھ خار

آ پہنچی وہ گھڑی کہ ہم آئے حضور میں
آج آخری سلام کو با چشم اشک بار

---

۱ - مسٹر برور کرنال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ نیک بھی تھے اور خوش اخلاق بھی - کرنال سے تبدیلی کے وقت عبدالمجید صاحب ڈپٹی انسپکٹر پولیس نے مولانا حالی سے یہ نظم لکھوا کر موصوف کے حضور میں پڑھی تھی - (بحوالہ "جواہرات حالی" صفحہ ۷۶)

جوہرات حالی میں اس نظم کا سن تصنیف درج نہیں - نظم کے چوتھے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی -
(مرتب)

اس وقت کو جو دل پہ ہے حالت گزر رہی
لفظوں میں عرض ہو نہیں سکتی وہ زینہار
ہے حق سے یہ دعا کہ بھلائی کا تخم یاں
جو بو چلے ہیں آپ وہ ہو نخل باردار
بورونے جس طرح کہ خلائق کو خوش رکھا
خالق اُسے بھی رکھے سدا شاد و کامگار

★

۱۳ - مسٹر آرنلڈ کی روانگیِ ولایت[1]
(۱۹۰۴ع)

۱

دوست اور پھر دوست بھی سچا، عجب نعمت ہے یاں
ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں
دوست کو دنیا میں سمجھو اک درخت باردار
پھول جس کے خوش نما اور پھل غذائے جسم و جاں
جس کے شاخ و برگ گوناگوں فوائد سے بھرے
جس کا سایہ راہ رو کے حق میں اک دارالاماں
دوست کے ملنے میں ہے جو لطف ظاہر ہے مگر
ہے بچھڑنے میں بھی اس کے اک عجب لذت نہاں
ہجر میں جیتے ہیں اس کے وصل کی اُمید پر
اس لیے مہجور بھی رہتے ہیں اس کے شادماں
آنکھ سے اوجھل کبھی ہوتا نہیں اس کا خیال
دوستوں کے سامنے ہے، وہ رہے جا کر جہاں

---

۱ - ۲۵ فروری ۱۹۰۴ع کو پروفیسر آرنلڈ کی رخصت کے وقت اسٹریچی ہال (علی گڑھ کالج) میں ایک الوداعی تقریب منعقد ہوئی تھی - مولانا حالی نے یہ نظم اسی موقع پر پڑھی تھی - (مرتب)

اُس کی رخصت سے قلق ہوتا ہے گو دل کو مگر
یاد رہتا ہے سدا وہ وقت رخصت کا سماں
چپ کھڑا ہے کوئی، ہے بڑھ کر گلے ملتا کوئی
ایک کا اُمڈا ہے دل ، ہیں ایک کے آنسو رواں
ہے یہ گو غم کا سماں ، لیکن مبارک ہے وہ غم
جس سے ظاہر ہوں محبت اور صداقت کے نشاں
جسم سے انسان کے ہو جان رخصت جس طرح
مل کے پردیسی چلے پردیسیوں سے اس طرح

۲

آج ہم اس دوست سے افسوس ہوتے ہیں جدا
دوستی پر جس کی ہم کو فخر کرنا ہے بجا
قوم کا ایک اینگلو سیکسن، پہ دل سے خیر خواہ
ہند کی اک خستہ ، درماندہ ، شکستہ قوم کا
دین کا پکا مسیحی پر مسلمانوں کا دوست
جس نے ہم کو وہ زمانہ یاد پھر دلوا دیا
جب کہ ہم کو دی گئی تھی یہ خبر قرآن میں
پاؤ گے عیسائیوں کو دوست تم سب سے سوا[1]
دین جس کا غیر اور بیگانہ جس کی نسل و قوم
گھر سمندر پار جس کا اور زباں نا آشنا
خیر خواہی میں ہماری اُس نے سب یک بارگی
تفرقے یہ عارضی دل سے دیے اپنے مٹا
جس قدر یاں پیش آئیں ہم کو قومی مشکلات
حاضر و غائب ہمارا اُن میں ساتھ اس نے دیا

---

۱ - قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے : ولتجدن اقربھم مودۃللذین آمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ۔ (مائدہ ، ۵ : ۸۲)

کر نہ کھایا اُس نے وہ جو حکم تھا انجیل میں
''تم پرایوں کا بھی اپنوں کی طرح چاہو بھلا''
ہے جدائی شاق اس کی پر نہیں جب اختیار
ہے وہی مرضی ہماری جو کہ ہے اس کی رضا
ٹھان لی ہے اُس نے گو ہم سے جدائی کی مگر
ہم تو جب جانیں ہمارے دل سے ہو جائے جدا
قصہ کوتہ ہم سے اب چھٹتا ہے پیارا آرنل[1]
فخر سے ہم جس کو کہتے تھے ہمارا آرنل

۳

کہتے ہیں دوری میں ہو جاتی ہے اکثر یاد کم
پر کریں گے اس کو دوری میں زیادہ یاد ہم
ہند میں رہتی تھی اکثر اس سے ملنے کی اُمید
اس لیے اس کی جدائی کا بٹا رہتا تھا غم
پر بہ ظاہر ہے اب اس کی یاد ہی اس کا بدل
اس لیے یہ پھانس اب کھٹکا کرے گی دم بہ دم
ایسے غم خواروں کو کوئی کس طرح دل سے بھلائے
آ کے جو پردیس میں کھاتے ہیں بیگانوں کا غم
زندگی ہے جب تلک باقی نہ بھولیں گے کبھی
آرنل کے ، مارسن کے ، بک کے احسانات ہم
مرحلے دشوار جو یاں ہم کو پیش آتے رہے
وہ رہے ہم دم ہمارے ہر جگہ اور ہر قدم
جن جواں مردوں کے یہ برتاؤ ہیں غیروں کے ساتھ
کیوں نہ ہو قوم اُن کی عالم کی نظر میں محترم

---

۱ - عام گفتگو میں آرنلڈ کے بجاے آرنل کہا جاتا تھا۔

ہندیوں سے یہ ہیں گر اخلاق انگلش قوم کے
تو یہ سمجھو بک گئے ہاتھ اُن کے ہندی بے درم
جس علم کی ہے دلوں میں خلق کے بوڑی گڑی
تا قیامت سرنگوں وہ ہو نہیں سکتا علم
ہے محبت ہی کہ وحشی جس سے ہو جاتے ہیں رام
جس کے آگے گردنیں ٹیڑھوں کی ہو جاتی ہیں خم
جو ہے ناسوروں کو بھر دیتا وہ مرہم ہے یہی
جس سے جن تسخیر ہوتے ہیں وہ خاتم ہے یہی

۴

ہے محبت کی کہانی میں بھی کیا دل بستگی
ختم ہوتی ہی نہیں یہ داستاں جب چھڑ گئی
آرنل کی مہر و الفت کے بیاں نے یک قلم
یاد سے عظمت بھلا دی اس کے علم و فضل کی
ذکر اس کا، ہو نہ جس میں علم کا اُس کے بیاں
حد ناقص ہے نہ قید فصل ہو جس میں لگی
علم میں جو اس کا درجہ ہے وہ ہو کیوں کر بیاں
منہ ہے چھوٹا فی المثل اور بات ہے یارو بڑی
کارنامہ اُس کا ہے جو ''دعوت اسلام،، پر[۱]
اس کے علم و فضل پر برہان کافی ہے یہی
مشرق و مغرب میں صدیوں تک رہے گی یادگار
اس نے جو تاریخ پر ڈالی ہے آ کر روشنی
دعوت اسلام پر مدت سے تھا چھایا ہوا
اک اندھیرا جس میں تھی ظلمت پہ ظلمت پڑ رہی

---

۱ - آرنلڈ کی فاضلانہ تصنیف The Preaching of Islam جس کا ترجمہ سرسید کی فرمائش پر عنایت اللہ دہلوی نے کیا تھا - (مرتب)

ہو رہے تھے سب مسیحی بدگماں اسلام سے
جبر پر سمجھے ہوئے تھے جو بنا اسلام کی
دونوں فرقوں کے دلوں میں تھا بڑھا یاں تک غبار
ہو گئی تھی بیچ میں دیوار اک گویا کھڑی
ایک مدت تک رہا تاریخ پر پردہ پڑا
شاہدِ حق نے نہ جلوہ اپنا دکھلایا کبھی
سب سے پہلے خود مسلمانوں کو لازم تھا کہ وہ
جبر کے الزام سے اسلام کو کرتے بری
پھر مناسب تھا مسیحی کرتے اس کی چھان بین
نکلی کوشش سے ہیں جن کی غلطیاں اکثر دبی
پر نہ کوئی کر سکا سر یہ مہم جز آرنل
نام پر گویا اسی کے فتح تھی اس کی لکھی
اُس نے جو لکھا اسے منوا دیا بے چون و چند
مذہب اور تاریخ دونوں اس کے ہیں احسان مند

۵

توڑنے والی تھی یہ تصنیف ہمت کی کمر
کامیابی غیر ممکن اس میں آتی تھی نظر
تھی مصنف کو ضرورت اس میں جس سامان کی
جستجو میں اس کی طے کرنے تھے اس کو بحر و بر
مشکلوں کا تھا اُسے ہر ہر قدم پر سامنا
ایک مشکل سے تھی مشکل دوسری دشوار تر
ڈھونڈنے تھے اس کو شرق و غرب کے وہ واقعات
جن سے تھی تاریخ ساکت اور مؤرخ بے خبر
قافلے کا کھوج واں اس کو لگانا تھا جہاں
نقشِ پا تھے اور نہ آوازِ درا تھی راہبر

ہو رہا ہے نظم میں ان مشکلوں کا جو بیاں
بے سر و پا سمجھیں ایسا ہی اسے اہل نظر
جیسے اک گونگا اشاروں میں کرے آکر بیاں
سامنے اہلِ وطن کے اپنی روداد سفر
جز مصنف کوئی درد اس کا سمجھ سکتا نہیں
جھیلتے ہیں جو یہ کڑیاں بس انھی کو ہے خبر
آرنل کا مذہبی دنیا پہ جو احسان ہے
ہو نہیں سکتا ادا شکر اس کا قصہ مختصر
اب دعا یہ ہے کہ پردیسی مسافر خیر سے
برکتوں کے سایے ہی سایے میں سب جا پہنچیں گھر
آرنل ، مس آرنل ، مسز آرنل سب کے لیے
یہ سفر فتح و ظفر کا ہو وسیلہ سربسر
آرنل سے فتح علمی جو ہوئی ہے آشکار
ہوں فتوحات آشکارا اس سے ایسے بے شمار

★

۱۴ ـ مسٹر ماریسن کی روانگیِ ولایت[1]

(۱۹۰۵ع)

ہم سے ہوتے ہیں جدا اب آنریبل ماریسن
چھینتا ہے اُن کو ہم سے جذبۂ حب وطن
سایہ اپنا سر سے کالج کے اٹھانے کو ہیں وہ
جس کے سر پر تھے ہما کی طرح وہ سایہ فگن

---

۱ ـ سر تھیوڈور ماریسن علی گڑھ کالج میں انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے ـ ۱۸۹۹ع میں مسٹر بیک کی وفات کے بعد پرنسپل ہو گئے ـ تقریباً پندرہ سولہ سال تک مسلمانوں کی پر خلوص تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد جب ۱۹۰۵ع میں اپنے عہدے سے سبک دوش ہو کر انگلستان جانے لگے تو ایک الوداعی تقریب میں مولانا حالی نے یہ نظم پڑھی ـ (مرتب)

تھی نہ کالج کے ہواخواہوں کو یہ ہرگز اُمید
چھوڑ جائیں گے وہ یوں پھولا پھلا اپنا چمن

کیا خبر تھی ہم کو یاد آئے گا اپنا جب کہ دیس
بھول جائیں گے انھیں پردیس کے سارے بچن

چھوڑ کر بیڑا مسلمانوں کا یوں منجدھار میں
راہ لی تم نے سمندر پار کی اے مارسن

تم نے پوری کر کے آنکھوں سے دکھا دی وہ مثل
وہ جو ہے مشہور ''نیکی کن و در دریا فگن،،

چاہیے تھا دیکھتے اپنے چمن کی اب بہار
جس کی پہنچی ہے مہک شیراز سے لے تا دکن

پرورش میں تم نے جس بچے کی کاٹے بیس سال
دیکھنی تھی اب تمھیں اس کی جوانی کی پھبن

تم نے باندھی تھی کمر جس قوم کی تعلیم پر
شاد ہوتے دیکھ کر اُن میں کمال علم و فن

پر، لگاتے اور ہیں یاں پود، پھل کھاتے ہیں اور
نوع انساں میں چلی آتی ہے یہ رسم کہن

ہے تمھارے جانشینوں کے لیے اب راہ صاف
کٹ گئیں اس راہ میں تھیں منزلیں جتنی کٹھن

تم نے کی کالج کی خدمت جس خلوص و صدق سے
بس یہی خدمت تمھارا ہے صلہ اے مارسن

ہے صلہ نیکی کا خود نیکی، کہ دل سوزی کا اجر
شمع نے بھر پایا روشن ہو گئی جب انجمن

گو کہ یاں تعلیم کا بویا تھا سر سید نے بیج
پر پھلا پھولا تمھاری سعی سے اُس کا چمن

جیسے پھیلایا مقدس پال[1] نے دین مسیح
تم نے اور بک[2] نے یونہی پھیلایا سید کا مشن
تم نے سرسید کی جو اصلاح میں حصہ لیا
قوم کی سنت ادا کی ہے یہ تم نے بے سخن
تم زمیں کے ہو نمک، مصلح ہو تم اقوام کے
ہے تمھاری قوم کی خصلت یہ مشہور زمن
نوع انساں کی مدد کرنا تمھارا ہے شعار
تقویت دینا ضعیفوں کو تمھارا ہے چلن
مارسن اور مارسن بیگم نے ثابت کر دیا
خیر کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب مرد و زن
نیک دل بانو بھی کالج کی مربی تھیں یونہی
جس طرح شوہر کے دل کو تھی لگی اس کی لگن
اب دعا یہ ہے کہ آپ اور آپ کے اہل و عیال
سایۂ افضال ربانی میں پہنچیں تا وطن
رہوے ہر منزل میں توفیق الٰہی ساتھ ساتھ
حافظ و ناصر تمھارا ہو خدائے ذوالمنن

★

---

۱ - مسیحیت کے رکن رکین سینٹ پال مراد ہیں۔

۲ - مسٹر تھیوڈر بیک جو ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۹ء تک علی گڑھ کالج کے پرنسپل رہے ہے۔

۱۵ - خطاب بہ حاذق الملک[1]

(۱۹۰۸ع)

حاذق الملک ! اس خطاب فرخ و مسعود پر
ایک عالم آپ کو دیتا مبارک باد ہے

پر یہ ہے کیسی مبارک باد ، ہم حیران ہیں
گو کہ دل ہر اپنے بیگانے کا اس پر شاد ہے

سعی و کوشش آپ نے کی تھی کبھی بہر خطاب
یا کوئی درخواست دی تھی آپ نے کچھ یاد ہے؟

یہ تو یاروں کی دعاؤں کا ہے بس سارا ظہور
غیب سے یہ اُن دعاؤں کی ہوئی امداد ہے

پس مبارک باد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام
مستحق ہیں اس کے ہم ، یا آپ ، کیا ارشاد ہے؟

★

---

[1] "۱۹۰۸ع کے شروع میں جب حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو گورنمنٹ نے 'حاذق الملک' کا خطاب مرحمت فرمایا تو حکیم صاحب موصوف کو مبارک باد دینے اور گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ۷ جنوری ۱۹۰۸ع کو دہلی کی پبلک کا ایک عظیم الشان جلسہ شہر کے ٹاؤن ہال میں نواب امیرالدین احمد خاں صاحب والیِ ریاست لوہارو کے زیرصدارت منعقد ہوا تھا - مولانا بھی اتفاقاً دہلی میں تشریف رکھنے کے باعث جلسے میں شریک ہوئے ، ایک تقریر فرمائی ، اور آخر میں یہ قطعہ پڑھا -"
(جواہرات حالی صفحہ : ۱۹)

۱۶ - افتتاح ندوۃالعلما'

(۱۹۰۸ع)

ڈر حادثات دہر کا پھر اس عمارت کو ہے کیا
رکھی گئی ہو علم اور اصلاح پر جس کی بنا
ہوں راج اور مزدور جس کے اہل علم و اتقا
اور مستری جس کا بنے صوبے کا خود فرماں روا
ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ کر شکر خدا

اب مشکلیں فضل خدا سے تیری سب آساں ہوئیں
سر جان ہے تیرا مربی ، قوم ہے تیری معیں
رک رک کے آخر جھک چلے ہیں تیری جانب اہل دیں
اے ندوہ یہ ساماں بجز تائید ربانی نہیں
پھر ڈر ہے اس بیڑے کو کیا جس کا خدا ہو ناخدا

بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھ کو گھر دیا سر جان نے
ویرانہ تھا ، آباد تجھ کو کر دیا سر جان نے
موقع تجھے بہتر سے بہتر دیا سر جان نے
خاکہ تھا اک تو، رنگ تجھ میں بھر دیا سر جان نے
اب تو قدم آگے بڑھا خواہش ہے گر اس سے سوا

اس ملک و اہل ملک پر سمجھو خدا ہے مہرباں
آزاد ہوں مذہب جہاں ، آباد ہوں معبد جہاں

---

۱ - ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ع کو ندوۃالعلما لکھنؤ کا سنگ بنیاد صوبے کے لفٹنٹ گورنر سر جان پر سکاٹ ہیوٹ نے رکھا اور اس موقع پر ایک عظیم‌الشان جلسہ منعقد ہوا۔ یہ نظم حسب فرمائش علامہ شبلی اسی جلسے کے لیے لکھی گئی تھی لیکن مولانا حالی بوجہ علالت شریک جلسہ نہ ہو سکے۔ (بحوالۂ جواہرات حالی - صفحہ ۹۴)

ہو سلطنت اس قوم کی جو علم کی ہو قدرداں
جلسوں میں پبلک کے شریک آ کر ہوں حکام زماں
دیں تا کہ اپنے خلق شاہانہ سے دل سب کے بڑھا

دیں علم کی ترغیب انھیں جو علم سے بیزار ہوں
اُن کو جگائیں نیند سے غفلت سے جو سرشار ہوں'
خیراد پر ان کو چڑھائیں جو کہ ناہموار ہوں
دیں واجبی حق بے دریغ اُن کو کہ جو حق دار ہوں
جس قوم کو دیکھیں گرا لیں دوڑ کر اس کو اٹھا

ممکن ہے کچھ دل اس حکومت میں ہوں نالاں اور حزیں
پر اس سے تو خالی حکومت کوئی عالم میں نہیں
وہ بادشہ قبضے میں جس کے آسماں ہے اور زمیں
اس کی حکومت میں بھی شادی ہے کہیں ماتم کہیں
باراں رحمت ہے کہیں زحمت کہیں سیل بلا

حق یہ ہے ہو جس ملک میں ہر قوم کی حالت جدا
اس قوم کا مقصد الگ ، اُس قوم کی حاجت جدا
رسمیں جدا ہر قوم کی ، مذہب جدا ، ملت جدا
نقشہ جدا ، رنگت جدا ، صورت جدا، سیرت جدا
ہے انتظام اس ملک کا بس کام انگلش قوم کا

محتاج تھے جو پرورش کے تم نے پالا ہے انھیں
جو ہو گئے تھے پست ، پستی سے نکالا ہے انھیں
درجے سے تھے جو گر گئے، تم نے سنبھالا ہے انھیں
انگھڑ تھے جو تعلیم کے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
ہم سے تمھارا شکر اے برطانیہ کیا ہو ادا

---

۱ - علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں یہ مصرع یوں چھپا تھا :
امداد دے دے کر پڑھائیں اُن کو جو نادار ہیں (ج - ح - ۹۴)

ندوہ کو یور آنر نے عزت دی ہے جو یاں آن کر
ندوہ کا یہ اعزاز ہے احسان ساری قوم پر
خیر اس حکومت کی مناتے ہیں مسلماں سر بسر
حق سے دعا کرتے ہیں جان و دل سے یہ شام و سحر
اڈورڈ ہفتم اور شہنشاہی رہے اس کی سدا

★

۱۷ - تہنیت مسند نشینی حضور نظام[۱]

(۱۹۱۱ع)

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں
مبارک تمھیں مسند شہریاری
مبارک اب و جد کی تم کو خلافت
مبارک دکن کی تمھیں تاج داری

مبارک تمھیں ملک کی گلہ بانی
مبارک رعیت کی خدمت گزاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل
جہاں چپے چپے پہ ہے ذمے داری

مبارک وہ منصب کہ جن کو ملا وہ
ہوا چین رخصت، فراغت سدھاری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو
جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری

۱۔ والیِ دکن، نظام الملک، آصف جاہ ہفتم، میر عثمان علی خاں مرحوم کی تخت نشینی کے موقع پر روزنامہ زمیندار لاہور نے ایک خاص نمبر نکالا تھا۔ یہ نظم ادارۂ زمیندار کی فرمائش پر لکھی گئی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۱۱ع کے زمیندار (جلد ۲ شمارہ نمبر ۳۵) میں شائع ہوئی۔
(بحوالہ جواہرات حالی - صفحہ ۷۲)

ارادوں سے ، جرأت سے ، ہمت سے جن کی
زمانے نے ہے بارہا شرط ہاری

مہموں سے ہے جن کی تاریخ رنگیں
زبانوں پہ ہے ذکر خیر ان کا جاری

ادا کر گئے وہ تو اپنے فرائض
ہے اب آپ کے عہد دولت کی باری

اب اُن کی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا
خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری

جو بے بس ہیں دینا ہے اُن کو سہارا
جو بے یار ہیں اُن کی کرنی ہے یاری

نکمے ہیں جو اُن کو کامی بنانا
بڑھانا دل ان کا جو ہیں کاروباری

جگانا انھیں نیند کے جو ہیں ماتے
بڑھانا انھیں علم سے جو ہیں عاری

جو زردار ہیں اُن کی ہے پاسبانی
جو نادار ہیں اُن کی حاجت برآری

جو سر زور ہیں اُن کی ہے گوش‌مالی
جو مظلوم ہیں اُن کی ہے غم‌گساری

بڑوں نے تھا عہد وفا جن سے باندھا
سدا کرنی اس عہد کی پاس‌داری

سمجھنا ہر اک قوم و ملت کو یکساں
کہ خصلت ہے یہ زیور شہریاری

مبارک یہ بار گراں تم کو شاہا
اٹھانے سے ہیں جن کے افلاک عاری

بہت مشکلوں کا ہے گو سامنا یاں
کہ بہتوں نے یاں آ کے ہمت ہے ہاری

مگر مشکلیں ہیں یہ سب اُن کو آساں
پڑی جن کی گھٹی میں ہے ملک‌داری

پلے جو ہیں آغوش میں سلطنت کی
سیاست ہے جن کی رگ و پے میں ساری

یہ اُمید ہے آصف ہفتمیں سے
ریاست کی حل مشکلیں ہوں گی ساری

رہے گا اسی طرح جیسے رہا ہے
دکن پر سدا سایۂ فضل باری

دعا گوے دیرینہ ناچیز **حالی**
کہ مدحت گری کے ہنر سے ہے عاری

دعا کے سوا کچھ نہیں پاس اس کے
ادا جس سے ہو فرض مدحت نگاری

الٰہی طفیل اس کا پھیلائی جس نے
خلائق میں توحید و پرہیزگاری

منادی نے، تعلیم نے، جس کی آ کر
زمانے کی بگڑی ہوئی کل سنواری

طفیل اس کا فرماں‌روائے دکن کی
حکومت کو دے غیب سے استواری!

رہے رہتی دنیا تلک وہ سلامت
بہ اقبال و فیروزی و کام‌گاری

★

۱۸ - شہر حیدر آباد[1]

(۱۹۱۲ع)

پانی دیتا ہے کوئی پودا لگاتا ہے کوئی
پھول چنتا ہے کوئی آ کے کوئی برگ و ثمر
آ کے کرتا ہے چمن میں کوئی آئیں بندی
تا کہ ہو سیر چمن سے نہ کبھی سیر نظر
کرتے ہیں علم نباتات کی بعضے تحقیق
تا کہ تحقیق سے ہو آن کی فزوں علم بشر
الغرض باغ میں ہیں وارد و صادر جتنے
ایک سے ایک کی ہیں مختلف اغراض، مگر
صحن گلشن میں کسی کام کو آئے کوئی
جائے گا بوے ریاحیں سے معطر ہو کر
حیدرآباد بھی اک باغ ہے ماشاءاللہ
ہے جہاں فیض کا دروازہ کشادہ سب پر

★

۱۹ - شکریۂ مساعیِ جمیلہ ظفر علی خاں[2]

(از طرف جملہ مسلمانان)

(۱۹۱۳ع)

اے مالک دفتر زمیندار اے نازش قوم و فخر اقران
اے روح و روان جمع احباب اے چشم و چراغ بزم اخوان

---

۱ - جواہرات حالی میں سن تصنیف مذکور نہیں۔ مطالعۂ حالی (مؤلفہ شجاعت علی سندیلوی و ناظر کاکوروی، ص ۲۱۹) میں ۱۹۱۲ع درج ہے۔ (مرتب)

۲ - جنگ بلقان کے دوران میں مولانا ظفرعلی خاں (مدیر و مالک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اے دین کے امتحاں میں جاں باز | اے نصرت حق میں تیغ عریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر | اے شیر دل، اے ظفر علی خاں!
قدرت نے بھرے تھے تجھ میں جو گن | جب تک وہ رہے نظر سے پنہاں
فوقیت و برتری پہ تیری | قائم کوئی ہو سکی نہ برہاں
پر وقت کی تاک میں برابر | ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ | اٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردیِ اہل دیں نے آخر | جوہر ترے کر دیے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر | دامن ہوا چاک تا گریباں
پھیلے وہ بہ شکل سیل آتش | دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
ڈالا یہ تری پکار نے غل | جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
جو دل غم قوم سے تھے بے حس | چلنے لگیں اُن دلوں پہ چھریاں
وہ بن گئے آپ اپنے رہ زن | جو مال کے اپنے تھے نگہباں
اسلام کی سمجھے اب حقیقت | جو نام کے تھے فقط مسلماں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ | سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں!

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ سے آگے)

اخبار زمیندار لاہور) کے جذبۂ ملی اور قومی خدمات سے متاثر ہو کر مولانا حالی نے یہ نظم لکھی تھی جو ۱۰ اگست ۱۹۱۲ع کے اخبار زمیندار (جلد ۳ نمبر ۹۷) میں شائع ہوئی۔

۳ اگست ۱۹۱۲ع کے ایک خط میں مولانا حالی اس قطعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب وہ (مراد مولانا ظفر علی خاں — مرتب) مغرب کی جانب روانہ ہونے کو تھے، میں نے چند ابیات اُن کی شان میں لکھی تھیں مگر جب وہ روانہ ہو گئے تو وہ نظم نا تمام رہ گئی۔ کل بمقام دہلی، پانی پت سے اُن کو تار دیا گیا تھا کہ لاہور جاتے ہوئے تھوڑی دیر یہاں بھی قیام فرمائیں۔ ارادہ تھا کہ یہ نظم میں خود اُن کے سامنے پڑھوں گا۔ مگر ... ہمارے واجب التعظیم مسافر بالا بالا، لاہور کو روانہ ہو گئے ... ۔" (مکاتیب حالی صفحہ ۱۱۱)

نازاں ہے وہ درس گاہ تجھ پر　　تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں
کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند　　جو قوم کے درد کے ہوں درماں
سوز غم دین حق سے جن کے　　سینے ہوں کباب دل ہوں بریاں
جو ملک و وطن کے ہوں فدائی　　جو قوم کے نام پر ہوں قرباں
مشرق میں ہوں درد دل سے بیچین　　مغرب میں سنیں جو رنج اخواں
پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر　　ہے اس کو یہ فخر و ناز شایاں

زندہ ہے وہ ملک اور ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

★ ★ ★

فصل چهارم

مراثی

۱ - مرثیہ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی

متخلص بہ غالب

(۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ع)

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی
وقت کوتاہ و قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال
گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں
تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بےحقیقت ہے شکلِ موجِ سراب
جامِ جمشید و راحِ ریحانی
لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی
حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی
اک تماشا ہے حسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک
چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی
اس سے آخر کو کج ادائی کی

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر
تو نے کی جس سے بے وفائی کی

ہے زمانہ وفا سے بیگانہ
ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی

یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی
صلح میں چاشنی لڑائی کی

ہے یہاں حظِ وصل سے محروم
جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی

ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس
جس کو عادت نہ ہو گدائی کی

خندۂ گل سے بے بقاتر ہے
شان ہو جس میں دل ربائی کی

جنس کاسد سے ناروا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں ، نکتہ سنج ، نکتہ شناس
پاک دل ، پاک ذات ، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات[۱]

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھّا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا ، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا ، نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

---

۱ - مطابق دیوان حالی ، طبع اول (صفحہ ۱۵۸) طبع سوم (صفحہ ۱۲۸) میں یہ مصرع یوں ہے :
''دن کو کہتا تھا دن اور رات کو رات'' (مرتب)

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے داد سخن‌وری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو
سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہل انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئنہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت

اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگ ہجراں وصال کی صورت
لطفِ آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالب بے مثال کی صورت
اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع
رخصتِ موسمِ بہار ہے آج
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دل میں مدت سے تھی خلش جس کی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

دل مضطر کو کون دے تسکیں
ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج

تلخیِ غم کبھی نہیں جاتی
جان شیریں بھی ناگوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ‌تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد

نقدِ معنی کا گنج داں نہ رہا
خوان مضموں کا میزباں نہ رہا

ساتھ اس کے گئی بہار سخن
اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں سالار
کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونقِ حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازارِ گل رخاں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہل ہند اب کریں گے کس پر ناز
رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نام ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
اٹھ گیا، تھا جو مایہ‌دار سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

کیا ہے جس میں وہ مردکار نہ تھا
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا
بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذر سائل تھی جاں تک، لیکن
ق(۱) درخور ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ‌ور نہ ہوا
جان دینے پہ اختیار نہ تھا (۲)
خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیِ لفظِ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں
آج بلبل نہیں گلستاں میں

شہر سارا بنا ہے بیت حزن
ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یک سر ہوا ہے بے آئیں
اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی
ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رمّاں میں

حصر تھی اک بیاں میں رنگینی
کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں

لبِ جادو بیاں ہوا خاموش
گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں

گوشِ معنی شنو ہوا بے کار
مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں

وہ گیا جس سے بزم تھی روشن
شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر
سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہ کامل میں آگئی ظلمت
آب حیواں پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائے گا اب کون
سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون

ہم نے جانی ہے اس سے قدر سلف
ان پر ایمان لائے گا اب کون

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون

تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش
وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلی سے آئے گا اب کون

مر گیا قدردان فہم سخن
شعر ہم کو سنائے گا اب کون

مر گیا تشنۂ مذاق کلام
ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون

تھا بساط سخن میں شاطر ایک
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

شعر میں ناتمام ہے **حالی**
غزل اس کی بنائے گا اب کون

کم لنا فیہ من بکے و عویل[1]
و عتاب مع الزمان طویل

★

۲ - مرثیۂ مہیں برادر راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم

(۱۳۰۳ھ مطابق ۸۶-۱۸۸۵ع)

کل سوگ میں بھائی کے اسے دیکھ کے چپ چپ
حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحر معانی

---

۱ - اس کے غم میں ہم کتنا روتے اور آہ و زاری کرتے ہیں اور کتنے عرصے سے ہم زمانے کو ملامت کر رہے ہیں -

خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا
کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی

شادی میں تری تہنیتیں ہم نے سنی ہیں
ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ‌خوانی

ہنستا ہے نہ روتا ہے نہ بذلہ ہے نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی

دنیا ہے یہ اک دار فنا جس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی

ہوجائے گر انساں یونہی ہر رنج میں خاموش
کس طرح دلوں کے ہوں عیاں راز نہانی

اک آہ بھری سن کے یہ **حالی** نے کہ جس سے
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

فرمایا کہ موجوں سے بھنور کے نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاصی و دانی

حالی ہی کو معلوم ہے **حالی** کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی

پر بھائی ہو جس شخص کا **حالی** کا سا بھائی
غم بھائی کا مر جانے کی ہے اس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سایے میں کٹی اس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کی بھلا مہر پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی

جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی

دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو
کیا ڈھونڈھتے ہو اس کی طبیعت میں روانی

یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ
یہ چپ نہیں مر جانے کی ہے دل کے نشانی

بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں
یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لنگھانی

پر آہ ، کلی وہ جو ہے مرجھا گئی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

★

۳ - مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی

(۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ع)

اے جہان‌آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان‌آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم و دیں
جیسے آسی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں جو تھا محدث ، تھا وہ تیرا خوشہ‌چیں
تھی محدث خیز اے پاتخت تیری سرزمیں
تھا تفقہ بھی مسلم تیری خاک پاک کا
بیہقیِ وقت تھا ایک اک فقیہ اس خاک کا
شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر
آب و گل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر
تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہر منیر
تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر
آج جس دولت کا بازار جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالامال ہے
طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی
خاک سے اٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اک جہاں شیوا بیانی سے ہے ان کی باخبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر[1]
حسن صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد[2] تھا
حسن معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا

---

۱ - غاتفر : سمرقند کے قریب ایک قطعۂ زمین ہے جہاں کا سرو خوبی و زیبائی و راستی میں ضرب المثل ہے -

۲ - نوشاد اور خلخ دو شہر قدیم ترکستان میں تھے جو حسن خیزی میں مشہور تھے -

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جن میں‌تھی اسلامیوں کی چار سو عالم‌میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم
آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصل خزاں
تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام
آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام
رسم میں ، آئین میں ، اوضاع میں ، اطوار میں
طرز میں ، انداز میں ، رفتار میں ، گفتار میں

رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات اور خصال
آ کے بن جاتا تھا یاں نقصان انساں کا کمال
تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال
آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں
چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب
آن کر لیتے تھے یاں ٹھیکی جہاں کے انتخاب
بستے تھے اطراف سے آ آ کے تجھ میں شیخ وشاب
کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب
جمگھٹا تھا تجھ میں‌ترک و فرس و روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گل ہائے رنگارنگ کا

لیکن آخر طبع دوراں کا ہے جیسے اقتضا
ہر ترقی کی ہے حد، ہر ابتدا کی انتہا
جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کرچکا
وقت اے جان جہاں تیرا بھی آخر آ لگا

گردش افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

تجھ پہ اے دارالخلافت انقلاب آنے لگے
غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالع مشفق کے پیغام عتاب آنے لگے
تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے

دولت و اقبال کا بندھنے لگا رخت سفر
تجھ سے اے دارالعلوم اٹھنے لگا علم و ہنر

ہو گئے تیرے محدث راہیِ دارالسلام
کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام
رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام

مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے

چل دیے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب

جن کو کھو بیٹھے نظیر ان کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

کر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سفر
گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
جھڑ گئے تاج شرف سے تیرے سب لعل و گہر
تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر

علم ہے باقی نہ اب دولت ہے تیرے پاس وہ
اے گل پژمردہ تیری کیا ہوئی بو باس وہ

دور آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا
بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں تیری پھر اگلے وہ لعل بے بہا
جن سے روشن ہوگیا کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی
پر نہ کی عرض ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی
پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دور اکبری

علم و دین و شعر و حکمت ، طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہرفن میں دھوم

ملک میں ہر سو وہی پھر بول بالا تھا ترا
تھا جہاں علم و ہنر گودوں کا پالا تھا ترا
تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اجالا تھا ترا
پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا

چاند نکلا تھا گہن سے جو وہ پھر گہنا گیا
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے
واعظان قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخن‌ور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیل فنا اس کو بھی اے دلی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

تجھ میں ہے دلی ! کوئی اب ایسا مقبول جہاں
نازشِ دارالخلافت مرجعِ ہندوستاں
ھند سے لے تا عرب ، کشمیر سے تا انڈماں
بچے بچے کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں
واقعات زندگی کر دیجے گر اس کے بیاں
سمجھیں اک افسانہ ناواقف اسے اور داستاں
ہے تعجب خیز الحق سیرت محمود خاں

یا وہ اک جوہر الگ تھا جو ہر انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانے کا تھا اس کو نہ شکرانے کا تھا

اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا
تھے برابر اس کے نزدیک اغنیا اور بے نوا
گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا
کوئی مفلس کا نہ تھا پرسان حال اس کے سوا

کرتے ہیں جو دعویٔ ہمدردیٔ نوعِ بشر
اس نے باطل کر دیے تھے ان کے دعوے سربسر

طب مسلمانوں کی لی اس کی مسیحائی نے تھام
ورنہ اب تک اس کی ترکی ہو چکی ہوتی تمام
رونق طب جدید اور اس پہ میل خاص و عام
درس گاہوں اور دواخانوں کا اس کے انتظام

دیکھ کر تھا اک زمانہ اس کی خوبی کا مقر
طب یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

سرجنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال و حیل
آ گیا تھا رائے میں زود اعتقادوں کی خلل
دیں مگر اس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل
طب یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل

سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اس کے حملوں سے ہوئی عہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب
پر اُلجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب
اس کے بیماروں کو گو مایوس ہوں یا جاں بلب

سوءِ تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جس قدر
کرتے ہیں معلوم جو جو ان سے امراض بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے اُنگلی نبض پر
اس کی اک اُنگلی پہ تھے قربان سو تھرماسٹر

نارسا تھیں دور بینیں اہل صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہ دوربیں اس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن پیر و جواں خرد و کلاں
تھے قوی پشت اس سے ایسے جیسے پشتے سے مکاں
جس کو نسخہ دے دیا لکھ کر وہ یہ سمجھا کہ ہاں
زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یاں

گو کہ ماتم ملک میں ہے اس کا ہر سو آج کل
پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب اور چارہ گر
جو کہ تشخیصِ مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر
خلق کو تکیہ ہو جن کی رائے اور تدبیر پر
شہر میں ہوں مرجعِ کل، ملک میں ہوں نام ور

جمع ہوں محمود خاں کے ذات میں ان کی کمال
ہے یہ سب ممکن، مگر محمود خاں ملنا محال

انجمن ترقی اردو
نئی دہلی

راستی اور راست بازی اس کی تھی ضرب المثل
اس کے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل
امتحاں کے وقت جب تھا نظم عالم میں خلل
راست بازوں کی گئی تھی ٹھیک جب ہر سو نکل
کھوٹ سے اس آنچ میں نکلا وہ خالص اس طرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کندن جس طرح

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بپا[1]
نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا
باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا
موج زن تھا جب کہ دریائے عتابِ ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چراجاتے تھے یار
ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرم سار
شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار
آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

ہو رہا تھا جبکہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں
کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پتلا عیاں
ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کنواں
بال سے باریک تر تھی راہ ان کے درمیاں
راہ‌رو دگدا میں تھے اور راہ پر خوف و خطر
اس نے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

۱- یہاں ۱۸۵۷ع کے قیامت خیز ہنگامے کی طرف اشارہ ہے - (مرتب)

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ
عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ
پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ
ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اس نے کی
اہل انصاف اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی

بالیقیں جن ملزموں[1] کو اس نے سمجھا بے خطا
مارشل لا میں ثبوت ان کی گواہی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا
جو کہ تھے نادار ، کی ان کی اعانت برملا
زر دیا ، کھانا دیا ، کپڑا دیا ، بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا ، بے گھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی جس کی خو نہ تھی
دی گواہی جس نے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی
جس نے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی
ہاتھ سے جس نے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی
بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پاؤں اک اس کا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جب کہ عنقا تھی دیانت بین ابناء الزماں
تھی امانت جس کی اس کے پاس ہلکی یا گراں
خوف میں پاس اپنے رکھا اس کو مثل پاسباں
کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں

---

۱ - مطابق دیوان حالی ، طبع اول - طبع سوم (صفحہ ۱۶۲) اور متداول نسخوں میں ''مجرموں'' چھپا ہے لیکن یہ لفظ یہاں بے محل ہے - (مرتب)

ایک عالم نا خدا ترسی میں جب بے باک تھا
اس کا دامن تھا کہ ہر دھبے سے بالکل پاک تھا

وضع داری میں نہ تھا اس کا زمانے میں بدل
وضع میں اس کی تغیر تھا نہ عادت میں خلل
وقت کی تاثیر کا اس پر نہ چلتا تھا عمل
انقلاب دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل

اس کے آگے ان نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اس پہ چلتی کچھ زمانے کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرز زندگانی اختیار
اس میں فرق آیا نہ وقتِ واپسیں تک زینہار
کوہ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار
وضع اس کی، جو کہ تھی وضع سلف کی یادگار

قوم کے از یاد رفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہد عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علایق کا تھا جو بار گراں
پر ہر اک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں
پا بہ گل دنیا میں، پر دنیا کے غم سے بر کراں
رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شادماں

ظاہرا پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا
دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اہل اللہ کا

منقبض اس کو نہ مکروہات میں پایا کبھی
غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی
دل کسی باد مخالف سے نہ کملایا کبھی
تلخیِ دوراں سے چتون پر نہ میل آیا کبھی

کی بسر دارالمحن میں بزم عشرت کی طرح
عمر کاٹی دوزخ دنیا میں جنت کی طرح

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار
گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب باد بہار
رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار
کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظر انجام پر[۱]
قوم میں اک ہم کو سناٹا سا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار
اہل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار
ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہوں گے کشت زار
جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار
مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یاں
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یاں

یا یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال
ایک اٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اس کی مثال
ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے مثال
ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں **حالی** سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخن‌ور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی

---

۱ - طبع سوم (صفحہ ۱۶۳) اور متداول نسخوں میں ''کی نظر'' چھپا ہے - تعقید لفظی کی وجہ سے ''حوادث کے انجام'' پر مرتبین کی نظر نہیں گئی -

داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

★

۴ - مرثیہ ملکہ وکٹوریا[1]

(۱۹۰۱ع)

شاہ ہوں یا ہوں گدا ، محکوم ہوں یا حکمراں
وہ نہیں مرتے کبھی جیتی ہیں جن کی نیکیاں
جاگتا ہے اُن کا تا روزِ قیامت نامِ نیک
گو کہ ہیں وہ بے خبر سوتے لحد کے درمیاں
چپ ہیں، پر ہے بحر و بر میں پڑ رہی ان کی پکار
گم ہیں لیکن چپے چپے پر ہیں ثبت ان کے نشاں
یاں رہے جب تک ، رہے ایسے مرنجان و مرنج
غیر سمجھے اُن کو اپنا اور دشمن مہرباں

---

۱ - مارچ ۱۹۰۱ع کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے یہ نظم علی گڑھ کالج کے ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے لکھی تھی۔ (مکتوبات حالی ، حصہ اول ، صفحہ ۴۰) اسی لیے پانچویں بند میں کالج کا ذکر کیا گیا ہے - (مرتب)

اور چلے جس وقت دنیا سے ، گئے دنیا میں چھوڑ
خوبیوں کی اپنی ایک اک کی زباں پر داستاں
اُن کا جینا کیسی نعمت ہوگی دنیا کے لیے
جن کا مرنا اُن کے حق میں ہے حیاتِ جاوداں
زندگی سے اُن کی ہرگز نیتیں بھرتی نہیں
پائیں گر بالفرض عمرِ نوح بھی آ کر یہاں
وقتِ رحلت یوں ترستی اُن کو رہ جاتی ہے خلق
ایک بجلی سی چمک کر ہو گئی گویا نہاں
جن کی ایسی زندگی اور جن کی ایسی موت ہو
اُن کا اُٹھ جانا ہے بدبختی کا دنیا کی نشاں
آج گھر گھر ہے وہی ماتم جہاں میں جس سے ہے
زلزلے میں کینیڈا سے لے کے تا ہندوستاں
اے کوئن وکٹوریا اک تجھ کو کیا آئی اجل[1]
لچھمی[2] دنیا کے ہاتھوں سے گئی گویا نکل

۲

ہے تری نیکی سے اُمید اے زمیں کی بادشاہ
آسمانی بادشاہت[3] میں خدا دے تجھ کو جا
کر لیے تھے سب یگانوں اور بیگانوں کے دل
نیکیوں سے تو نے اپنی فتح اے وکٹوریا[4]

---

۱ - جواہرات حالی میں یہ مصرع یوں درج ہے :
اے کوئین وکٹوریا ! تجھ کو کیا آئی اجل
یہ مصرع موزوں نہیں ، قیاس سے کام لے کر وزن پورا کیا گیا ہے ۔

۲ - لچھمی : ہندوؤں میں دولت کی دیوی کا نام ہے ۔

۳ - بائبل کی زبان میں آسمانی بادشاہت سے مراد جنت ہے ۔

۴ - یہاں وکٹوریا کے لغوی معنی (فاتح ، ظفر مند) کی طرف اشارہ ہے ۔

ہے دلیل اس کے لیے کافی فقط تیری مثال
مرد پر عورت فضیلت کا کرے گر ادّعا
کیجیے اقبال‌مندی پر اگر تیری نظر
سامنے تیرے نہیں جچتا کوئی کشور کشا
مرتبہ ہے جو کہ سرحد سے تصور کی پرے
قوم کو واں تک ترے اقبال نے پہنچا دیا
کی تجارت نے ترقی عہد میں یاں تک ترے
سلطنت ہے اس کے آگے ہیچ بے چون و چرا
جس قدر علمی فتوحات اس زمانے میں ہوئیں
دہر کی تاریخ میں ملتا نہیں ان کا پتا
علم میں روزِ ازل سے تھی جو اک طاقت نہاں
صاحبی میں تیری یہ راز آشکارا ہوگیا

ہو گئے ہر برّاعظم میں ترے برپا عَلَم
تیرے بیڑوں اور جہازوں سے سمندر پٹ گیا
شاعروں کے جس قدر مدحِ سلف میں تھے غلو
حق میں تیرے وہ حقائق بن گئے سرتا بہ پا
تھی خبر کس کو ہو اک خردل کا پیڑ اتنا بڑا
جس کی شاخوں پر کریں بسرام مرغانِ ہوا[۱]

---

۱ ''آسمان کی بادشاہت ایک خردل کے دانے کے برابر ہے جسے ایک شخص نے لے کر اپنے کھیت میں بویا ۔ وہ سب بیجوں میں چھوٹا تھا پرجب وہ آگا تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوا اور ایسا درخت ہوا کہ چڑیاں آ کر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتیں ۔'' (انجیل متی باب ۱۳)۔ اس شعر میں ملکہ کے بچپن کی طرف اشارہ ہے جب کہ ان کی نسبت کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ تخت انگلستان کی وارث ہوں گی اور ان کی سلطنت اس قدر ترقی کرے گی ۔

۳

دستِ قدرت نے بنایا گو کہ تھا عورت تجھے
پر جواں مردوں پہ تھی عالم کے فوقیت تجھے
سچ ہے ''وہ وارث زمیں کے ہوں گے جو ہوں گے حلیم[1]''،
حلم سے اپنے ملی آفاق میں مکنت تجھے
''وہ تسلی پائیں گے دنیا میں جو جھیلیں گے غم[2]''،
ہو چکے غم بس تسلی دے گی اب راحت تجھے
تو مبارک تھی کہ تجھ کو صلح تھی دل سے پسند
دے گا فرزندی کا اب اپنی خدا خلعت تجھے[3]
تو مبارک تھی کہ تھا پہلو میں تیرے پاک دل
ہو مبارک خلد میں دیدار کی نعمت تجھے[4]
ملک میں اک نور تھی تو جیسے ڈیوٹ پر چراغ[5]
دیکھ کر ہوتا تھا روشن ملک اور ملت تجھے
تو نمک تھی سربسر گویا زمیں کے واسطے[6]
ملک کا مصلح تصور کرتی تھی خلقت تجھے

---

۱ تا ۶ - ان اشعار میں حضرت عیسیٰ کے پہاڑی کے وعظ (انجیل متی باب ۵) کی مختلف آیات کے حوالے ہیں :

۱ - ''مبارک وہ جو کہ حلیم ہیں کیوں کہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔''

۲ - ''مبارک وہ جو غمگین ہیں کیوں کہ وہ تسلی پائیں گے ۔''

۳ - ''مبارک وہ جو صلح کرنے والے ہیں کیوں کہ وہ خدا کے فرزند کہلائیں گے ۔''

۴ - ''مبارک وہ جو پاک دل ہیں ، کیوں کہ وہ خدا کو دیکھیں گے ۔''

۵ - ''تم دنیا کے نور ہو ، اور چراغ روشن کرکے نیچے نہیں رکھتے بلکہ چراغ دان پر رکھتے ہیں ، تب ان سب کو جو گھر میں ہیں چراغ روشنی دیتا ہے ۔ اسی طرح تمھاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تا کہ وہ تمھارے نیک کاموں کو دیکھیں ۔

۶ - ''تم زمین کے نمک ہو''، یعنی تم دنیا کی اصلاح کرنے والے ہو ۔

دشمنوں پر مہرباں تھی تو بروں سے تھی بھلی
حق نے دی اپنی خلافت کی تھی اہلیت تجھے
تجھ سے غیروں کو محبت تھی، تو تھا اپنوں کو فخر
غیر اور اپنے کریں گے یاد تا مدت تجھے
برکتیں دنیا میں پھیلیں، تیرے دم سے جس طرح
بس یونہی کنج لحد میں دے خدا برکت تجھے
فرد تھی اقبال میں تو، بے نظیر اخلاق میں
تیرے مرنے سے ہے سنّاٹا سا اک آفاق میں

۴

ہوگیا برٹن[1] تو تیرے عہدِ دولت میں نہال
ہم پہ بھی کچھ کم نہیں برسا ترا ابرِ نوال
شکر بندوں کا خدا کے جو نہیں کرتے ادا
وہ نہیں لاتے بجا شکرِ خدائے ذوالجلال
ہند نے پایا ترے دور حکومت میں وہ امن
اگلے دوروں میں نہ تھا جس کا کہیں خواب و خیال
لی گئی قحط اور وبا میں ملک کی جو یاں خبر
تھا زمانہ تیرا اس میں آپ ہی اپنی مثال
شکر آزادی کا تیرے عہد کی ممکن نہیں
سب کا اس احسان میں جکڑا ہوا ہے بال بال
ہم سمجھ لیتے کہ ہیں ہر قید سے آزاد ہم
قیدِ احساں سے ترے چھٹنے کی گر ہوتی مجال
گرچہ ممکن ہے کہ تیرے عہدِ دولت مہد میں
ہوں رعیت میں تری کچھ لوگ زار اور خستہ حال

---

۱ - Britain (برطانیہ) -

پر خدا کی سلطنت میں بھی یہی ہے حالِ خلق
یاں خوشی ہے واں مصیبت، واں سماں ہے یاں ہے کال

گو کوئی قانونِ قدرت خالی از حکمت نہیں
پر نہیں راس ایک کو جو ایک کے ہے حسبِ حال

ہوں قوانینِ الٰہی یا قوانینِ بشر
ہے برابر سب کا راضی اور خوش رہنا محال

الغرض اس سے سوا خوبی نہ تھی امکان میں
کر گئی تو راج جس خوبی سے ہندوستان میں

۵

خود ہمارے حال سے اے عازمِ دارالقرار
برکتیں عہد ہمایوں کی ہیں تیرے آشکار

ہم پڑے سوتے تھے غافل ایسی گہری نیند میں
جاگنے کا تھا نہ گویا قصد تا روزِ شمار

جہل و نادانی سے تھی نوبت گئی یاں تک پہنچ
ہوگئے تھے خود وطن پر اپنے ہم گویا کہ بار

پر جگا کر چھوڑا بانگِ طبل شاہی نے ہمیں
ایسی ڈالی ملک میں ہر سو ترقی کی پکار

سن کے اُٹھ بیٹھے صدائے طبل جو تھے تیز ہوش
سر سے اُترا نیند کا صدیوں کی وہ آخر خمار

قوم میں ڈالی بنا تعلیم کی، جس کے بغیر
کھو چکے تھے اپنا ہم ہندوستاں میں اعتبار

ہے علی گڑھ میں ہماری یہ جو قومی درس گاہ
ہے حقیقت میں یہ تیرے نام کی اک یادگار

اس کی رسمِ فونڈیشن اور جشنِ قیصری
دونوں تقریبیں ہوئی ہیں ایک ہی وقت آشکار[1]
نیو رکھنے آس کی یاں آیا ترا قائم مقام[2]
تو نے خود اس کو کتابیں بھیج کر بخشا وقار[3]
جب تلک قائم ہے کالج ، جب تلک باقی ہے قوم
یہ شہنشاہی عطیہ یاں رہے گا یادگار
ہے یقیں کالج کو پھاتا پھولتا دیکھیں گے ہم
جانشیں تیرا ، قدم پر تیرے رکھے گا قدم

٦

ہے اب اے اڈورڈ ہفتم اس کا تو نعم البدل
سایۂ شفقت گیا ہے جو ہمارے سر سے ٹل
ہے رگوں میں تیری خوں اڈورڈ اور البرٹ کا
ہوں گے عقدے ملک کے تدبیر سے سب تیری حل
ہو پھننگ امبر میں جس کی اور جڑ پاتال میں
ہوں گے پھول اُس نخل کے کیسے مبارک اور پھل
ہے لطافتِ تجھ میں ماں کی اور حلاوت باپ کی
تیری گھٹی میں پڑا ہے شربتِ شیر و عسل
باپ کی بھی تجھ کو کہہ سکتے ہیں ماں کی بھی مثال
جیسے کہہ سکتے ہیں جل کو امرت اور امرت کو جل

---

۱ - ۲۴ مئی ۱۸۷۵ع کو جب ملکہ وکٹوریا کی سال گرہ کا دن تھا ، مدرسۃالعلوم علی گڑھ کی رسم افتتاح عمل میں آئی ۔ ''رسم فونڈیشن'' کی ترکیب محل نظر ہے ۔ (مرتب)

۲ - کالج کا سنگ بنیاد لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے رکھا تھا ۔

۳ ۔ ملکہ وکٹوریا نے چند کتابیں جن کی جلدیں طلائی تھیں ، اپنے دستخط ثبت فرما کر اس موقع پر کالج کو مرحمت کی تھیں ۔
(بحوالہ جواہرات حالی ، ص ٦٢)

تم نے پھیلائی ہے اور پھیلاؤ گے نیکی سدا
ہیں گھرانے کی تمھارے نیکیاں ضرب المثل
ہو غلو اس میں نہ شاید اے برنزک خاندان
گاسپل کا کہیے گر تم کو نمونہ فی المثل
جو محبت نے تمھاری یاں سہمیں کی ہیں سر
وہ نہیں کر سکتے سر میدان میں فوجوں کے دَل
جس عقیدت کا گیا تھا ہند میں تو بیج بو
اب ملا ہے ملک کو اظہار کے آس کا محل
ہے دعا حق سے کہ جب تک عدل سے قائم ہیں ملک
تیری شاہی اور شہنشاہی رہے یا رب اٹل
ملک ہر آفت سے تیرے عہد میں مامون رہے
دبدبہ بیٹے کا ماں کی طرح روز افزوں رہے

★

۵ - نوحۂ قیصرۂ ہند[1]

(۱۹۰۱ع)

ہند پر شاق ہے اے قیصرہ رحلت تیری
تھی رعیت کے لیے موت قیامت تیری
کر لیا تھا تری سیرت نے دلوں کو تسخیر
گو کہ دیکھی نہ تھی ہم نے کبھی صورت تیری

---

۱ - یہ نظم رسالہ معارف (جلد ۴ نمبر ۱، بابت جنوری ۱۹۰۱ع) میں حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی کے نام سے شائع ہوئی تھی - شیخ محمد اسماعیل صاحب لکھتے ہیں : ''میرے دریافت کرنے پر حافظ صاحب موصوف نے خود فرمایا کہ یہ نوحہ میری تصنیف نہیں بلکہ مولانائے مرحوم نے میری فرمائش پر میرے لیے لکھا اور میرے ہی نام سے شائع ہوا تھا -'' (بحوالہ جواہرات حالی ، صفحہ ۶۴)

نام اخلاق میں اتنا ہی ترا تھا روشن
جتنی تھی دولت و اقبال میں شہرت تیری

قدر نعمت کی سدا ہوتی ہے یاں بعدِ زوال
ہوئی معلوم ترے مرنے سے عظمت تیری

ہے خبر تجھ کو بھی اے قبر میں سونے والی
یاد کرتی ہے بہت تجھ کو رعیت تیری

امن نے کھول ترقی کے دیے دروازے[1]
ملک سب ہو گیا گلزار بدولت تیری

جانشینی تجھے راس آئی چچا کی جس طرح
تیرے فرزند کو راس آئے خلافت تیری

شاہ اڈورڈ کا عالم یونہی محکوم رہے
جیسے عالم کے دلوں پر تھی حکومت تیری

عہد میں اُس کے رہے فتنے سے محفوظ جہاں
جیسے محفوظ تھی فتنوں سے حکومت تیری

★

۶ - سرسید کے دو رفیق[2]

(۱۹۰۵ع)

۱

حیف دنیا سے کیا **برکت علی خاں** نے سفر
جس سفر سے ہے جوانوں کو نہ بوڑھوں کو مفر

جس کی جانب سے ہے چوکنا گدا ہو یا کہ شاہ
گھات میں ہے جو ہر اک جان دار کی شام و سحر

---

۱ - جواہرات حالی (صفحہ ۶۴) میں یہ مصرع اس طرح ہے :
”امن نے کھول ترقی کے دیے ہیں دروازے۔“

۲ - خان بہادر ملک برکت علی خاں اور سید زین العابدین ، دونوں کی وفات ۱۹۰۵ع میں ہوئی - جواہرات حالی (صفحہ ۶۶) میں سن وفات ۱۹۰۷ع درج ہے جو درست نہیں -

پر مبارک ہے سفر اُن کا کہ جو پیش از رحیل
کر گئے لاکھوں دلوں میں نیکیوں سے اپنی گھر

فیض پہنچاتے رہے یوں اپنے بیگانے کو وہ
رہ گزر پر میوہ افشاں جیسے نخلِ بارور

ہیں وہی انسان جو آتے ہیں ہم جنسوں کے کام
ورنہ ہیں انسان سے سو بار بہتر جانور

ہیں یہی وہ لوگ جو جیتے ہیں اوروں کے لیے
کھاتے ہیں خود زخم ، پر اوروں کو دیتے ہیں ثمر

ہیں جماعت کے یہی دنیا میں وہ فردِ فرید
جو کہ مر کر توڑ جاتے ہیں جماعت کی کمر

ہیں اُمیدیں قوم کی وابستہ اُن کی ذات سے
اُن کا ماتم قوم کا ماتم ہے قصہ مختصر

کوششیں **برکت علی خاں** کی رہیں گی یادگار
جو فلاح قوم میں اُس سے ہوئی ہیں جلوہ گر

پھر نہ کھولی ایک دم ، جب تک کہ دم میں دم رہا
قوم کی خدمت پہ جب سے اُس نے باندھی تھی کمر

گو کہ ضعف و ناتوانی نے بہت پھیلائے پاؤں
کر کے چھوڑی اُس نے لیکن جو مہم کرنی تھی سر

اُس کو مشتِ استخواں لے کر پہنچنا واں ضرور
جب کسی تقریبِ قومی کی اُسے پہنچے خبر

قوم کی خدمت کا جو سید سے سیکھا تھا سبق
وہ سبق مرحوم نے بھولا نہ ہرگز عمر بھر

اس کی دل سوزی جہاں چپ چاپ کرجاتی تھی کام
واں فصیحوں کی فصاحت تھی سراسر بے اثر

روح قومیت کی اُس نے پھونک دی پنجاب میں
ہوگئے اپنے پرائے مل کے سب شیر و شکر

جو اثر رکھتا ہے گھر والوں پہ اک گھر کا بزرگ
قوم پر پنجاب میں اُس کا وہی دیکھا اثر

اس کے کاموں میں نمایش تھی نہ باتوں میں نمود
راست بازی کی تھی اک تصویر گویا سربسر

مٹ گئی افسوس عالی ہمتی کی وہ مثال
پیر و برنا میں نظیر آتی نہیں جس کی نظر

اہل ہمت چاہئیں یاں ، گو ہوں پیرِ ناتواں
ہیں جواں کس کام کے ہمت نہیں اُن میں اگر

ایسے مالی اور کمیرے گر نہ ہوتے دست یاب
پود سید کی نہ ہوتی تا قیامت بارور

دست و بازو تھے یہی اُس جاں نثارِ قوم کے
جن کی سرگرمی سے لائیں کوششیں اس کی ثمر

ورنہ تھی چھائی ہوئی بیڑے پہ سرسید کے یاس
رات اندھیری ، وقت بھیانک اور دریا پُرخطر

سربسر موجیں ڈرانی اور ہوا ناسازگار
ساحل مقصود دور اور راہ میں حائل بھنور

ان عزیزوں نے دیا اس وقت سرسید کا ساتھ
جب کہ پرچھائیں سے اس کی قوم کرتی تھی حذر

حیف یہ طبقہ ہے اب یاں کوئی دن کا میہماں
بیٹھے ہیں باندھے کمر تیار سب بہر سفر

دوست تھے سید کے جو مانند اعضائے بدن
وہ مرقع مٹنے والا ہے عزیزو سربسر

۲

ایک کا ماتم ابھی ہونے نہ پایا تھا تمام
ناگہاں اک دوسری پہنچی مصیبت کی خبر

بعد اس ماتم کے زین العابدیں خاں کی وفات
وہ اگر داغِ جگر تھا تو یہ ہے داغِ دگر

روئیے پہلے کو یا پچھلے کا ماتم کیجیے
ایک سے ہے ایک **حالی** حادثہ جاں کاہ تر

ہائے وہ سید کا عاشق اور رفیقِ غم گسار
ساتھ سید کا نہ چھوڑا جس نے ہرگز عمر بھر

کوئی چیز اس نے کبھی رکھی نہ **سید** سے عزیز
بے تکلف اس کا گھر گویا کہ تھا سید کا گھر

کی علی گڑھ میں سکونت اس کی خاطر اختیار
سب وطن اور رشتہ داری کا تعلق توڑ کر

آخرش پہلو میں **سید** کے کیا اس نے مقام
جب کیا سہاں سرائے دارِ فانی سے سفر

زندگی میں جس طرح چھوٹا نہ اس کا اس سے ساتھ
بعد مُردن بھی رہے دونوں رفیقِ ہم دگر

دیکھتے اے کاش ان بوڑھوں کے یارانے کا رنگ
وہ جواں جو طعنہ زن بوڑھوں کے ہیں اخلاص پر[1]

رنجشیں اُلفت بھری، شکوے سراسر مہر خیز
چھیڑ لطف انگیز، خفگی اس سے لطف انگیز تر

---

۱ - جواہرات حالی (صفحہ ٦۷) میں یہ مصرع یوں درج ہے:
"وہ جواں جو طعنہ زن بوڑھوں کے ہیں اخلاق پر"
لیکن مفہوم کے اعتبار سے یہاں "اخلاص" ہونا چاہیے - (مرتب)

رائے ہر اک کی جدا تیل اور پانی کی طرح
متحد لیکن مقاصد صورتِ شیر و شکر

رہ گئے ہیں چند فرد ان صحبتوں کی یادگار
ہیں مگر بجھنے کو سب ، مثلِ چراغانِ سحر

مانگیے **حالی** بس اب خالق سے پس ماندوں کی خیر
سوگ میں اگلوں کے کب تک دل حزین و چشم تر

★

۷ - مرثیہ محسن الملک

(۱۹۰۷ع)

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر
یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار
سر کر کے مہم قوم کے کام آگیا آخر

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اُس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

رہنا تھا زبس قوم کی تقدیر میں بے کس
لکھا ہوا تقدیر کا پیش آگیا آخر

نکبت کا پتا ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدر
نکبت کا مقدر کو پتا پا گیا آخر

جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اُس پہ تھے کیا کیا
پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر

جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے
وہ خون کے آنسو اُنھیں رلوا گیا آخر

یوں جیتے ہیں، یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی
دنیا کو تماشہ یہ وہ دکھلا گیا آخر

مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

★ ★ ★

فصل پنجم

جدید شاعری

(درسی ، اخلاقی اور مناظراتی نظمیں)

۱ - جواں مردی کا کام[1]

(۱۸۷۲ع)

تھا کسی ملک میں اک دولت مند
حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند

دور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا
باپ بیٹوں کی جواں مردی کا

باپ ہوں جن کے مروت والے
بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمت والے

ہو چکا عمر کا جب سرمایا
ایک دن باپ کے جی میں آیا

گھر ہے تکرار کا یہ دولت و زر
مشترک چھوڑ مرے اس کو اگر

جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم
آخر اک روز ہے مرنا تسلیم

بس کہ تھا اس کو بہت فکرِ مآل
ایک دن بیٹھ کے، سب مال و منال

اک گراں مایہ جواہر کے سوا
تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا

---

۱ - یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اس کو اردو میں بہ اضافۂ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے۔ (حالی)

پھر کہا اُن سے کہ اے اہل ہنر!
باپ کی جان فدا ہو تم پر

تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی
یہ جواہر ہے امانت اُس کی

باپ نے اُن سے کہا جب یہ سخن
پھر تو تینوں کو لگی اور ہی دھن

کہ کوئی کارِ نمایاں کیجے
جس طرح ہو یہ جواہر لیجے[1]

اُن میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے
اس کو یہ فکر سوا تھا سب سے

ایک دن اس کا کوئی واقفِ کار
کہ نہ تھا جس سے کچھ اخلاص اور پیار[2]

رکھ گیا آ کے جواں مرد کے پاس
ایک بھاری سی رقم بے وسواس

تھے رقم سے وہی دونوں آگاہ
نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ

کچھ بھی نیّت میں گر آ جائے خلل
تو یہ تھا عین خیانت کا محل

جب رقم اُس نے طلب کی اُس سے
وسوسے دل میں بہت سے آئے

---

۱ - مثنویات حالی مرتبہ شجاعت علی سندیلوی (صفحہ ۵۸) اور مثنویات حالی مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل (صفحہ ۱۰۵) میں "جواہر کیجے" درج ہے۔

۲ - مثنویات حالی کے دونوں نسخوں میں "اخلاص و پیار" درج ہے - (نسخۂ شجاعت ، صفحہ ۵۸ - نسخۂ فاضل ، صفحہ ۱۰۵)

مگر اُس شیر کی نیت نہ پھری
لی تھی جن ہاتھوں اُنھی ہاتھوں دی
نفسِ سرکش کو کیا مات اُس نے
دی رقم اور نہ دی بات اُس نے
صاحبِ زر نے جو کچھ نذر کیا
وہ بھی اُس دل کے غنی نے نہ لیا
باپ کو آن کے دی جب یہ خبر
ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر!
اک برائی سے بچے تم تو کیا
اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا؟
اک خیانت کے نہ کرنے پہ[1] یہ ناز
شرم کی جا ہے، تری عمر دراز!

منجھلے بیٹے نے پھر اک دن یہ کہا
میں جو دریا کی طرف جا نکلا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک طفلِ صغیر
گر کے پانی میں چلا صورتِ تیر
تھا جہاں یار نہ کوئی یاور
ماں کا پہلو تھا نہ آغوشِ پدر[2]
آنکھ تھی جانب مادر نگراں
ماں کنارے پہ ادھر تھی حیراں

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''پہ'' کی جگہ ''پر'' درج ہے (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۵۸ - نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۰۶) -

۲ - دونوں نسخوں میں ''آغوش مادر'' ہے - (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۵۸ - نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۰۶) -

گرچہ تھا کام خطرناک بڑا
پر اُسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا
جان و تن کی نہ رہی مجھ کو خبر
جا پڑا نام خدا کا لے کر
جان تو جا ہی چکی تھی اُس کی
پر مری شرم خدا نے رکھ لی
ایک دم بھر میں گیا اور آیا
لا کے بیٹے کو دیا ماں سے ملا
باپ نے سن کے یہ سب اُس سے کہا
کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا!
آدمیت کا کیا تم نے کام
جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے؟
نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے؟

پسرِ خورد کا اب سنیے بیاں
جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں
عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز
باپ سے اپنے کہ اے بندہ نواز!
بات گو لائق اظہار نہیں
آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں
خوب اک روز گھٹا چھائی تھی
رات آدھی کے قریب آئی تھی
شبِ تاریک میں وہ ابرِ سیاہ
کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ

اک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا
خوف چھاتی پہ چڑھا جاتا تھا

ساتھ تم تھے نہ کوئی بھائی تھا
میں تھا اور عالمِ تنہائی تھا

کوندی اک سمت سے بجلی ناگاہ
جس سے آگے کو کھلی راہ نگاہ

پڑی اک غار پہ واں میری نظر
جس کی صورت سے برستا تھا خطر

موت کھولے ہوئے تھی منہ گویا
جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا

دیکھتا کیا ہوں کہ اک مرد غریب
جس کو روتے ہیں کھڑے اُس کے نصیب

جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی
یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی

جان و تن کا نہیں کچھ نیند میں ہوش
غار کے منہ میں پڑا ہے مدہوش

اپنی ہستی کی نہیں اُس کو خبر
اور قضا کھیل رہی ہے سر پر

اجل آ جائے تو ہے روک نہ تھام
ایک کروٹ میں ہے بس کام تمام

اتنے میں اور جو بجلی چمکی
شکل پھر غور سے دیکھی اُس کی

مرد نکلا وہ شناسا میرا
تھا مگر خون کا پیاسا میرا

مجھ میں اور اُس میں عداوت گہری
ایک مدت سے چلی آتی تھی
واں عداوت پہ گر آؤں اپنی
اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی
مارنا اُس کا نہ تھا کچھ دشوار
اک اشارے میں وہ تھا لقمۂ غار
آ گیا مجھ کو مگر خوف خدا
اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا
مرتے کو مارنا بے دردی سے
ہے بہت دور جواں مردی سے
حوصلے کا ہے یہی وقت، کہ آج
ہے عدو اپنی مدد کا محتاج
جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار
کہ اسے کیجیے چل کر بیدار
واں سے جا اُس کو اُٹھا لایا میں
موت کی زد سے بچا لایا میں
منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا
اُس کو شرمندۂ احساں نہ کیا

سن کے دی باپ نے بیٹے کو دعا
اور چھاتی سے لیا اُس کو لگا
پھر بڑے بیٹوں کو بلوا کے کہا
بولو اب، کس سے ہوا کام بڑا؟
داستاں جب یہ سنی دونوں نے
باپ سے عرض کی یہ دونوں نے

خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف
پوچھیے ہم سے تو ہے یہ انصاف

جس جواہر کے طلب گار تھے ہم
اس کے لائق تھے نہ حق دار تھے ہم

اور کو¹ اس کی ہوس ناحق ہے
حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے

باپ یہ سن کے ہوا شاد بہت
اُن کے انصاف کی دی داد بہت

چھوٹے بیٹے کو بلا کر پھر پاس
پہلے خالق کا کیا شکر و سپاس

پھر جواہر اُسے دے کر یہ کہا
لو، یہ ہو تم کو مبارک بیٹا!

★

۲ - برکھا رت

(۱۸۷۴ع)

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانے والی

قدرت کے عجائبات کی کان
عارف کے لیے کتابِ عرفان

وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''کو'' نہیں ہے - (نسخہ شجاعت، صفحہ ٦١ - نسخہ فاضل، صفحہ ۱۰۸) -

وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون؟ خدا کی شان برسات

آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

وہ آئی تو آئی جان میں جان
سب تھے کوئی دن کے ورنہ[1] مہمان

گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار

بھوبل سے سوا تھا ریگ صحرا
اور کھول رہا تھا آبِ دریا

تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چارپائے

تھیں لومڑیاں زباں نکالے
اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے

چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ

تھے شیر پڑے کچھار میں سست
گھڑیال تھے رودبار میں سست

ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا
بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''ورنہ'' نہیں ہے - (نسخۂ شجاعت ، صفحہ ۶۲ - نسخۂ فاضل ، صفحہ ۱۰۹) -

بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں
اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں

گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ
تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ

گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا
اور انس نکل رہا تھا سب کا

طوفان تھے آندھیوں کے برپا
اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا

آرے تھے بدن پہ[1] لو کے چلتے
شعلے تھے زمین سے نکلتے

تھی آگ کا دے رہی ہوا کام
تھا آگ کا نام مفت بدنام

رستوں میں سوار اور پیدل
سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل

گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں
ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں

تھی سب کی نگاہ سوے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک

پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی
وہ بادِ سموم سے سوا تھی

بجھتی نہ تھی آتش درونی
لگتی تھی ہوا سے آگ دونی

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''بدن پر'' درج ہے - (نسخہ شجاعت صفحہ ، ۶۳ - نسخہ فاضل ، صفحہ ۱۱۰ -)

ساتؔ آٹھ بجے سے دن چھپے تک
جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک

ٹٹّی[1] میں تھا دن گنواتا کوئی
تہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی

بازار پڑے تھے سارے سنسان
آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان

چلتی تھی دکان جن کی دن رات
بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات

خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا
یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا

تھا شہر میں قحط آدمی زاد
سلطان[2] کا اک کنواں تھا آباد

پانی سے تھی سب کی زندگانی
میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی

تھیں برف پہ نیتیں لپکتی
فالودے پہ رال تھی ٹپکتی

پھل پھول کی دیکھ کر طراوت
پاتے تھے دل و جگر طراوت

کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی
بھر آتا تھا سن کے منہ میں پانی

---

۱ - خس کی ٹٹی مراد ہے -

۲ - لاہور میں جہاں یہ مثنوی لکھی گئی تھی ، ایک سلطان کا کنواں مشہور ہے جس کا پانی نہایت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں وہاں آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے - (حالی)

تھے جو خفقانی اور مراق
گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی

کھانے کا نہ تھا اُنھیں مزا کچھ
آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ

بن کھائے کئی کئی دن اکثر
رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر

شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے
مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے

اور صبح سے شام تک برابر
تھا العطش العطش زباں پر

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال

آنکھوں میں تھا اُن کا پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کرتے ''مم مم،،

ہر بار پکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لا کر
پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر

بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر
تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر

تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری
پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور

پُروا کی دہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
ایک آتی ہے فوج ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

مینہ کا ہے زمین پر دریڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہے منہ پر
اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر

باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار
اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی
عالم ہے تمام لاجوردی

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے

سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر
پانی میں مگر، کچھار میں شیر

زردار ہیں اپنے مال میں مست
قلاّش ہیں اپنی کھال میں مست

ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر
کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

مسجد میں ہے وردِ اہلِ تقویٰ[1]
"یا رب لنا ولا علینا"

---

۱ - یا رب ہمیں اس سے فائدہ ہو، نقصان نہ پہنچے۔

مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا
کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو، گرو گرنتھی
گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
جاتا ہے کوئی ملہار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا

بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے
اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا
چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے
ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے
کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھشا[1]
تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

ہیں شکرگزار تیرے برسات
انساں سے لے کے تا جمادات
دنیا میں بہت تھی چاہ تیری
سب دیکھ رہے تھے راہ تیری
تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت
راحت ملتی ہے بعدِ کلفت
شکریہ فیضِ عام تیرا
پیشانیٔ دہر پر ہے لکھا

---

۱ - مثنویات مرتبہ فاضل (صفحہ ۱۱۳) اور دیگر نسخوں میں "رکھیا" درج ہے جو بے معنی ہے - (مرتب)

گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے

طاؤس کو ناچنا بتایا
کوئل کو الاپنا سکھایا

جب مور ہے ناچنے پہ آتا
آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا

کوئل کو نہیں قرار اک دل
ایسی کوئی تو نے کوک دی کل

شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں
کیا پڑھ دیا آکے تو نے افسوں

سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا
اٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا

لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن
کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ
اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

دریا تجھ بن سسک رہے تھے
اور بن تری راہ تک رہے تھے

دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان
اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

جن جھیلوں میں کل تھی خاک اڑتی
ملتی نہیں آج تھاہ ان کی

جو دانے تھے خاک میں پریشان
سب آکے چڑھائے تو نے پروان

دولت جو زمیں میں تھی مخفی
آگے ترے اُس نے سب اُگل دی

پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر
واں[1] سبزہ و گل ہیں جلوہ گستر

جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے
باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے

جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے
واں[2] سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے

تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار
ہے بیر بہٹیوں سے گلنار

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں
جھولے ہیں کہ سُو بہ سُو پڑے ہیں

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن

ہیں پھول رہی خوشی سے ساری
اور جھول رہی ہیں باری باری

جب گیت ہیں ساری[3] مل کے گاتی
جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی

اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے
اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے

۱، ۲ - مثنویات کے دونوں نسخوں اور مجموعہ نظم حالی کے نسخہ لاہور میں دونوں جگہ ''وہاں'' درج ہے۔ (مرتب)

۳ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''سارے'' (بجائے ساری) اور ''سر پر'' (بجائے سر پہ) درج ہے۔
(نسخہ شجاعت، صفحہ ۶۷ - نسخہ فاضل، صفحہ ۱۱۴ -)

ہے اُن میں کوئی سلہار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی

گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا

اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں
تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں

گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی
اور تیر کے پہنچا پار کوئی

بگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی
مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی

چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے
دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے

زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی
موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی

ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں
موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں

ملاحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان
بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان

منجدھار کی رو بھی زور پر ہے
مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

بیزار اک اپنی جانؔ و تن سے[1]
بچھڑا ہؤا صحبت وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا
چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو
اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی
آپے[2] کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر تنے میں اک طرف سے اٹھا
اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آ کے لگی تڑپنے پیہم
اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھوکے
تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے
یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم
وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا
اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

---

۱ - یہاں سے اخیر تک کچھ اشعار بہ رعایت موسم اپنے حسب حال بے اختیار ٹپک پڑے ہیں - ان دنوں بہجوم امراض اور دیگر عوارض کی وجہ سے لاہور میں رہنا فی الواقع نہایت شاق معلوم ہوتا تھا اور وطن کی طرف واپس آنے کے لیے کوشش کی جاتی تھی - (حالی)

۲ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''آپے'' کی جگہ ''اپنے'' درج ہے - (نسخۂ شجاعت ، صفحہ ٦٩ - نسخۂ فاضل ، صفحہ ١١٥ -)

اے چشمۂ آبِ زندگانی
گھٹیو نہ کبھی تری روانی

جاتی ہے جدھر تری سواری
بستی ہے اسی طرف بہاری

پائے جو کہیں مری سبھا کو
دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو

اول کہیو سلام میرا
پھر دیجیو یہ پیام میرا

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا
فرقت میں تمھاری آئی برکھا

آتا ہے تمھارا دھیان جس دم
مرغابیاں تیرتی ہیں باہم

ہم تم یونہی صبح و شام اکثر
تالاب میں تیرتے تھے جا کر

جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے
صحبت کے مزے ہیں یاد آتے

ہم تم یونہی ہات میں دیے ہات
پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات

جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا
میں تم کو ادھر ادھر ہوں تکتا

آخر نہیں پاتا جب کسی کو
دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو

رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار
جی اپنا ہے ایسی رت سے بیزار

تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی
چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی

ہے سرد ہوا بدن کو لگتی
پر دل میں ہے آگ سی سلگتی

پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد
جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد

نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی
فریاد یہ دردناک اُس کی

تھا سوز میں کچھ ملا ہؤا ساز
پکڑا دل سن کے اُس کی آواز

حیرت رہی دیر تک کہ آخر
روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر

پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست **حالی**

★

۳ - نشاط اُمید

(۱۸۷۴ع)

اے مری اُمید مری جان نواز
اے مری دل سوز مری کارساز[1]

میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں میری تکیہ گاہ

عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''میری جان نواز'' اور ''میری کارساز'' مرقوم ہے (صفحہ ۱۷ و ۱۱۷ -)

کاٹنے والی غم ایام کی
تھامنے والی دلِ ناکام کی

دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ
تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ

تونے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ
تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج
کھول دیے تو نے قناعت کے گنج

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس
تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو
عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو

نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو
چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو

رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو
پانڈو کے بھی ساتھ پھری بن میں تو[1]

تو نے سدا قیس کا بہلایا دل
تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل

ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام
پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام

---

۱ - مثنویات اور مجموعۂ نظم حالی کے مختلف نسخوں میں کہیں ''پانڈوں'' اور کہیں ''پانڈووں'' درج ہے - یہاں صرف پانڈو (یعنی پانڈ کی اولاد : ارجن ، بھیم ، نکل ، سہدیو ، یدھشٹر) ہونا چاہیے -

ڈو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس
ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب
مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

ہاتھ میں جب آ کے لیا تو نے ہات
سات سمندر سے گزرنا ہے بات

ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم
کہتا ہے وہ یہ ہے عرب وہ عجم'

گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ
سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ

عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست
گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست

تو نے دیا آ کے اُبھارا جہاں
سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

ذرے کو خورشید میں دے تو کھپا
بندے کو اللہ سے دے تو ملا

———

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ
دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ
نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم اساس
تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس

———

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں "عرب و عجم" (صفحہ ۷۲ و صفحہ ۱۱۸) اور مجموعہ نظم حالی کے نسخۂ لاہور میں "عرب اور عجم" درج ہے (صفحہ ۱۵)۔

دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو
تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو

خشک تھا بن تیرے درخت امل
تو نے لگائے ہیں یہ سب پھول پھل

دل کو لبھاتی ہے کبھی بن کے حور
گاہ دکھاتی ہے شراب طہور

نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا
روز نرالا ہے تماشا ترا

کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل
جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال و قیل

روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ
ہے کہیں فردوس کہیں ہے سرگ

چھوٹ گئے سارے قریب اور بعید
ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی امید

تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت
تیرے ہی صدقے سے ملا تاج و تخت

خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند
تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند

تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں
تو نہ ہو تو ہے ابھی برہم جہاں

کوئی پڑا پھرتا ہے بہر معاش
ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش

ایک تمنا میں ہے اولاد کی
ایک کو دلدار کی ہے لو لگی

ایک کو ہے دھن کہ جو کچھ ہاتھ آئے
دھوم سے اولاد کی شادی رچائے

ایک کو کچھ آج اگر مل گیا
کل کی ہے یہ فکر کہ کھائیں گے کیا

قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک
جس میں ہو اُن کے لیے انجام نیک

ایک کو ہے تشنگی قربِ حق
جس نے کیا دل سے جگر تک ہے شق

جو ہے غرض اُس کی نئی جستجو
لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو

تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ
گل کوئی ہونے نہیں پاتا چراغ

سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد
کہتی ہے جب تو کہ اب آئی مراد

وعدہ ترا راست ہو یا ہو دروغ
تو نے دیے ہیں اُسے کیا کیا فروغ

وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو
رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو

بھاتی ہے سب کو تری لیت و لعل[1]
تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل

تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے
بزمِ عزا کو طرب آگیں کرے

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں (ص ۷۳ و ص ۱۱۹) اور مجموعۂ نظم حالی (نسخۂ لاہور ص ۷۱) میں لیت و لعل سے پہلے ''یہ'' کا اضافہ کیا گیا ہے - قافیے کا تقاضا ہے کہ لعل کا صحیح تلفظ (حرف اول و دوم مفتوح اور حرف سوم ساکن) ادا ہو - اس صورت میں ''یہ'' وزن سے خارج ہو جاتا ہے -

آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس
رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس

یاس کا پاتی ہے جو تو کچھ لگاؤ
سیکڑوں کرتی ہے آتار اور چڑھاؤ

آنے نہیں دیتی دلوں پر ہراس
ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس

جن کو میسر نہیں کملی پھٹی
خوش ہیں توقع پہ وہ زربفت کی

چٹنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ
بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ ذوق
گھوڑا جو سبزہ ہو تو نیلا ہو طوق

فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب
دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب

تیرے کرشمے ہیں غضب دل فریب
دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب

تجھ سے مہوس نے جو شوریٰ لیا
پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا

دل سے بھلایا زن و فرزند کو
لگ گیا گھن نخلِ برومند کو

کھانے سے پینے سے ہوا سرد جی
ایسی کچھ اکسیر کی ہے لو لگی

دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام
دھن ہے یہی رات دن اور صبح شام

دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا
شہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا

پیسے کو جب تاؤ پہ دیتا ہے تاؤ
پوچھتا یاروں سے ہے سونے کا بھاؤ

کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر
''رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر''

ہے اسی دھندے میں وہ آسودہ حال
تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال

تول کے گر دیکھیے اس کی خوشی
کوئی خوشی اس کو نہ پہنچے کبھی

پھرتے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت
جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت

آج جو برتن ہیں تو کل گھر گرو
ملتی ہے مشکل سے انھیں نان جو

تیرے سوا خاک نہیں اُن کے پاس
ساری خدائی میں ہے لے دے کے آس

پھولے سماتے نہیں اس آس پر
''صاحبِ عالم'' انھیں کہیے اگر

کھاتے ہیں اس آس پہ قسمیں عجیب
''جھوٹے کو ہو تخت نہ یارب نصیب''

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم
آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم

لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے
حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے

ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ
عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ

جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے
پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے

بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح
یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح

ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا
اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا

ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی
ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی

جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل
کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل

کان میں پہنچی تری آہٹ جوہیں
رختِ سفر یاس نے باندھا وہیں

ساتھ گئی یاس کے پژمردگی
ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

★

۴ - حب وطن

(۱۸۷۴ع)

اے سپہرِ بریں کے سیارو
اے فضائے زمیں کے گلزارو

اے پہاڑوں کی دل فریب فضا
اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

اے عنادل کے نغمۂ سحری
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری

اے نسیم بہار کے جھوکو
دہر ناپائدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رمنا[1]
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے
تم مرے دردِ دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اک اک تمھاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غم خواری
دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے
ہو کے خوش حال گھر میں آتے تھے

بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب
دھو کے اٹھتے تھے دل کے داغ شتاب[2]

---

۱ - مثنویات مرتبہ شجاعت (صفحہ ۷۶) اور مجموعۂ نظم نسخۂ لاہور (صفحہ ۱۹) نیز دیگر نسخوں میں رمنا ''کی جگہ رہنا'' درج ہے لیکن یہاں رمنا (بمعنی بود و باش ، بسنا ، رہنا) درست ہے -

۲ - مثنویات مرتبہ فاضل (صفحہ ۱۲۱) میں ''داغ شباب'' درج ہے - یہ ترکیب یہاں بے معنی اور بے محل ہے -

کوہ و صحرا و آسمان و زمیں
سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں

پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار
جی ہوا تم سے خود بخود بیزار

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے

سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال
شبِ مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا
جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا
پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے مورد آلام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا
تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہوگیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال
تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے
یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے؟

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار
یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار؟

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں؟
اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کو نمو تجھ سے
روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشوونما
سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

———

حملہ جب قوم آریا نے کیا
اور بجا اُن کا ہند میں ڈنکا

ملک والے بہت سے کام آئے
جو بچے وہ غلام کہلائے

شدر کہلائے راکشس کہلائے
رنج پردیس کے مگر نہ اٹھائے

گو غلامی کا لگ گیا دھبا
نہ چھٹا اُن سے دیس، پر نہ چھٹا

قدر اے دل وطن میں رہنے کی
پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی

جب ملا رام چندر کو بن باس
اور نکلا وطن سے ہو کے اداس

باپ کا حکم رکھ لیا سر پر
پر چلا ساتھ لے کے داغ جگر

پاؤں اُٹھتا تھا اس کا بن کی طرف
اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف

گزرے غربت میں اس قدر مہ و سال
پر نہ بھولا اجدھیا[1] کا خیال

دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا
دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا

تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا
آتی تھی جب اجدھیا کی ہوا

----

۱ - اجدھیا (سنسکرت: ایودھیا، ہندی: اجودھیا یا اجدھیا) اودھ میں دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک قدیم تاریخی شہر، راجہ دسرتھ کی راجدھانی - یہاں یہ لفظ ہندی تلفظ کے مطابق (بہ تخفیف یا نہیں باندھا گیا بلکہ ''دھیا'' کو ''پیا'' اور ''دیا'' کے وزن پر پڑھا جائے گا -
(مرتب)

کٹنے چودہ برس ہوئے تھے محال
گویا ایک ایک جُگ تھا ایک اک سال

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی
سید بطحٰی کے ہمم راہی
رشتے اُلفت کے سارے توڑ چلے
اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا
پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے سامان
پر نہ بھولے وطن کے ریگستان
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے
سنگریزے زمینِ بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کی چھُوٹا تھا
دل سے رشتہ نہ اُن کا ٹوٹا تھا

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور
اور ہوا ملکِ مصر پر مامور
مصر میں چار سو تھا حکم رواں
آنکھ تھی جانبِ وطن نگراں
یاد کنعان جب اُس کو آتی تھی
سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اُٹھائے تھے جس وطن میں سخت
تاج بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت بے مہری
لو تھی اُن بھائیوں کی دل کو لگی

ہم بھی حبِ وطن میں گو ہیں غرق
ہم میں اور اُن میں ہے مگر یہ فرق

ہم ہیں نامِ وطن کے دیوانے
وہ تھے اہلِ وطن کے پروانے

جس نے یوسف کی داستاں ہے سنی
جانتا ہوگا روئداد اُس کی

مصر میں قحط جب پڑا آ کر
اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر

کر دیا وقف اُن پہ بیت المال
لب تک آنے دیا نہ حرفِ سوال

کھتّیاں' اور کوٹھے کھول دیے
مفت سارے ذخیرے تول دیے

قافلے خالی ہاتھ آتے تھے
اور بھرپور یاں سے جاتے تھے

یوں گئے قحط کے وہ سال گزر
جیسے بچوں کی بھوک وقتِ سحر

اے دل ! اے بندۂ وطن ہشیار !
خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

او شراب خودی کے متوالے
گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

نام ہے کیا اسی کا حبِ وطن
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

۱۔ کھتا یا کھتی : زمیں دوز گڑھا جس میں اناج بھرا جاتا ہے۔
(نور اللغات)

کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے
کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
لو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار
پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے؟
یہ بھی اُلفت میں کوئی آلفت ہے؟
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ[1] فرقت میں
جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آ کے کابل سے یاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بارور زنہار
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
آگ سے جب ہوا سمندر دور
اس کو جینے کا پھر نہیں مقدور
گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے لالے اُن کی پڑتے ہیں
گائے یا بھینس، اونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

۱- روکھ : (ہندی) درخت -

کہیے حب وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کم تر

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد

جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

سمجھے اُن کی خوشی کو راحت جاں
واں جو نوروز ہو تو عید یہاں[1]

رنج کو اُن کے سمجھے مایۂ غم
واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم

بھول جائے سب اپنی قدر جلیل
دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل

جب پڑے اُن پہ گردشِ افلاک
اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم‌وطنو!
اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو!

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ

---

۱ - بعض نسخوں میں ''عید ہو یاں'' لکھا ہے۔

جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک
کرو دامن سے تا گریباں چاک

کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ
ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا
ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو
واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی
جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو تو پہلے بھائیوں کو پنھاؤ[1]
کہ ہے اترن تمھاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند
کوئی آزردہ ہے کوئی خورسند

مُقبلو! مُدبروں کو یاد کرو
خوش دلو! غم زدوں کو شاد کرو

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں (صفحہ ۸۱ و صفحہ ۱۲۶) اور بعض دیگر نسخوں میں "پہناؤ" لکھا ہے، لیکن یہ لفظ وزن میں نہیں آتا -

جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر
لو جو لی جائے کور و کرّ کی خبر

تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو
لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ
رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برھمو

جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی
جین مت ہووے یا ہو بیشنوی[1]

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

---

۱ - وشنو کا پیرو، ایک قسم کا ہندو فقیر۔ (نوراللغات)

ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ
لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی
جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اُکھڑنے لگے
ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی دُرّانیوں نے زر لوٹا

کبھی نادر نے قتلِ عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا

سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی

یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام
کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام

ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم
پڑتی جو سر پہ وہ اُٹھاتے تم

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے
چین کس کو ملا ہے غیروں سے

قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ
سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ

اہل دولت کو ہے یہ استغنا
کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا

شہر میں قحط کی دہائی ہے
جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے

بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا
موت کی مانگتا ہے کوئی دعا
بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں
رو کے ماں باپ کو رلاتے ہیں

کوئی پھرتا ہے مانگتا در در
ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر
پر جو ہیں ان میں صاحب مقدور
ان میں گنتی کے ہوں گے ایسے غیور

کہ جنھیں بھائیوں کا غم ہوگا
اپنی راحت کا دھیان کم ہوگا
جتنے دیکھو گے پاؤ گے بے درد
دل کے نامرد اور نام کے مرد

عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات
عید ہے دن تو شبرّات ہے رات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے
کام انھیں اپنے حلوے مانڈے سے

ان کو اب تک خبر نہیں اصلا
شہر میں بھاؤ کیا ہے غلے کا
غلہ ارزاں ہے ان دنوں کہ گراں
کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں

کال کیا شے ہے کس کو کہتے ہیں بھوک
بھوک میں کیونکہ مرتے ہیں مفلوک
سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے
اس کے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

———

اہلِ دولت کا سن چکے تم حال
اب سنو روئدادِ اہلِ کمال

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد
پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد

ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا
ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا

رہتے دو اہل علم ہیں اس طرح
پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح

عیدو والوں[1] کا ہے اگر پٹّھا
شیخو والوں میں جا نہیں سکتا

شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار
خوش نویسوں کو ہے یہی آزار

لاکھ نیکوں کا کیوں نہ ہو اک نیک
دیکھ سکتا نہیں ہے ایک[2] کو ایک

اس پہ طُرّہ یہ ہے کہ اہل ہنر
دور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر

ملی اک گانٹھ جس کو ہلدی کی
اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری

نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے
سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے

---

۱ - 'عیدو والے' اور 'شیخو والے' پہلوانوں کے دو مقابل گروہ دلی میں تھے جن میں سے ایک کے سر گروہ اور اُستاد کا نام عیدو اور دوسرے کا نام شیخو تھا - (حالی)

۲ - مطابق نسخۂ مجتبائی (صفحہ ۱۰) مثنویات کے نسخۂ شجاعت اور نسخۂ فاضل میں ''اک کو ایک'' درج ہے - (مرتب)

جس کو آتا ہے پھونکنا کشتہ
ہے ہماری طرف سے وہ گونگا

جس کو ہے کچھ رمل میں معلومات
وہ نہیں کرتا سیدھے منہ سے بات

باپ بھائی ہو یا کہ ہو بیٹا
بھید پاتا نہیں منجّم کا

کام کندلے[1] کا جس کو ہے معلوم
ہے زمانے میں اس کے بخل کی دھوم

الغرض جس کے پاس ہے کچھ چیز
جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز

قوم پر ان کا کچھ نہیں احسان
اُن کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں

سب کمالات اور ہنر اُن کے
قبر میں اُن کے ساتھ جائیں گے

قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی
نام پر کیونکہ جان کھوئے گی

تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے
خواہ بی۔اے ہوں اس میں یا ایم۔اے

بھرتے حب وطن کا گو دم ہیں
پر محبِ وَطن بہت کم ہیں

قوم کو اُن سے جو اُمیدیں تھیں
اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں

---

۱ ۔ کندلا : (ھ ، سنسکرت : کندل) سونے کا تار ، سونے کا ڈلا ۔
''کندلے کا کام'' سے مراد تار کشی کا کام ۔

ہسٹری ان کی اور جوگرفی[1]
سات پردوں میں منہ دیے ہے پڑی
بند اس قفل میں ہے علم ان کا
جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا

لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے
گویا گونگے کا گڑ ہیں کھائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں سیرِ گل تنہا
کوئی پاس ان کے جا نہیں سکتا

اہلِ انصاف شرم کی جا ہے
گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے
تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ
تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ

یہ جو دولت تمہارے پاس ہے آج
ہم‌وطن اس کے ہیں بہت محتاج
منہ کو ایک اک تمہارے ہے تکتا
کہ نکلتا ہے منہ سے آپ کے کیا

آپ شائستہ ہیں تو اپنے لیے
کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیے؟
میز کرسی اگر لگاتے ہیں آپ
قوم سے پوچھیے تو 'پن'[2] ہے نہ پاپ

منڈا[3] جوتا گر آپ کو ہے پسند
قوم کو اس سے فائدہ نہ گزند

---

۱ - تاریخ (History) اور جغرافیہ (Geography) ۔
۲ - پن: نیکی یا ثواب کا کام - پاپ: بدی یا گناہ ۔
۳ - ایک قسم کا جوتا جس میں نوک نہیں ہوتی - چوڑی ٹو کا بوٹ ۔

قوم پر کرتے ہو اگر احساں
تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش نہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو
پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو

علم کو کردو کُو بہ کُو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

سنتے ہو سامعینِ باتمکیں !
سنتے ہو حاضرینِ صدر نشیں !
جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد
بندۂ قوم اُن کے ہیں زن و مرد

باپ کی ہے دعا یہ بہر پسر
قوم کی میں بناؤں اس کو سپر
ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد
قوم پر سے نثار ہو اولاد
بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں
تُو اگر مال دے تو میں دوں جاں
اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں
ہم وطن فائدے اُٹھاتے ہیں
کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری
دخل اور خرج جن کے ہیں بھاری
اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم
مبحثِ حکمت و ادب قائم
نت نئے کھلتے ہیں دواخانے
بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے

ملک میں جو مرض ہیں عالم گیر
قوم پر اُن کی فرض ہے تدبیر

ہیں سدا اس اُدھیڑ بن میں طبیب
کہ کوئی نسخہ ہاتھ آئے عجیب

قوم کو پہنچے منفعت جس سے
ملک میں پھیلیں فائدے جس کے

رسمِ بد کا اثر جہاں پایا
حملے پر حملہ اس پہ ہونے لگا

کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر
کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر

ایک ناٹک بنا کے لاتا ہے
دوسرا اس کو کر دکھاتا ہے

لاکھ تدبیریں جی سے جوڑتے ہیں
آخر اس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں

قوم کی خاطر اُن کے ہیں سب کام
خواہ اس میں سفر ہو خواہ مقام

سیکڑوں گل رخ اور مہ پارے
لاڈلے ماں کے، باپ کے پیارے

جان اپنی لیے ہتھیلی پر
کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر

شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے
پر کوئی بات کام کی ہاتھ آئے

جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل
ملک کا آئے کوئی کام نکل

کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں
مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں

لکھے، جب تک جیے، سفرنامے
چل دیے ہاتھ میں قلم تھامے

گو سفر میں اٹھائے رنج کمال
کر دیا پر وطن کو اپنے نہال

ہیں اب اُن کے گواہ حب وطن
در و دیوارِ پیرس و لندن[1]

کہیے دنیا کا جس کو باغ جناں
ہے فرانس آج یا ہے انگلستاں

کام ہیں سب بشر کے، ہم وطنو!
تم سے بھی ہو سکیں جو مرد بنو

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ
بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں
رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں

قافلوں سے اگر ملا چاہو
ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزت سے
بھائیوں کو نکالو ذلت سے

---

۱ - تمام نسخوں میں "لنڈن" (ڈ سے) چھپا ہے۔ اسے ذہنی مرعوبیت کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ انگریزی الفاظ کے استعمال کے شوقِ بے جا کے ساتھ اُن بزرگوں کو انگریزی تلفظ پر بھی اصرار تھا۔

اُن کی عزت تمہاری عزت ہے
اُن کی ذلت تمہاری ذلت ہے

قوم کا مبتذل ہے جو انسان
بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطان

قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز
ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

عزت قوم چاہتے ہو اگر
جا کے پھیلاؤ اُن میں علم و ہنر

ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور

اب نہ سیّد کا افتخار صحیح
نہ برہمن کو شُدر پر ترجیح

ہوئی ترکی تمام خانوں کی
کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے

کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول **حالی** کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

٭

۵ - مناظرۂ رحم و انصاف

(۱۸۷۶ع)

ایک دن **رحم** نے **انصاف** سے جا کر پوچھا
کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیک نامی سے تری سخت تحیّر ہے ہمیں
ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں

دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کی کام نہیں
آنکھ میں تیری مروت کا کہیں نام نہیں
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں
دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں

قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری
سیکڑوں چڑھ گئے سولی بہ بدولت تیری
جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے

فوج راون کی لڑائی میں کھپائی کس نے؟
آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے
قید خانوں میں جہاں کے ہے پڑا غل تیرا
جتنے قیدی ہیں تری جان کو دیتے ہیں دعا

تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوئے سر تن سے جدا
اور ترے حکم سے لاکھوں ہوئے مسکن سے جدا
لطف ہے تیری طبیعت میں نہ کچھ جوش و غضب
تجھ کو خوردوں پہ ہے شفقت نہ بزرگوں کا ادب

کانپتے آتے ہیں محفل میں تری شاہ و گدا
تجھ سے تھرّاتے ہیں احباب ہوں یا ہوں اعدا

جان پہچان کا ساتھی ہے نہ انجان کا دوست
یار ہندو کا ہے تو اور نہ مسلمان کا دوست

نہیں جائز ترے مذہب میں کسی کی امداد
تیرے نزدیک برابر ہے غلام اور آزاد

دم میں تو صحبتِ دیرینہ بھلا دیتا ہے
دوستی خاک میں برسوں کی ملا دیتا ہے

طور برتاؤ کا ہے سب سے نرالا تیرا
تجھ سے روکھا کوئی دنیا میں نہ دیکھا نہ سنا

ہٹ پہ تو اپنی جہاں نام خدا آجائے
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کا گلا کٹوائے

اسی کرتوت پہ اے عدل! یہ دعوے ہیں تجھے
کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے

ایک تو ہے کہ یگانوں کے ہیں دل تجھ سے فگار
ایک میں ہوں کہ نہیں غیر بھی مجھ سے بیزار

رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا
فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا

حق کی الطاف و عنایت کا بہانہ ہوں میں
خلق کی کام روائی میں یگانہ ہوں میں

میری سرکار میں ہو جاتے ہیں سب عذر قبول
میرے دربار سے جاتے نہیں مجرم بھی ملول

لطف ہے عام سدا اہلِ خطا پر میرا
ہاتھ اٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

غم مرے سامنے شادی سے بدل جاتے ہیں
ہنستے جاتے ہیں جو یاں روتے ہوئے آتے ہیں

مجرئی شرم و مروت مرے دربار کے ہیں
بخشش و جود ملازم مری سرکار کے ہیں
موجزن ہوتا ہے جب فیض کا میرے قلزم
یاس ہو جاتی ہے انبوہ میں اُمید کے گم
مصر میں قید سے یوسف[۴] کو نکالا میں نے
اور ایوب[۴] کے بیڑے کو سنبھالا میں نے
میں ہر اک درد میں ہو جاتا ہوں انساں کے شریک
میں نہ ہوتا تو نہ دیتا کوئی محتاج کو بھیک
میں ہی دیتا ہوں یتیموں کو سہارا جا کر
میں ہی لیتا ہوں برے حال میں رانڈوں کی خبر
میرے ہی دم سے ہے آدم کا نمونہ باقی
میرے ہی دم سے ہے عالم میں نمودِ بشری
ورنہ انسان کہ ہے جرم و خطا کا پُتلا
میں نہ ہوتا تو بھلا اس کا ٹھکانا کیا تھا
بیڑا فرعون کا جب غرق فنا ہوتا تھا
میں وہاں ساحل دریا پہ کھڑا روتا تھا
تجھ سے ہوتے اگر اے **عدل** جہاں میں دو چار
لٹ گئی ہوتی کبھی کی مرے گلشن کی بہار

جب سنا **رحم** سے یہ ولولہ انگیز خطاب
کہا **انصاف** نے ہو حکم تو دوں اس کا جواب
آپ کی نیکیوں سے کس کو ہے انکار یہاں
کیوں کہ ہے ذکر جمیل آپ کا مشہور جہاں
مگر اے **رحم**! برا ماننے کی بات نہیں
نیکیاں آپ کو کر دیں نہ یہ بدنام کہیں

ہم نے مانا کہ مروت بھی بڑی ہے اک چیز
پر مروت کے لیے شرط ہے اے دوست! تمیز
کھو دیا ، جس نے مروت کو یہاں عام کیا
اس کو رسوا کیا اور آپ کو بدنام کیا
بول میٹھے نہیں ، آفت کے یہ پرکالے ہیں
اس مروت نے تری سیکڑوں گھر گھالے ہیں
دوستوں کو ہے اشارہ کہ کسی سے نہ ڈرو
دشمنوں سے یہ مدارا کہ جو چاہو سو کرو
چور چوری سے نہیں ڈرتے بدولت تیری
لیے پھرتی ہے اُچکّوں کو حمایت تیری
جتنے قزّاق ہیں یاں اُن کا مددگار ہے تو
اور سب ڈاکوؤں کا قافلہ سالار ہے تو
ہوا جس ملک پہ سرکار کا جاری فرماں
اس کو سمجھو کہ ہوا اب کوئی دن میں ویراں
باپ کا حکم نہیں مانتے فرزند رشید
اور نوکر نہیں دیتے کبھی آقا کو رسید
لڑکے اُستاد کی گھُرکی کو نہیں مانتے کچھ
بدمعاش اہلِ پولیس[1] کو نہیں گردانتے کچھ
اہلکاروں کا کچہری میں جو دیکھو بیوہار[2]
سمجھو دیوان عدالت کو کہ ہے اک بازار
پیٹ پکڑے ہوئے واں پھرتے ہیں حاجت والے
روا منہ کھولے ہوئے بیٹھے عدالت والے

---

۱ - ''رسم فونڈیشن'' کی طرح یہ ترکیب بھی حالی کی اجتہادی غلطی سمجھی جائے گی -

۲ - مختلف نسخوں میں ''بھوار'' چھپا ہے لیکن صحیح صورت ''بیوہار'' ہے -

نہیں حاکم کی مروت سے انھیں خوف مآل
''بول کیا لایا ہے؟،، اظہار کا پہلا ہے سوال

ہر طرف بیچ میں دلال ہیں کچھ چھوٹ رہے
دونوں ہاتھوں سے غرض مندوں کو ہیں لوٹ رہے

یوں تو اے **رحم** تری ذات میں جوہر ہیں بہت
خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت

ایک رہزن کو جو تو قید سے چھٹواتا ہے
بیسیوں قافلوں کو جان کے لٹواتا ہے

باپ کو ہونے نہیں دیتا جو بیٹے سے خفا
بے ادب رکھنا اُسے چاہتا ہے تو گویا

مار پر اٹھنے نہیں دیتا جو اُستاد کا ہاتھ
یہ سلوک اچھے نہیں ہیں ترے شاگرد کے ساتھ

میٹھی باتوں میں تری زہر ہلاہل ہے بھرا
تیرا آغاز تو اچھا ہے پہ انجام برا

کاش تو بھی مرے قانون پہ چلتا اے **رحم**
اپنے اندازے سے باہر نہ نکلتا اے **رحم**

بے مروت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا
جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

راست بازی جو سنی ہو وہ طبیعت ہے مری
اور عدالت جسے کہتے ہیں وہ عادت ہے مری

معتدل نام ہے جس کا وہ مزاج اپنا ہے
بھاگ اس ملک سے جس ملک میں راج اپنا ہے

میں ہی تھا جس نے کہ ویرانوں کو آباد کیا
میں ہی تھا جس نے کہ اخباروں کو آزاد کیا

حکم سے میرے ہوئی کونسلوں کی ماموری
رائے سے میری بنیں سلطنتیں جمہوری
کھو دیا میں نے نشاں سلطنت شخصی کا
اور دنیا سے غلامی کو مٹا کر چھوڑا

مجلسیں سیکڑوں ملکوں میں بٹھائیں میں نے
راہیں اغلاط سے بچنے کی سُجھائیں میں نے
حکم و قانون کسی گھر میں مقیّد نہ رہا
سلطنت نام ہے اب قوم کی پنچایت کا

جس طرح ظلم کا اے **رحم** ! روادار نہیں
میں اسی طرح سے تیرا بھی مددگار نہیں
سر ذرا جس نے اُٹھایا اُسے کھو کر چھوڑا
پاپ کی ناؤ کو دریا میں ڈبو کر چھوڑا

حکم عالم میں مرا شرق سے تا غرب ہے عام
جس نے مانا نہ مرا حکم، رہا وہ ناکام
رائے کرتی نہیں میری کسی حالت میں خطا
تیر لگتا ہے مرا جا کے نشانے پہ سدا

میں دکھا دیتا سیاست کی گر اپنی تلوار
چل نہ سکتا کبھی قابیل کا ہابیل پہ وار
کارفرما ہے جہاں میری عدالت اے **رحم**
دم نہیں مارتی واں تیری مروت اے **رحم**

واں تعصب کا پتا اور نہ عداوت کا گزر
نہ قرابت کا نشاں اور نہ محبت کا اثر
حکم جاری ہے جدھر دیکھیے آزادی کا
بڑھ کے چلتا نہیں واں شاہ سے لے تا بہ گدا

کج روی مکر سے کہتی ہے میں آئی تو چل
ٹیڑھے ترچھوں کے بل اک آن میں جاتے ہیں نکل

پاک بازوں کو نہیں عہد میں میرے کھٹکا
جو کنوئڈے[1] ہیں وہی مجھ سے کھٹکتے ہیں سدا

سات پردوں میں اگر عیب کسی کا ہے چھپا
نہ ہوا آج تو کل ہوگا مقدر رسوا

ہیں خطاکار کے دشمن در و دیوار یہاں
بھائی بھائی کے نہیں ہوتے مددگار یہاں

اور اگر عیب سے ہے پاک کسی کا دامن
غم نہیں اس کا ہو گر سارا زمانہ دشمن

نہ رعیت کا اُسے خوف نہ کچھ شاہ کا ڈر
نہ اُسے چور کا خطرہ نہ اُسے ساہ[2] کا ڈر

نہ عدالت میں اُسے ڈر کسی فریادی کا
اور نہ کچھ دغدغہ اخباروں کی آزادی کا

جو ہنرمند ہیں دل اُن کے بڑھاتا ہوں میں
خوبیاں اُن کی زمانے میں جتاتا ہوں میں

بے ہنر ہو کسی پیرائے میں یاں جلوہ نما
عہد میں میرے ہنرمند نہیں بن سکتا

یاں نہ اُستاد کو شاگرد کی اصلاح سے عار
اور نہ شاگرد کو اپنی غلطی پر اصرار

سنتے جاہل سے ہیں گر فائدے کی بات حکیم
مستمندوں کی طرح کرتے ہیں اُس کو تسلیم

---

۱ ۔ کنونڈا: (۱) شرمندہ، احسان مند ۔ (۲) ذلیل، رسوا ۔ (۳) ناقص، عیب دار (نوراللغات)

۲ ۔ مختلف نسخوں میں ''شاہ کا ڈر'' چھپا ہے، لیکن یہاں ''ساہ'' ہونا چاہیے جو ہندی میں مہاجن اور مال دار کے علاوہ کھرا اور دیانت دار کے معنی میں بولا جاتا ہے ۔ (مرتب)

نوکر آقا کی جتاتا ہے اگر کوئی خطا
بن نہیں آتا کچھ آقا سے ندامت کے سوا
کرنے پاتے نہیں گاہک پہ دکاں دار ستم
جنس یاں تل نہیں سکتی کبھی مقدار سے کم
بیل بے وجہ نہیں آر کسی کی کھاتا
سدھ منے گھوڑے پہ چابک نہیں اٹھنے پاتا
اونچے اونچوں سے یہاں لیتے ہیں خدمت پوری
اور مزدوروں کو دیتے ہیں کھری مزدوری
محنتی جتنے ہیں یاں خرم و دل شاد ہیں سب
خوار پھرتے ہیں وہی جو کہ ہیں آرام طلب
اہل مقدور کو کھٹکا نہیں کچھ چوروں سے
زور مند آنکھ ملاتے نہیں کم زوروں سے
خوب کو خوب سمجھتے ہیں یہاں زشت کو زشت
ناپ سے کم نہیں لگتی کہیں تعمیر میں خشت
جھوٹے سچوں کا نہیں بھیس بدلنے پاتے
دام بازار میں کھوٹے نہیں چلنے پاتے
جس طرف جائیے واں امن و اماں کا ہے عمل
فتنہ سرحد سے مری جاتا ہے کترا کے نکل

جس قلم رو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں
ظلم کے ہاتھ میں واں فکر و عمل کی ہے عناں
دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب[1] وہاں
اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں

---

۱ - صحیح لفظ معاتب ہے مگر اردو میں بجائے معاتب کے معتوب بولا جاتا ہے جیسے بجائے مفعو کے معاف - پس اردو میں یہ ہی صحیح اور فصیح ہے - (حالی)

نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو حلقہ بگوش
رام لچھمن کی طرح پھرتے ہیں واں خانہ بدوش

ماں رکھا ہے جنھیں قوم نے اولاد رسول ؐ
قوم کے ہاتھ سے ہو جاتے ہیں پیاسے مقتول

زَکَرِیّاؑ کی طرح جو ہیں خدا کے پیارے
اُن کے سر پر ہیں سدا ظلم کے چلتے آرے

زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں
اور یوسفؑ سے برادر کو دغا دیتے ہیں

گفتگو ختم پہ **انصاف** کی جب آ پہنچی
عقلِ پُرکار قضا کار وہاں جا پہنچی

واں جو دیکھا تو ہے دو بھائیوں میں کچھ تکرار
اور ہر اک کو بزرگی پہ ہے اپنی اصرار

رحم ادھر **عدل** سے کہتا ہے کہ تُو ہے کیا چیز
اور ادھر **رحم** کو ہے **عدل** سمجھتا ناچیز

عقل نے دونوں کی تقریر سنی سر تا پا
کہہ چکے وہ تو یہ سنجیدہ جواب اُن کو دیا

خیر اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں
ایک سے ایک ہو تم بہتر و برتر دونوں

صاف کہتی ہوں سن اے **رحم** نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر **انصاف**

اور سن اے **عدل**! نہیں اس میں تکلف سر مو
گر نہ ہو **رحم** تو اک دیدۂ بے نور ہے تو

دونوں تم خلق کے ہو مایۂ آرام و شکیب
گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب

سرسری فیصلہ تو یہ ہے اگر تم مانو
اور نہیں مانتے گر بات مری ، تم جانو

ابھی اک نکتے میں تم دونوں کو جھٹلاتی ہوں
لو سنو غور سے ، میں کہتی ہوں اور جاتی ہوں

فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
جب کہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو

وہی اک شے ہے کہ ہے عدل کہیں نام اس کا
کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا

رحم کہلائے ، جو مظلوم کی فریاد سنے
عدل ٹھہرے ، جو سزا ظالمِ بے رحم کو دے

وہی شفقت ہے کہ استاد کی ہے مار کبھی
اور ماں باپ کی ہو جاتی ہے چمکار کبھی

وہی شفقت ہے کہ ہے گھور کہیں پیار کہیں
وہی جلوہ ہے کہ ہے نور کہیں نار کہیں

کہیں وہ مِہر کی صورت میں عیاں ہوتی ہے
اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے

کہیں وہ قند مکرر کا مزا دیتی ہے
اور کہیں چاشنیِ موت چکھا دیتی ہے

یہی شفقت تھی کہ جب اس نے سمجھایا انجام
شیخ فاروق رضؓ نے بیٹے کا کیا کام تمام

یہی شفقت تھی کہ جب ہو گیا بے جان پسر
ایک برچھی سی لگی باپ کے دل میں آ کر

یہی شفقت ہے کہ زخمی کہیں کرواتی ہے
یہی شفقت ہے کہ پھر زخم کو بھرواتی ہے

رحم اور **عدل** سے جب **عقل** نے تقریر یہ کی
اور دی ساتھ ہی **حالی** نے شہادت اس کی

رہی باقی نہ فریقین کو جائے انکار
چار و ناچار کیا یک جہتی کا اقرار

بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ تھے گویا ایک[1]
مل کے ہو جائیں کہیں جیسے کہ دو دریا ایک

★

۶ - تعصب و انصاف

(۱۸۸۲ع)

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا
جب کہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا

اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی
اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی

اپنی ہر آن پہ ہم مرتے تھے
اپنی رعنائی کا دم بھرتے تھے

اپنے انداز کے سودائی تھے
اپنے جلوے کے تماشائی تھے

کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ
سر دُھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ

---

۱ - مثنویات کے دونوں نسخوں (صفحہ ۹۵ و صفحہ ۱۳۷) اور مجموعۂ نظم حالی کے نسخۂ لاہور (صفحہ ۳۸) میں ''گویا تھے ایک'' لکھا ہے -

آپ خوبی پہ تھے اپنی مفتوں
خود ہی لیلیٰ تھے ہم اور خود مجنوں

جس جزیرے میں ہوئے تھے پیدا
اپنی لے دے کے وہی تھی دنیا

روم کی تھی نہ خبر شام کی تھی
آگہی طوس نہ بسطام کی تھی

تھے تماشائی دشت پُر خار
کبھی گلشن کی نہ دیکھی تھی بہار

پی کے شوراب ہی ہوتے تھے بحال
کہ نہ چکھا تھا کبھی آب زلال

نالۂ زاغ و زغن پر تھے فدا
نہ سنی تھی کبھی بلبل کی صدا

سیر و انگوزہ[۱] کی بو پر تھے نثار
کہ نہ برتا تھا کبھی مشک تتار

پرنیاں جانتے تھے کمبل کو
کہ نہ برتا تھا کبھی مخمل کو

اوپری تھی نہ سنی بات کبھی
بدلے دیکھے تھے نہ دن رات کبھی

ہم بسر کرتے تھے جس عالم میں
واں سماں ایک تھا ہر موسم میں

رخ ہوا کا نہ بدلتا تھا کبھی
موسم آکر نہ نکلتا تھا کبھی

ایک ہی فصل پہ تھا دار و مدار
واں خزاں جا کے نہ آتی تھی بہار

---

۱ - سیر : لہسن ، انگوزہ : ہینگ

ایک سے رہتے تھے دن رات سدا
آسماں کو تھی نہ گردش اصلا

تھی سمجھ پیر و جواں کی یکساں
عقل تھی خرد و کلاں کی یکساں

رکھتے تھے ایک سبق ازبر یاد
مبتدی ، منتہی ، شاگرد ، استاد

واں نہ تھی حدِ بلوغِ صبیاں
پیر بالغ تھے ، نہ بالغ تھے جواں

نئی بولی کا وہاں صرف نہ تھا
تیس حرفوں کے سوا حرف نہ تھا

تھے خدا کے وہی ننیانوے نام
اور لینا تھا وہاں نام حرام

اہلِ دولت کی نہ تھی عام عطا
ایک ہی سمت برستی تھی گھٹا

تھا نہ دینداروں کو غیروں سے لگاؤ
ایک ہی سمت تھا رحمت کا جھکاؤ

دعوے غیروں کے تھے سب بے صرفہ
فیصلے ہوتے تھے نت یک طرفہ

راستی کا نہ تھا غیروں پہ گماں
حق نہ دائر تھا فریقین میں واں

تھی عناصر میں نہ واں آگ نہ باد
خلق سے اک موئی مٹی تھی مراد

حس و حرکت کے کوئی پاس نہ تھا
واں کا حیوان بھی حساس نہ تھا

تھی درختوں کو نہ واں نشو و
چلنے پاتی تھی نہ گلشن میں ہوا

گل شگفتہ تھے نہ پودے شاداب
واں زمانے پہ نہ آتا تھا شباب

وہی مرغوب تھی واں پوشش تن
جس سے آدم[۴] نے چھپایا تھا بدن

تھے پسندیدہ اسی شان کے گھر
کی تھی حوّا نے جہاں عمر بسر

اسی انداز کے چلتے تھے جہاز
کشتیِ نوح کا جو تھا انداز

تھی اسی نسخے پہ موقوف شفا
جو تھا بقراط نے ترتیب دیا

ٹوٹ سکتی نہ تھی واں رائے قدیم
تھا اسٹ لکھ گئے جو اگلے حکیم

واں کسی طرح نہ ممکن تھا خلا
واں نہ پانی تھا مرکب نہ ہوا

گھوڑے دوڑائے تھے اگلوں نے جہاں
وہی جولاں گہِ مردم تھی وہاں

کی تھی جس جا قدما نے منزل
بڑھنے پاتے تھے نہ واں سے محمل

علم و فن تھے نئے سارے مردود
غیب کے واں تھے خزانے محدود

نئی لذت سے تھی ہر طبع نفور
نعمتیں حق کی وہاں تھیں محصور

سب کی گُدّی پہ لگی تھیں آنکھیں
کچھ نہ آگے نظر آتا تھا اُنھیں
پیچھے گر دیکھتے تھے ریگستان
سوجھتا تھا اُنھیں وہ آبِ رواں
آگے ہوتا تھا اگر چشمۂ آب
وہ سراسر نظر آتا تھا سراب
روشنی رکھتی تھی اُن سے اَن بن
جیسے خفّاش سے سورج کی کرن
تھا لکیر اپنی پہ ایک ایک فقیر
دل پہ ہر نقش تھا پتھر کی لکیر
رسم و عادت نہ بدلتی تھی وہاں
برف جم کر نہ پگھلتی تھی وہاں
آگ واں بجھ کے سلگتی کم تھی
اور سلگتی تھی تو لگتی کم تھی
شان میں واں نہ سنا تھا حق کی
''کل یوم ہو فی شان[۱]'' کبھی
وضع میں تھا نہ تغیّر خو میں
جاے دل سنگ تھا ہر پہلو میں
سمجھا جاتا تھا وہ دل بے فرماں
مُہر جس دل پہ نہ ہوتی تھی وہاں
بات مشکل تھی دلوں سے جانی
نقش تھے دل کے خطِ پیشانی
غیر کی بات خطا، اپنی صواب
سب سوالوں کا تھا واں ایک جواب

---

۱ - یعنی ہر آن اس کی ایک نرالی شان ہے۔

چڑھ کے گر بحث کو جاتے تھے کہیں
فتح کا پہلے سے ہوتا تھا یقیں
تھی وہاں حق کی یہی ڈیفینیشن[1]
منہ سے جو اپنے نکل جائے سخن
اسی عالم میں پلے تھے ہم بھی
اسی ساون کے تھے اندھے ہم بھی

جانتے تھے کہ جہاں میں ہم پر
ختم ہیں سارے کمالات بشر
حق نے جو ہم پہ کیے ہیں احساں
ان سے محروم ہے نوعِ انساں
سب سے ہر بات میں ہم ہیں افضل
اب نہیں کوئی ترقی کا محل
اپنے حصے میں ہے ساری تہذیب
خانہ پرور ہے ہماری، تہذیب
جو قدیم اپنا چلن ہے اور چال
خردہ‌گیری کی نہیں اس میں مجال
ہے بری عیب سے خوراک اپنی
پاک دھبے سے ہے پوشاک اپنی
رسم اپنی نہیں بے جا کوئی
طور اپنا نہیں بھونڈا کوئی
آدمیت کے ہمی ہیں مصداق
ہم سے سیکھے کوئی حسنِ اخلاق

---

۱ - Definition : تعریف -

سب سے عالی ہیں خیالات اپنے
سب مسلّم ہیں کمالات اپنے

ہم چلے جاتے ہیں جس رستے پر
واں نہ کھٹکا ہے کہیں کا نہ خطر

تھے سمائے ہوئے جو دل میں خیال
تھا تصور بھی خلاف ان کے محال

جس کو اک بار برا جان لیا
عمر بھر پھر اسے اچھا نہ کہا

ٹوٹتی تھی نہ کبھی اپنی دلیل
وہی دعویٰ تھا وہی اپنی دلیل

وہم و شک کی کوئی صورت ہی نہ تھی
ہم کو تحقیق کی حاجت ہی نہ تھی

جو بدلتی تھی نہ بدلی تھی کبھی
رائے ایسی تھی، پسند ایسی تھی

ہم سمجھتے تھے نہ سمجھانے سے
اور الجھ جاتے تھے سلجھانے سے

سچ وہی تھا جسے سچ جان لیا
جھوٹ تھا، جھوٹ جسے مان لیا

حق و باطل کی یہی تھی میزان
جھوٹ اور سچ کی یہی تھی پہچان[1]

ذات باری کو نہیں جیسے زوال
رائے اپنی بھی بدلنی تھی محال

۱۔ مثنویات کے دونوں نسخوں میں "تھی یہی میزان" اور "تھی یہی پہچان" درج ہے۔ (نسخۂ شجاعت صفحہ ۱۰۰، نسخہ فاضل صفحہ ۱۴۱)

کوہ ہٹ جائے تو یہ تھا ممکن
ہم نہ ہٹتے تھے جگہ سے لیکن

حسن ظن تھا یہ سمجھ پر اپنی
غلطی کا نہ تھا گماں تک نہ کبھی

تھے لڑکپن کے خیالات تمام
دل میں آترے ہوئے شکل الہام

دیکھتے سنتے تھے جو اس کے خلاف
نظر آتا تھا وہ سب لاف و گزاف

تھی نئی بات سے یاں تک نفرت
ہوتی تھی سننے سے پہلے وحشت[1]

بو نئی شے کی جو پا لیتے تھے
ناک بن دیکھے چڑھا لیتے تھے

عقل کی تھیں نہ صلاحیں مقبول
تھی وہ سرکار میں اپنی معزول

فکر پر زور نہ ڈالا تھا کبھی
ہوش ہم نے نہ سنبھالا تھا کبھی

جو کہ تھا اپنی کتابوں میں لکھا
کوئی حرف اس میں جز الہام نہ تھا

جو کہانی تھی بزرگوں نے کہی
تھا وہی فلسفہ اور علم وہی

تھا لباسوں میں لباس اپنا لباس
اور سب سوختنی بے وسواس

تھی زباں اپنی زبانِ پاکاں
ماسوا، اہلِ جہنم کی زباں

۱- مثنویات کے نسخوں میں مصرع ثانی میں بھی نفرت (بجائے وحشت) درج ہے- (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۱۰۰- نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۴۱)-

جلوۂ دہر کا باقی تھا نہ ہوش
تھے نشے میں یہ خودی کے مدہوش

کان میں پڑتی تھی جب بات نئی
غیر ہو جاتی تھی حالت دل کی

خرقِ عادت بھی اگر دیکھتے تھے
آنکھ اُٹھا کر نہ ادھر دیکھتے تھے

نئی آواز سے چونک اُٹھتے تھے
اوپری شکل پہ بھونک اُٹھتے تھے

ساری دنیا سے نرالا تھا مذاق
ہم کو تھا زہر بھی اپنا تریاق

اپنی حجت کو قوی جانتے تھے
بات ہر پھر کے وہی مانتے تھے

تھا نہ قصد حق و باطل مطلق
جو پڑھا تھا وہی ازبر تھا سبق

خصم سے بحث اگر کرتے تھے
حق سے ہم قطع نظر کرتے تھے

کاٹ دی خصم نے جو بات کہی
بحث و تکرار کی غایت تھی یہی

خصم کی بات کو کرنا تسلیم
اپنے نزدیک ہزیمت تھی عظیم

حق کا خطرہ جو کبھی آتا تھا
نفس آپ اپنے کو جھٹلاتا تھا

دشمنی کے یہی معنے تھے کہ جو
ہم کہیں بات وہ تسلیم نہ ہو ؟

ہم اندھیرے کو اگر کہتے تھے نور
دوستوں کو یہی کہنا تھا ضرور

گر خلاف اپنے کوئی بول اٹھا
اس سے بڑھ کر کوئی بدخواہ نہ تھا

ذکر غیروں کا نہ تھا بے نفریں
کوئی مردود تھا اور کوئی لعیں

غیر کے واسطے تھی نارِ سعیر
باغِ فردوس تھی اپنی جاگیر

اور تھے حرص و ہوا کے بندے
ہم تھے مخصوص خدا کے بندے

بخششیں ختم تھیں ساری ہم پر
وقف تھی رحمتِ باری ہم پر

نیک اعمال تھے غیروں کے تباہ
اور مغفور تھے سب اپنے گناہ

عین تحقیق تھی اپنی تقلید
شرک اپنا تھا سراسر توحید

تھا بدی کا نہ گنہ کا کچھ ڈر
پاس ایسی کوئی رکھتے تھے سپر

سب دعا گو تھے ہمارے ملکوت
تھے ہمیں آدم و حوا کے سپوت

حوضِ کوثر پہ تھا قبضہ اپنا
سلسبیل اپنی تھی طوبیٰ اپنا

اپنی ظلمت تھی سراسر تنویر
اپنے اندھوں کو بھی کہتے تھے بصیر

رہتے جنت میں نہ تھے ہم ساجھی
غیر ناری تھے سب اور ہم ناجی
تھے قضا اور قدر کے مالک
ہم تھے اللہ کے گھر کے مالک

عصبیت میں رہے جب تک چور
کھینچتے یوں ہی رہے آپ کو دور
نظر آتا تھا نہ کچھ پست و بلند
تھے ہم اک کابۂ تاریک میں بند
دی جب انصاف نے دستک آ کر
حجرۂ تنگ سے نکلے باہر
جلوۂ علم و یقیں کو دیکھا
آسماں اور زمیں کو دیکھا
رخ حقیقت نے دکھایا ہر سو
چاندنا سا نظر آیا ہر سو
کی تعصب سے جونہی قطع نظر
ہوا اک اور ہی عالم میں گزر
علم پر تھا نہ جہاں کوئی حجاب
دھوکا پانی کا نہ دیتا تھا سراب
جھوٹ سے سچ نتھر آتا تھا الگ
دودھ پانی نظر آتا تھا الگ
نکتہ چیں یار تھے واں یاروں کے
قدرداں غیر تھے اغیاروں کے
دور بیگانہ نہ تھے خویش سے واں
خویش اول تھا نہ درویش سے واں

عیب سب کہتے تھے اپنے خوش خوش
دوغ واں اپنی بھی ہوتی تھی ترش

تھی نجس کوئی نہ انساں کی زباں
گاڈ بھی کہتے تھے اللہ کو واں

حق کی پہچان جز اخلاص نہ تھی
حق کی پوشش کوئی واں خاص نہ تھی

ساتھ اغیار کے کھاتے تھے اگر
کبھی ایماں کا نہ ہوتا تھا ضرر

صلحا لمپ جلاتے تھے وہاں
اتقیا میز پہ کھاتے تھے وہاں

نہ سمجھتا تھا وہاں کوئی بشر
آپ کو نوعِ بشر سے بہتر

بھائی انساں تھے سب انسانوں کے
میت ہندو تھے مسلمانوں کے

ایک معدن کے تھے سب لعل و گہر
ایک ڈالی کے تھے سب برگ و ثمر

اشعری ، معتزلی[1] ، لا مذہب
ایک ماں باپ کی اولاد تھے سب[2]

---

۱ - معتزلی : عقلیت پسند حکما و متکلمین ، قدریہ - اشعری : وہ حکما جو عقل پروحی و وجدان کی فوقیت کے قائل اور جبریت کی طرف مائل تھے -

۲ - مثنویات کے دونوں نسخوں میں یہ شعر اور اگلے دو شعر غلط چھپے ہیں : (۱) ''اک ماں باپ'' (بجائے ''ایک ماں باپ'') (۲) ''رائے پر'' (بجائے ''رائے پہ'') (۳) ''کفر وہاں'' (بجائے ''کفر واں'') (۴) '' آتے تھے'' (بجائے ''آتے نہ تھے'') (۵) ''تھے بوجہل'' (بجائے ''تھے وہ بوجہل -'')
(نسخہ شجاعت ، صفحہ ۱۰۳ - نسخہ فاضل ، صفحہ ۴۴ ۱-)

اپنی ہر رائے پہ کرنا اصرار
کفر واں بس یہی پایا تھا قرار

ہٹ سے باز آتے نہ تھے جو زنہار
تھے وہ بوجہل کی اُمت میں شمار

پاؤں واں جن کے پھسل جاتے تھے
خود پھسل کر وہ سنبھل جاتے تھے

ٹیڑھ واں دل کی نکل سکتی تھی
رائے اپنی بھی بدل سکتی تھی

دیکھ حجت کو قوی پیر و جواں
بند ہو جاتے تھے بچوں سے وہاں

حق کی آواز جہاں آتی تھی
مت کروڑوں کی بدل جاتی تھی

پاک عقلیں نہیں خطا سے نہ علوم
جز نبی کوئی نہ تھا واں معصوم

غور ہر بات میں کی جاتی تھی
مشورت عقل سے لی جاتی تھی

تھی وہاں عقل معطل نہ حواس
سب قوی کام میں تھے بے وسواس

آنکھ رہ سکتی نہ تھی بِن دیکھے
کان سننے سے نہ باز آتے تھے

سوجھتی تھی جو انوکھی کوئی چیز
جانچتی تھی اسے واں چشمِ تمیز

سنتے تھے بات نرالی جس دم
کستے تھے اس کو محک پر پیہم

کڑوے اور میٹھے کو چکھ لیتے تھے
کھرے کھوٹے کو پرکھ لیتے تھے

پھول ہر خار سے چن لیتے تھے
بھوگ[۱] نیچوں کے بھی سن لیتے تھے

عادتیں سب کی بدلتی ہیں سدا
ایک اللہ کی عادت کے سوا

عیب جس رسم میں پا لیتے تھے
دل وہیں اس سے ہٹا لیتے تھے

اُجلی پوشاک جو مل جاتی تھی
ملگجے کپڑوں سے شرم آتی تھی

دیکھ لی جس نے کہ شمعِ کافور
تھا وہ چیکٹ بھرے ڈیوٹ سے نفور

ہاتھ آ جاتا تھا جب مال نیا
پھینک سب دیتے تھے عطار دوا

گر کے ہو جاتے تھے گھر جن کے کھنڈر
گھر کی واجب تھی مرمت اُن پر

نت نئی ریت نکلتی تھی وہاں
رُت سماں روز بدلتی تھی وہاں

قافلے چلتے تھے دن رات تمام
کسی منزل پہ نہ کرتے تھے مقام

قبلہ تھا علم الٰہی اُن کا
تھا سفر لامتناہی اُن کا

---

۱ - بھوگ : (دینا یا سنانا کے ساتھ) گالیاں دینا ، (کھانا یا سننا کے ساتھ) گالیاں کھانا - (نوراللغات)

تشنۂ علم تھے واں سب ایسے
پیاسے پانی کے ہوں طالب جیسے

نہ ''مجسطی،، پہ قناعت تھی انھیں
نہ ''اشارات،، کفایت تھی انھیں

عرش تحقیق تھا استھان اُن کا
مصر تیرتھ تھا نہ یونان اُن کا

دیکھا جب عالمِ انصاف کا رنگ
ہم کو خود آنے لگا آپ سے ننگ

خوبیاں اپنی تھیں جو ذہن نشیں
اُن پہ ہم کرنے لگے خود نفریں

عیب سب اپنے نظر آنے لگے
آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے

ہوئی وہ بزمِ خیالی برہم
تھا طلسمات کا گویا عالم

جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا
اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا

تھا کیا جس کو یقیں چشمۂ آب[1]
وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب

قصر و ایواں کا گماں تھا جن پر
نکلے آخر وہ گڑھے اور کھنڈر

تھا سبک دانۂ خردل سے سوا[2]
کوہ الوند جسے سمجھا تھا

---

۱ - ''تھا جس کو یقین چشمۂ آب'' - (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۱۰۵ - نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۴۵)

۲ - ''کے سوا'' - (صفحہ ۱۰۵ و ۱۴۵) -

جب ہر اک قوم کا ساماں دیکھا[1]
ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا

نکلے سب ہیچ خیالات اپنے
ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے

آپ کو اونٹ سمجھتا تھا بڑا
نکلا جب تک کسی گھاٹی سے نہ تھا

چوٹیاں آئیں جو پربت کی نظر
پھر اٹھایا نہ کبھی اونٹ نے سر

بھنگا[2] جب تک رہا گولر میں نہاں
تھا وہی اس کے تصور میں جہاں

پر وہ گولر سے جو باہر آیا
اپنی ہستی سے بہت شرمایا

پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا
حسن پر اپنے گماں تھے کیا کیا

منہ جب آئینے میں دیکھا جا کر
ہم کو اک شکل مہیب آئی نظر

ہوا حیرت سے دگرگوں احوال
ڈر گئے دیکھ کے اپنے خط و خال

دیکھا جب آپ کو بالکل معیوب
چھپ گئے غیروں کی آنکھوں کے عیوب

یک قلم ہو گئی نخوت کافور
بن گیا رشک ہمارا وہ غرور

---

۱ - ''ہر اک قوم'' (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۱۰۵ - نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۴۵) -

۲ - نہایت چھوٹے، پردار کیڑے جو گولر میں بھرے رہتے ہیں -

ناخن فکر نے کی دل میں خراش
عیب جویوں کی لگے کرنے تلاش

جن کے طعنوں کی تھی ہم پر بھرمار
اُن کے ہم دل سے ہوئے شکرگزار

ہم نے جانا کہ یہی ہیں دل سوز
چل رہے تیر ہیں جن کے دل‌دوز

اُن کا غصہ ہے سراسر رحمت
زہر میں اُن کے بھرا ہے امرت

اُنھی بندوں کے ہیں ایماں سچے
یہی کافر ہیں مسلماں سچے

قائم انصاف کا جب ہوگا نشاں
مانے جائیں گے اُنھی کے احساں

بے خبر کب کے پڑے سوتے تھے
اُن کی آواز سے ہم چونک اُٹھے

اُن کے طعنوں نے جگایا ہم کو
زہر نے اُن کے جِلایا ہم کو

یار و اغیار کے عیب اور ہنر
آشکارا ہوئے ایک اک ہم پر

حق کے جلوے نظر آئے ہر جا
اہلِ باطل میں بھی اک پائی ادا

نہ ملا راہ میں باطل کا سراغ
اہلِ حق کو بھی نہ پایا بے داغ

اہلِ تقویٰ کی ریائیں دیکھیں
اہلِ حکمت کی خطائیں دیکھیں

زشتیاں دیکھیں نکوکاروں میں
خوبیاں پائیں گنہگاروں میں
کلب کی پاک سرشتی دیکھی
پائے طاؤس کی زشتی دیکھی

عیب بھی دیکھے ہنر بھی دیکھے
خار بھی دیکھے ثمر بھی دیکھے
ہنر اغیار میں پائے اکثر
عیب اپنے نظر آئے اکثر

دفترِ علم کو ابتر پایا
علم کو جہل سے بدتر پایا
مجلسیں غیبت و بہتان سے پُر
صحبتیں جھوٹ کے طوفان سے پُر

منقطع بھائی کی بھائی سے آمید
اپنا بیگانہ، لہو سب کے سفید
پاک بندوں کی زباں پر دشنام
نہ ثقات اس سے بری اور نہ کرام

فقرا مکر و ریا کے پُتلے
اغنیا حرص و ہوا کے پُتلے
شیخ عیّار تو زاہد پُر فن
مولوی، عقل کے سارے دشمن

پیاز کی طرح نرے پوست ہی پوست
قوم کے دوست مگر ناداں دوست
حالت القصہ جو دیکھی اپنی
کوئی کل سیدھی نہ پائی اپنی

سارے آوے کو ٹٹولا جا کر
کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر
پایا اک دین کا محکم قانون
وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون

دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالتِ زار
جی بھر آیا، نہ رہا صبر و قرار
گو نہ تھا تلخ نوائی کا محل
آہیں دو چار گئیں دل سے نکل

تلخ گزرے جو کسی کو یہ صدا
حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا؟

★

۷ - کلمۃ الحق معروف بہ ''راست گوئی''
(۱۸۸۳ء)

اے راست گوئی! کیا قہر ہے تو
اے حق کی تلخی! کیا زہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی
حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی

ہے ناگواری پہچان تیری
''اَلحَقُّ مُرٌّ''[۱] ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے
چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے

رشتے ہزاروں تو نے تڑائے
باپوں سے بیٹے تو نے چھڑائے

---

۱ - سچ کڑوا ہوتا ہے -

سقراط کو زہر تو نے دلایا
شبیرؑ کو قتل تو نے کرایا

بے جرم مسموم تو نے کرائے
سولی پہ معصوم تو نے چڑھائے

رخنے عرب میں تو نے نکالے
بدر و احد میں رن تو نے ڈالے

موسیٰؑ کو مدین تو نے بھگایا
احمدؐ سے مکہ تو نے چھڑایا

تو نے صلے میں بخشے ہیں اکثر
سولی کے اورنگ، کانٹوں کے افسر

مظلوم کتنے تیرے سہارے
''ایلی''[1] ہی ''ایلی'' کہتے سدھارے

خوں‌خوار لشکر ہیں ساتھ تیرے
رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے

تیری جلو میں رسوائیاں ہیں
سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں

تدبیر ہے تو ناکامیوں کی
تقریب ہے تو بدنامیوں کی

تو آشتی کی رہتی ہے دشمن
تو مصلحت سے رکھتی ہے ان بن

قطع و برش ہے تاثیر تیری
رہتی ہے ننگی شمشیر تیری

ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر
دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر

---

۱ - ایلی : غالباً عبرانی لفظ ہے بمعنی اللہ - حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہوتے وقت خدا کو اسی نام سے پکارا تھا -

پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں
آتی ہے دنیا اک زلزلے میں

حق معبدوں میں ہوتا ہے داخل
ہوتے ہیں جھوٹے معبود باطل

اٹھتا ہے عملہ لات اور صفا کا
ہوتا ہے گھر پر قبضہ خدا کا

عبرانیوں کا اُڑتا ہے پرچم
صف قبطیوں کی ہوتی ہے برہم

ہوتے ہیں اغیار احمدؐ کے ساتھی
بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناتی

اے راست گوئی اے تیغِ براں
تیرا مخالف کیوں ہو نہ دوراں

سب وحشت آگیں مضموں ہیں تیرے
نت مصلحت پر شب خوں ہیں تیرے

گُن تیرے جن پر ظاہر ہوئے ہیں
وہ تیری دھن میں آخر ہوئے ہیں

اُمڈا جہاں سے سیلاب تیرا
پھر واں نہ کشتی ٹھہری نہ بیڑا

اٹھتی ہیں دل سے جب تیری موجیں
ہوتی ہیں نازل واں حق کی فوجیں

دیتی ہے ہمت ان کو سہارے
کرتی ہے اُمید پنہاں اشارے

عزم اُن کی مشکل کرتا ہے آساں
دل اُن سے لاکھوں کرتا ہے پیماں

چھا جائے ظلمت گو بحر و بر میں
ہے روز روشن اُن کی نظر میں
زور اُن پہ تیرے ہیں آشکارا
مٹھی میں اُن کی عالم ہے سارا
عظمت جہاں ہے تیری سمائی
پربت وہاں ہیں نظروں میں رائی
شاہوں سے گردن جھکتی نہیں واں
طوفاں سے[1] کشتی رکتی نہیں واں
اے راست گوئی تو ہے وہ افسوں
منکر بھی دل سے ہیں جس پہ مفتوں
تلخی میں تیری طُرفہ مزا ہے
ہر دل میں چبھتی تیری ادا ہے
تو نے جہاں دی آواز جا کر
لاکھوں اُٹھے سر تیری صدا پر
ہوتی ہے دھیمی پرواز تیری
بڑھتی ہے کم کم آواز تیری
پھر دوڑتی ہے یوں مرد و زن میں
جس طرح آتش لگتی ہے بن میں
بنتے ہیں دشمن انصار تیرے
ہوتے ہیں قیدی احرار تیرے
پطرس نے چھوڑے یار آشنا سب
یرون پہ دیکھی تیری ادا جب

۱۔ مثنویات کے دونوں نسخوں (صفحہ ۱۱۰ و ۱۴۹) اور مجموعۂ نظم حالی کے لاہور ایڈیشن (صفحہ ۶۹) میں یہ مصرع یوں درج ہے:

"طوفاں پہ کشتی رکتی نہیں یاں"

ڈالا عمرؓ پہ جب تو نے سایا
ارقمؓ[۱] کے گھر میں آ سر جھکایا

آہٹ سے تیری کرتے ہیں جو رم
ہیں گدگداتے دل اُن کے ہر دم

جوں جوں وہ زد سے کرتے ہیں دوری
ضرب اُن پہ تیری پڑتی ہے پوری

جاتا ہے آہو جب چوٹ کھا کر
گرتا ہے آخر کچھ دور جا کر

تجھ سے بھی جو ہیں وحشی بدکتے
پھر پھر کے تجھ کو جاتے ہیں تکتے

گو حق کی تلخی پائے ہوئے ہیں
پر چوٹ دل پر کھائے ہوئے ہیں

بھاگے ہیں کھا کر زخمِ نہاں وہ
جائیں گے بچ کر تجھ سے کہاں وہ

دل دوز ہیں سب تیری ادائیں
کڑوی ہیں تیری ساری دوائیں

زہرِ ہلاہل برسوں پئیں جب
بیمار تیرے پائیں شفا تب

دیتی ہے اول تو زخم کاری
مرہم کی آخر آتی ہے باری

کل ہے مسرت، ہے آج غم تُو
دیتی ہے امرت کہتی ہے سم تُو

ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت
تو جھوٹ پر واں کرتی ہے لعنت

---

۱ - ارقم: حضرت ابو عبداللہ بن عبد مناف، مشہور صحابی جن کا مکان (دار ارقم) ابتدا میں تبلیغ اسلام کا مرکز تھا۔

جس جا تعصب ہے عین ایماں
انصاف کا غل کرتی ہے تو واں

رسمِ سلف پر مرتے جہاں ہیں
رسموں پہ حملے تیرے وہاں ہیں

تقلید جس جا ہے طوقِ گردن
تقلیدیوں سے ہے تیری ان بن

کرتی ہے واں تو واعظ کو رسوا

ہے وحیِ مُنزّل قول اس کا جس جا

واں مفتیوں پر ہیں تیرے دھاوے
ہیں مثلِ قرآں جس جا فتاوے

پُجتی ہیں قبریں جب اولیا کی
تُو ہے دہائی دیتی خدا کی

جس ملک میں ہے تیری غلامی
ہوتی ہے تو واں بردوں کی حامی

غل بھیڑیوں کا پڑتا جہاں ہے
تو بکریوں کی واں پاسباں ہے

زہر اس عسل کو تو ہے بتاتی[1]
جس میں حلاوت ہے سب کو آتی

اس نیش میں تو کہتی شفا ہے
نیشِ اجل کا جس میں مزا ہے

ہندی میں تیری تازی کی بو ہے
مشرق میں کہتی مغرب کی تو ہے

جس سر زمیں میں پانی ہے عنقا
تو چھیڑتی ہے واں ذکرِ دریا

۱- مثنویات کے دونوں نسخوں میں "بتاتی" ہے- (صفحہ ۱۱۱ و ۱۵۱)

ہر سو جہاں ہے طغیان باراں
شور العطش کا کرتی ہے تو واں

سانپوں کا خطرہ پاتی جہاں ہے
اندھوں کے آگے کرتی فغاں ہے

طوفاں کی حالت پہلے سے پا کر
بیڑوں میں چرچا کرتی ہے جا کر

ڈاکے کی آمد ڈاکے سے پہلے
کہتی ہے جا کر تو کارواں سے

بلبل ہے گل پر جب چہچہاتی
اس دم خزاں سے تو ہے ڈراتی

پاتی ہے گھر میں جب کچھ دھواں تو
آگ آگ کا غل کرتی ہے واں تو

جب دیکھتی ہے قومیں بگڑتی
ہے آگ میں تو قوموں کی پڑتی

کرتی ہے ظاہر ان کی خطائیں
دیتی ہے ان کو پیچیدہ رائیں

گہ منعموں پر تو ہے برستی
گہ جھاڑتی ہے مفلس کی مستی

دیتی ہے طعنے بے غیرتوں کو
کرتی ہے رسوا بے عزتوں کو

للکارتی ہے تو کاہلوں کو
پھٹکارتی ہے تو جاہلوں کو

جھڑکی ہے تیری عادت میں داخل
ترشی ہے تیری طینت میں داخل

بگڑے ہیں تجھ سے دل بے نہایت
لاکھوں نے کی ہے تیری شکایت

یاں نام تیرا جس نے لیا ہے
عالم کو اپنا دشمن کیا ہے

احکام تیرے ٹلتے رہے ہیں
تیرے نوشتے جلتے[1] رہے ہیں

پہنچایا جس نے پیغام تیرا
جمہور میں وہ بدنام ٹھہرا

کتنوں نے مانا ساحر نبیؐ کو
کتنوں نے جانا کافر علیؓ کو

طوفاں اٹھائے اہل ہدیٰ پر
بہتان باندھے زین العباؓ پر

نعمانؒ کو دی بدعت سے نسبت
کی شافعیؒ پر برپا قیامت

مالکؒ پہ لائے آفت جفا جو
یاں[2] تک کہ آ کھڑا مُفصَّل سے بازو

کی ابن حنبلؒ کی یہ مدارا
چہرے پہ تھوکا، کوڑوں سے مارا

نکلے ائمہ اکثر وطن سے
خالی ہوا رے ابن حسنؓ سے

کتنوں کی باندھیں ذلت سے مشکیں
کتنوں کے رسی ڈالی گلے میں

---

۱ - ''چلتے رہے'' (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۱۱۲ - نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۵۱) -

۲ - ''یہاں'' (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۱۱۳ - نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۵۲) -

مُرتد بنایا اہلِ یقیں کو
ٹھہرایا زندیق اربابِ دیں کو

اے کلمۂ حق ! تیری بدولت
مردوں پہ گزری کیا کیا مصیبت
ٹھہرے جہاں میں بیگانے سب سے
تجھ پر ہوئے وہ دیوانے جب سے
دنیا نے اُن پر گو ظلم توڑا
دامن اُنھوں نے تیرا نہ چھوڑا
ہے تلخ و شیریں[1] ہر بات تیری
سننے میں کڑوی کہنے میں میٹھی
کانوں کو ہے تو گو ناگوارا
منہ سے نکلنا تیرا ہے پیارا
جو حرفِ حق سے بھاگے بگڑ کر
حق اُن کو لایا گردن پکڑ کر
حق کے سب آخر طالب ہوئے ہیں
نت حق کے دعوے غالب ہوئے ہیں
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اُجالا
حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

اے راست گوئی! اے ابر رحمت!
ہے اس چمن میں سب تیری برکت
گر تو نہ ہوتی یاں سایہ افگن
برباد ہوتا کب کا یہ گلشن

---

۱ - ''تلخ شیریں'' (مثنویات حالی ، نسخۂ شجاعت ، صفحہ ۱۱۳ - نسخۂ فاضل ، صفحہ ۱۵۲) -

عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے
آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے

باغ جہاں کو چھانٹا ہے تو نے
اکثر خزاں کو ڈانٹا ہے تو نے

تو بے کسوں کی یاور رہی ہے
تو گمرہوں کی رہبر رہی ہے

جن بستیوں میں تو چہچہائی
کھیتی انھی کی یاں[1] لہلہائی

بند اپنی جس جا تو نے زباں کی
نکبت نے منزل آ کر وہاں کی

رہبر نہ ہوتا گر نور تیرا
یوناں میں ہوتا ہر سو اندھیرا

گر مصر کی تو کھوتی نہ خامی
مصری نہ ہوتے عالم میں نامی

سریا میں حق کا جھنڈا نہ گڑتا
سایہ اگر واں[2] تیرا نہ پڑتا

جنبش نہ ہوتی گر تیرے لب کو
قبلہ نہ کرتے خاکِ عرب کو

ہوتے رہے ہیں سب ملک و ملت
سرسبز تجھ سے نوبت بہ نوبت

مشرق میں جب تھی تیری حکومت
چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت

جب دور تیرا مغرب میں آیا
مغرب کو تو نے مشرق بنایا

---

۱ - ''یہاں'' - (مثنویات، صفحہ ۱۱۳ و ۱۵۲) -
۲ - ''وہاں'' (ایضاً صفحہ ۱۱۳ و ۱۵۲) -

کھلتے رہے ہیں گل تیرے ہر سو
مہکی ہے اکثر یاں تیری خوشبو

گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے
پر تیری دارو صحت فزا ہے

ہر بول تیرا جوش غضب میں
ہے حق کی آواز راہ طلب میں

گو علم کی ہے تو زندگانی
پر جہل تیرا دشمن ہے جانی

جاہل ہمیشہ تجھ سے لڑے ہیں
ناداں ہزاروں تجھ سے اڑے ہیں

لاکھوں بلائیں آئی ہیں تجھ پر
اکثر گھٹائیں چھائی ہیں تجھ پر

ملکوں نے تجھ پر حملے کیے ہیں
قوموں نے تجھ سے بدلے لیے ہیں

———

اے کلمۂ حق ! اے سر یزداں
جس وقت ہو تو پردے سے عریاں

ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے
دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے

عالم ہو تیرا جب ناشناسا
حالی کو رکھیو اپنا شناسا

★

۸ - مناظرۂ واعظ و شاعر

(۱۸۸۳ع)

کل جو میں نے بستر راحت پہ جا کر دم لیا
دل کو اک وقفہ غمِ دنیا سے فرصت کا ملا

کی تصور نے وہیں اک بزمِ رنگیں آشکار
مجلسِ اربابِ معنی جس کو کہنا ہے بجا
گرم تھا واں ہر طرف ہنگامۂ بحث و نظر
سرخ رو گلگونۂ حجت سے تھا ہر مدّعا
شمعِ استدلال میں روشن تھا فانوسِ بیاں
چار سو ہنگامہ آرا تھی ''لم و لا''[1] کی صدا
تھے فراہم جس قدر اس بزم میں اہلِ کمال
تھا شرف کا اپنے اپنے فن کے سب کو ادّعا
مولوی کہتے تھے غیر از علمِ دیں سب ہیچ ہے
فلسفی کہتے تھے ہر فن کی ہے حکمت پر بنا
صوفیِ صافی ادھر کچھ کہہ رہا تھا زیرِ لب
واعظِ مُعجب اُدھر کچھ بک رہا تھا برملا
خودفروشی کا غرض تھا ہر طرف بازار گرم
ساز گوناگوں تھے لیکن ایک تھی سب کی صدا
شاعرِ مغرور بھی اک سمت خنداں زیرِ لب
سن رہا تھا لافِ اہلِ فضل اور خاموش تھا
جا کے پہنچا جب وہاں تک دورِ صہبائے سخن
دفعۃً مجلس سے اٹھا اور ہوا یوں خود ستا
دعوئ فضل و براعت اُس کو زیبا ہے یہاں
جو کوئی تلمیذِ رحماں[2] تم میں ہو میرے سوا
ہے تصرف میں ہمارے عرصۂ دشتِ خیال
کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا

۱ - لم اور لا دونوں حروفِ نفی ہیں ، مراد انکار و تردید ۔
۲ - الشعراء تلمیذالرحمان (شعرا خدا کے شاگرد ہیں یعنی شاعری کا ملکہ وہبی ہے ، کسبی نہیں) ۔ براعت : فضیلت ، کمالِ ہنر (نیز روشنی ، فصاحت) ۔

رہروی میں ہم کو چشم و گوش پر تکیہ نہیں
ہیں ہمارے بال و پر اندیشۂ فکرِ رسا
صاف ہوتا ہے بیاں اپنا خس و خاشاک سے
پاک ہو جیسے وساوس سے دلِ اہلِ صفا
اتفاقاً گر کسی کی مدح پر آ جائیں ہم
خاطرِ دشمن میں اس کا نقشِ الفت دیں بٹھا
خاک کو چرخِ بریں پر دیں اگر ترجیح ہم
ماند ہو ذرے کے آگے مہرِ تاباں کی ضیا
وصفِ خوباں ہم سے گر سن پائے سالک ایک بار
ہو نہ ہرگز پنجۂ عشقِ مجازی سے رہا
گر کریں ہم گل رخوں کی بے وفائی کا بیاں
ہو نہ بلبل پھر چمن میں روے گل پر مبتلا
کھینچ دیں گر خاطرِ مشتاق کی تصویرِ شوق
قیس کی کرنی پڑے لیلیٰ کو جا کر التجا
ہیں ہماری مدح کے پیر و جواں امیدوار
اور ہماری ہجو سے تھراتے ہیں شاہ و گدا
گرمیِ بزمِ حریفاں ہے ہماری ذات سے
بادۂ گلگوں کا ہے ہر بات میں اپنی مزا
فکر اپنی لغزشِ اہلِ نظر سے پاک ہے
ہم جہاں چلتے ہیں واں مسدود ہے راہِ خطا
کچھ نہیں اپنا ضرر گر ہو روایت میں خلل
جھوٹ سے ہوتی ہے یاں رونق عبارت کو سوا
دی نہیں گویا شریعت نے ہمیں تکلیف کچھ
جو نہیں جائز کسی کو ہے وہ سب ہم کو روا

خود ستائی جو کسی کو جز خدا پھبتی نہیں
آ کے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوش نما
فحش اور دشنام کو ملتا ہے یاں رنگ قبول
گالیاں دے دے کے ہم سنتے ہیں اکثر مرحبا

جب یہ بالا خوانیاں شاعر کی واعظ نے سنیں
مسکرایا اور یہ فرمایا کہ اے ہذیاں سرا!
شیوہ تیرا بوالفضولی اور یہ لاف و گزاف
پیشہ تیرا بادخوانی اور اتنا ادّعا
اُمتِ برحق کے عالم جو ہیں از روے خبر
وارثِ علمِ نبی قائم مقامِ انبیا
کیا ادب جاتا رہا اُن کا بھی تجھ کو اے سفیہ
بر سر مجلس ہے تو جو اس طرح بنکارتا
گو نہیں گنتی میں اہلِ علم کی یہ خاکسار
پر سنے جاتے نہیں یہ تیرے دعوے ناروا
ہر سخن کا اک جدا ہوتا ہے موقع اور محل
ہزل و سخریّت کجا، بزمِ خردمنداں کجا
علم اور حکمت کے ہوں جس بزم میں دفتر کھلے
کس نے دی ہے تجھ کو واں اس ہرزہ گوئی کی رضا
شعر مستحسن اگر ہوتا تو قرآں میں اسے
کیوں خلافِ شانِ ختم المرسلیں کہتا خدا[1]

---

۱ - قرآن میں اللہ تعالی اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں فرماتا ہے: "وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ (ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا اور یہ اس کی شان کے لائق بھی نہیں۔)

شان میں ''بالعلم یزری'' جس کی آیا ہے صریح
فخر ہے اس شعر پر تجھ کو یہ اے شرّالوریٰ
چاہیے انفاسِ اہل الذکر سے ہو مستفید
ہو نہ جس کو علم سنت اور کتاب اللہ کا
خود ہو تم بے علم اور صحبت سے اہلِ علم کی
بھاگتے ہو جیسے شیطاں ہے اذاں سے بھاگتا
ہے یہی باعث کہ بک اٹھتے ہو تم بے اختیار
جو تمھارے منہ میں آتا ہے سزا اور ناسزا
اس زبانِ یاوہ گو کو اپنی کیا سمجھا ہے تو
جرم گو چھوٹا ہے اس کا جرم ہے لیکن بڑا
بے حقیقت ہیں ترے سارے خیالات بلند
ہجو ہے تو بے اثر اور مدح ہے تو بے صفا
ہے جہاں خامے کو تیرے خدمتِ مشّاطگی
مورت اک پتھر کی ہے واں حورِ جنت سے سوا
بال سے باریک تر معشوق کی تیرے کمر
رات سے تاریک تر ہجرِ صنم میں دن ترا
شش جہت میں تو کرے برپا قیامت سات بار
یار سے اپنے اگر دم بھر کو ہو عاشق جدا
تیغ چوبیں کی ہو گر برّش بیاں کرنی تجھے
ہے تنزّل گر اسے ٹھہرائے تو تیغِ قضا
ہو جہاں لکھنی تجھے اسپِ گلی کی جست و خیز
اک ترارے میں اسے پہنچائے تو فوق السما

---

۱ - عربی مقولہ: ''الشعر یزری بالعلم'' (شاعری علم کو عیب دار بناتی ہے) - شرّالوریٰ: بدترین خلائق -

تو ہوا مدح و ثنا میں جس کی سرگرمِ غلو
اور اُلٹا خوبیوں پر اس کی پردہ پڑ گیا
پرلے درجے کا تنزل ہے اگر ٹھہرائے تو
جم کو اس کے در کا درباں اور بہمن کو گدا
بہمن و جمشید یاں بے چارے کس گنتی میں ہیں
تنگ ہیں ہاتھوں سے تیرے انبیا اور اولیا
لکھے تو اک گربۂ مسکیں کو سارا[1] منزلت
اور کہے اک لعبت سنگیں کو تو یوسف لقا
فی المثل گر ہو ترا ممدوح اک برگ گیاہ
اس میں ثابت کر کے چھوڑے تو صفاتِ کبریا
بادخوانوں سے سوا ہو تجھ کو فکر تہنیت
خواب میں سن پائے تو گر کوسِ[2] شادی کی صدا
ہند میں غل ڈال دے تو نالہ ہائے شوق سے
چین میں شہرہ ہو گر ایک شاہدِ نوخیز کا
شعر کو الہام سمجھے گر نصیبوں سے کبھی
کان میں پڑ جائے تیرے ایک جھوٹی واہ وا
مذہبِ شاعر میں جس کا دینِ باطل نام ہے
راستی اور صدق سے بڑھ کر نہیں کوئی خطا
سربسر اقوال تیرے کچھ ہیں اور افعال کچھ
ہے زبانِ گوہر افشاں پر 'نعم' اور دل میں 'لا'
شان میں آیا ہے جن کے قول ''مالا یفعلون''[3]
چشم بد دور آپ کے ہادی ہیں وہ اور مقتدا

۱۔ مراد حضرت سارا رضؓ (حضرت ابراہیم ؑ کی بیوی) جیسی تقدس مآب ۔
۲ ۔ '' گوش شادی'' مجموعۂ نظم حالی ، طبع لاہور (صفحہ ۷۷) ۔
۳ ۔ سورۂ الشعراء کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے : وانھم یقولون مالا یفعلون (اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ، خود اُس پر عمل نہیں کرتے) (القرآن - ۲۶ : ۲۲۶)

ایسے دروازے بہت کم پائیں گے آفاق میں
جن پہ صبح و شام تو نے دی نہ ہو جا کر صدا
ہے زبان و خامہ تیرے تابعِ فرمانِ حرص
کام تجھ کو کچھ نہیں جز مدح و قدحِ اغنیا
مدح میں حد سے زیادہ جن کی کرتا ہے غلو
گالیاں دیتا ہے تو اکثر انھی کو برملا
جیسے دروازوں سے پھرتے ہیں دعا دے کر فقیر
مدح تو بھی ختم کرتا ہے یونہی دے کر دعا
ہر دعا میں ہے مقدر شرطِ ''ان اعطیتنی''[۱]
صاف لعنت کا دعا میں تیری آتا ہے مزا
پردۂ عرضِ ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو
گر یہی ہے شاعری تو تجھ سے بہتر ہے گدا

زہر دل کا جب، کہ واعظ نے لیا سارا اگل
اور نہ کوئی تیر باقی اس کے ترکش میں رہا
سن کے شاعر نے کہا، بس اے خدنگ انداز بس
ہے زباں تیرے دہن میں یا سنانِ جاں گزا
چوٹ تھی تیری سخن پر ، جا پڑی اخلاق پر
تو نے چاکِ پیرہن کو تا جگر پہنچا دیا
خردہ گیری کے لیے حاضر ہے شاعر کا کلام
اس سے کیا مطلب کہ ہے وہ بندۂ حرص و ہوا
تو اگر معصوم ہے تو کچھ کہی جاتی نہیں
پھنس رہا ہے ورنہ اس پھندے میں ہر شاہ و گدا

---

۱ - اِنْ اَعْطَیْتَنِیْ : اگر تو نے مجھے عطا کیا ۔

کھیلتے پھرتے ہیں میدان جہاں میں سب شکار
آڑ میں ٹٹی کی ، لاکھوں اور ہزاروں برملا
حرص ہوتی جسم میں انسان کے گر جاے خون
شاعروں سے تیرے چہرے کی دمک ہوتی سوا
میں نے ان آنکھوں سے اے واعظ لباسِ وعظ میں
جو فروشی کرتے دیکھے ہیں بہت گندم نما
خبط ہے اک تم کو ، کہہ دوں گر برا مانو نہ تم
آپ ہو بیمار اور دیتے ہو اوروں کو دوا
آپ میں تسبیح و ذکر و طاعت و زہد و ورع
خوبیاں سب کچھ سہی پر دل کا مالک ہے خدا
میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
جو ہیں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے برا
بات حق ہو یا کہ باطل تیری مرضی کے خلاف
منہ سے نکلی اور تجھے تکفیر کا پہلو ملا
ترکِ اَولیٰ[۱] پر فضیحت جس قدر کرتا ہے تو
قتل انساں پر نہیں ملتی کہیں ایسی سزا
ہے فقط دوزخ تری سرکار میں جنت نہیں
چوک جس سے ہو گئی کچھ پھر نہیں تو بخشتا
عاصیوں کی مغفرت جن سے نکلتی ہے صریح
ایسی آیات اور حدیثوں سے ہے تو جی میں خفا
گر خدا بھی واعظو! ہوتا تمھی سا سخت گیر
اس چمن کو دیکھتا کوئی نہ پھر پھولا پھلا
گرم بازاری اسی میں اپنی بس سمجھے ہو تم
لوگ ہوں بدراہ اور ان کے بنو تم رہ نما

---

۱ - امر انسب (بہتر صورت) کو چھوڑ دینا ۔

چاہتے ہو تم یہاں کثرت معاصی کی یونہی
ہیں اطبا چاہتے جس طرح امراض اور وبا
آپ ان باتوں کو اک بہتان سمجھیں گے مگر
سوجھتی اکثر نہیں انسان کو اپنی خطا
جو کہوں میں اس کو باور کر نہیں اس میں خلاف
شاعروں کے کذب سے بدتر ہے واعظ کی ریا
یہ بھی کوئی جھوٹ ہے ہم جس کے خود ہیں معترف
جھوٹ وہ ہے جو ہو پردے میں تقدس کے چھپا
دعوتوں میں سچ بتا جس شوق سے جاتا ہے تو
ایک بھی کی ہے نماز اس شوق سے تو نے ادا
یاد ہے وہ تیرا کہنا دیکھ کر کھانے چُنے
دین قائم ہے ابھی یارو کرو شکر خدا
مدرسے کوشش سے تیری گو بنے ہیں شہر شہر
مسجدیں بھی تو نے بنوائی ہیں اکثر جا بجا
پر یہ حیرت ہے کہ ان کاموں میں جو لاگت لگی
اس سے دہ‌چند آپ کے دیوان خانے میں لگا
مجرموں کے جرم شاید ہوں نہ اتنے خوف ناک
نیکیاں تیری ہیں جیسی پُرخطر روزِ جزا
ہے یقیں اتنا ہی ہوگا اپنے دل میں تو حقیر
جس قدر مانا ہے زید و عمرو نے تجھ کو برا
کردیا رسوا تری تزویر نے تذکیر کو
ورنہ اک منصب تھا یہ شایانِ شانِ انبیا
لطف ہے تو دل ربا اور قہر ہے تو دل فریب
سحر ہے، افسوں ہے، جادو ہے، تری جو ہے ادا

گہ جہنم سے ڈرا کر چاہتا رشوت ہے تو
گاہ حوروں پر لبھا کر مانگتا ہے رونما

گونجتا منبر پہ ہے یوں بیٹھ کر گویا کہ آپ
آسماں سے لے کے اترے ہیں ابھی حکمِ خدا

ہاتھ میں تیرے ہے گویا نار و جنت کی کلید
جس نے پوجا تجھ کو وہ فردوس میں داخل ہوا

نیکیاں برباد ہیں ساری تری خدمت بغیر
فرقۂ ناجی ہے بس اک پوجنے والا ترا

اپنی اک امت الگ سب سے بنانے کے لیے
تفرقے ڈالے ہیں دینِ حق میں تو نے جا بہ جا

تیرے گھرے ہیں مسلمانوں میں جب تک ہے نزاع
اختلاف امت کا حق میں تیرے رحمت ہوگیا

جس طرح جھگڑوں کے خواہاں ہیں عدالت میں وکیل
مانگتا ہے تو یونہی باہم خصومت کی دعا

چاہتا ہے قوم میں جوتی سدا چلتی رہے
کشتیِ اسلام کا پھر کیوں نہ ہو تو ناخدا

شاعروں کو بس اسی منہ سے گدا کہتا ہے تو
اے اسیرِ دامِ نفس، اے بندۂ حرص و ہوا

کچھ گدا کہنے سے تیرے، ہم گدا ہوتے نہیں
ورنہ ہم بھی یوں تو کہہ اٹھتے ہیں بعضوں کو گدا

شاعری پر ہے بڑا یہ طعن حضرت کا کہ ہم
حد سے بڑھ جاتے ہیں جب کرتے ہیں مدحِ اغنیا

طعن کچھ بے جا نہیں، رکھتے ہیں پر اک عذر ہم
غور کرنا عذر پر ہے شیوۂ اہلِ صفا

سب پہ روشن ہے کہ ہم لوگوں کا اک پیشہ ہے مدح
جیسے تم لوگوں کا پیشہ ہے یہی مکر و ریا
اپنے اپنے کام اور پیشے میں ، ہم ہوں یا کہ تم
کرتے ہیں ، ہوتا ہے جو کچھ مصلحت کا مقتضا
وعظ میں دیتے ہو آخر داستاں کی چاٹ تم
راستی سے کام جب چلتا نہیں تسخیر کا
مدح میں ہم بھی یونہی کرتے ہیں رنگ آمیزیاں
جب تنِ ممدوح پر کھلتی نہیں سادی قبا
پھول پھل سے سرو کو بے بہرہ جب پاتے ہیں ہم
ایک طرہ اس میں آزادی کا دیتے ہیں لگا
سوسن و نسرین و گل میں جب وفا پاتے نہیں
وصفِ رنگ و بو سے ہم دیتے ہیں عیب اُن کا چھپا
پر ہم اس پردے میں خود اپنا دکھاتے ہیں کمال
ورنہ ایسی مدح ہے ممدوح کے حق میں ہجا
اس سے بڑھ کر ہجو ہو سکتی ہے کیا انسان کی
لکھیں اعملی کو بصیر و راہزن کو رہنما
عدل میں لکھتے ہیں ہم نوشیروانِ عہد انہیں
ایک منکوحہ کا حق ہوتا نہیں جن سے ادا
حاتمِ وقت ان کو ٹھہراتے ہیں جن کا بذل و جود
اس لیے ہے تا کہ حاصل حاکموں کی ہو رضا
زیرکی میں ان کو کہتے ہیں ارسطوے زماں
ہم نشیں احمق بناتے ہیں جنھیں صبح و مسا
کہتے ہیں کس شد و مد سے ہم انہیں بیدار مغز
جو نہیں واقف کہ آمد کیا ہے اور ہے خرچ کیا

جو غلامانہ خوشامد کرتے ہیں حکام کی
ان کی آزادی پہ ہم کہتے ہیں سو سو مرحبا
آن پہ ثابت کرتے ہیں ہمدردیِ نوع بشر
آپ کو گنتے ہیں جو نوعِ بشر سے ماوریٰ
حامیِ اسلام دیتے ہیں خطاب آن کو کہ جو
کرتے ہیں رسوا چلن سے اپنے نام اسلام کا
یاورِ خلق ان کو کہتے ہیں جنھیں اے واعظو!
تم کسی کے کام کا رکھتے نہیں اپنے سوا
مدح کی جاتی ہے یاں اکثر اسی انداز سے
شیخ ہو ممدوح یا واعظ، غنی ہو یا گدا
قطبِ دوراں آن ریاکاروں کو ٹھہراتے ہیں ہم
آپ کو بھی جو سکھائیں مدتوں مکر و دغا
ان فسوں سازوں کو ہم لکھتے ہیں ذوالنون[۱] زماں
بیٹھ کر منبر پہ جو آنکھوں کا کاجل لیں آڑا
آپ چھٹ اس کو کہے جو مدح وہ بے مغز ہے
نام اسی کا مدح ہے تو ہجو ہے پھر چیز کیا

چبھتی اور دکھتی سخن ور نے یہ کی تقریر جب
اور لگے سب مسکرانے دیکھ کر یہ ماجرا
دل میں واعظ نے پڑھی لاحول اور سمجھا کہ میں
چھیڑ کر اک بے ادب کو مفت میں رسوا ہوا
پر بہ ظاہر داغ یہ دامن سے دھونے کے لیے
ہنس کے اک سنجیدگی سے اور متانت سے کہا
ہو چکیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ اور ذکر
ہزل و استہزا زیادہ حد سے ہوتا ہے برا

۱- مراد حضرت ذوالنون مصریؒ (م - ۲۴۵ھ - ۸۵۹ع)-

کہیے فکرِ شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق

آپ نے دیوان مرتّب کیوں نہیں اب تک کیا

ہیں ہنسی کی اور باتیں کیجیے انصاف اگر

ہے غزل میں آپ کی دیوانِ حافظ کا مزا

عرض کی شاعر نے حضرت کا ہے یہ سب حسنِ ظن

ورنہ میں کیا اور مرا مجموعۂ اشعار کیا

قبلہ! اب وہ دن گئے جب[۱] شاعروں کی قدر تھی

شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا

شعر اگر کہیے تو روٹی جا کے کس گھر کھائیے

سیکڑوں پھرتے ہیں شاعر تنگ دست و بے نوا

اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر

وعظ میں شاگرد ہوجاؤں کسی اُستاد کا

اس گئے گزرے زمانے میں بھی یہ فنِ شریف

کیمیا ہے، کیمیا ہے، کیمیا ہے، کیمیا

آپ لوگوں کی تو اس میں ریس کرنی ہے محال

پر ہمیں بھی سیکھنے سے کچھ نہ کچھ آ جائے گا

روز اک سونے کی چڑیا گر نہ ہاتھ آئی، نہ آئے

ہم گنہ‌گاروں کا پیٹ ایسا نہیں ہے کچھ بڑا

کی سخن پرداز نے واعظ سے جب یہ گفتگو

قہقہوں سے چار سو مجلس میں اک غل پڑ گیا

خواب کا سا وہ سماں جاتا رہا سب یک بہ یک

اور دی پہلو سے دل نے کان میں میرے صدا

---

۱ - "جو" مجموعۂ نظم حالی، طبع لاہور (صفحہ ۸۱)۔

ہزل ہو یا جد نصیحت لیجیے ہر بات سے
کہہ گئے ہیں اہل دل "دع ما کدر خذ ما صفا"[1]

☆

۹ - پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ

(۱۸۸۷ع[2])

پھوٹ سے **ایکے** نے کی یہ گفتگو
میں ہوں جہاں کا چمن آرا کہ تو؟

میرا ہے یا تیرا مبارک قدم ؟
مجھ سے ہے یا تجھ سے بقائے اُمم ؟

اپنی ستائش نہیں زیبا، مگر
حق نہ جتاؤں تو ہے خوفِ ضرر

منزلِ ہستی کا ہوں میں رہنموں
کچھ نہ ہو اے **پھوٹ** اگر میں نہ ہوں

مجھ سے ہی اجسام کو ہے التیام
مجھ سے ہی اجرام میں ہے انتظام

میری بدولت ہے کھنچا اور تنا
جال یہ سب ثابت و سیّار کا

میرا اگر ہو نہ قدم درمیاں
زیر و زبر ہو ابھی نظمِ جہاں

---

۱ - جو کچھ کثیف و مکدر ہے اُسے چھوڑ دے، جو پاکیزہ ہے اُسے لے لے۔

۲ - مثنویات حالی کے دونوں نسخوں میں اس نظم کا سنہ تصنیف ۱۸۸۲ع درج ہے، لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا خیال ہے کہ غالباً یہ نظم ۱۸۸۷ع میں لکھی گئی - (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۱۰۷)۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے بھی اپنے تحقیقی مقالے "حالی بحیثیت شاعر" (صفحہ ۸۶) میں ۱۸۸۷ع درج کیا ہے۔ (مرتب)

دانوں کو دیتا ہوں میں خرمن بنا
قطروں سے دیتا ہوں میں دریا بہا

ڈھیلوں سے چنتا ہوں حصارِ حصیں
ریشوں کو کر دیتا ہوں حبل المتیں

میں ہوں اگر مورچوں کے درمیاں
ان کا سلیماں کو کروں میہماں

مجھ سے ہے ہر قوم اعانت طلب
کرتے ہیں طاقت مری تسلیم سب

قوموں کے اقبال کی میں ہوں دلیل
میں نہیں جس قوم میں وہ ہے ذلیل

مجھ سے گھرانوں کی ہے چھاتی پہاڑ
میں نہیں جس گھر میں وہ گھر ہے اجاڑ

ملک ہیں آباد میری ذات سے
یُمن ہے اک میری کرامات سے

میں نے ہے جس قوم کو بخشا وقار
قوم وہی قوم ہے، باقی کمہار

بخت عدو مال[1] ہے اس قوم کا
بندہ خود اقبال ہے اس قوم کا

نرغے میں گھر جائے گر اک ان کا فرد
لاکھ پہ بھاری ہے بہ وقت نبرد

ڈال نہیں سکتا کوئی اس پہ ہاتھ
سوجھتی ہے قوم تمام اس کے ساتھ

میرا ہے جس ملک میں جاری عمل
واں کبھی آنے نہیں پاتا خلل

---

۱ - ''مال'': مثنویات، صفحہ ۱۴۱ و ۱۷۶ -

میرے تصرف[1] میں ہے جو سرزمیں
واں کوئی بے کس کوئی تنہا نہیں

ایک ہے زخمی تو ہیں سب دل فگار
ایک ہے مظلوم تو حامی ہزار

ایک کو گر دیکھتے ہیں مضطرب
پیٹ کو پکڑے ہوئے پھرتے ہیں سب

آگ اگر گھر میں لگی ایک کے
قوم میں گھر گھر دھوئیں اٹھنے لگے

کُل کی مصیبت میں ہیں کُل مبتلا
ایک پر آتی نہیں کوئی بلا

ضعف دباتا نہیں ان کو کبھی
رکھتے ہیں کمزور بھی واں دل قوی

غم نہیں افلاس کا مفلس کو واں
ایک کا افلاس ہے سب پر گراں

ایک کی خواری سے ہیں نادم ہزار
ایک ہے رسوا تو ہیں سب شرمسار

ایک کی عزت ہو تو نازاں ہیں سب
ایک ہو گر شاہ تو سلطاں ہیں سب

سنتی ہے اے خانہ برانداز **پھوٹ**
سچ ہے یہ سب میرا بیاں یا کہ جھوٹ

مجھ میں نہیں عیب کچھ اس کے سوا
ساتھ مرے[2] تیرا ہے کھٹکا لگا

---

۱ - ''تصور'' : مثنویات ، صفحہ ۱۶۱ و ۱۷۶ -
۲ - ''ساتھ میرا'' : ایضاً -

ذات ہے میری مہِ کامل مگر
دیتی ہے گہنا مجھے تو آن کر

ہوتی اگر تیری نہ یاں ہست و بود
میرا مبارک تھا جہاں میں وجود

چشمۂ رحمت ہے جماعت ولے
کرتی ہے ُتو آ کے مکدّر اسے

چار جو مل بیٹھتے ہیں یاں کبھی
سب نظرِ بد سے ہیں لرزاں تری

صلح کا رہتی ہے ُبرا تکتی تو
دو کو بہم دیکھ نہیں سکتی تو

قطع و برش تیری جبلّی ہے خو
گوشت جدا کرتی ہے ناخن سے ُتو

بھائیوں کو کرتی ہے اغیار تو
یاروں کو کر دیتی ہے بے یار[1] تو

ڈالتی ہے ان میں نزاع و خلاف
دو کے نہیں چھوڑتی دل ان میں صاف

قوم میں جو دیکھیے چھوٹا بڑا
چنتا ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا

مضحکہ خود اپنا بناتے ہیں وہ
اپنے پہ عالم کو ہنساتے ہیں وہ

سوجھتی ملت کی نہیں کوئی بات
یہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات

رہتا ہے ایک ایک کے درپے نہاں
جس سے جسے دیکھیے ہے بدگماں

---

۱ - ''بے ریا'' نسخۂ شجاعت ، صفحہ ۱۴۲ -

زید کا ہے عمرو سے ظاہر ملاپ
دل میں بھرا دونوں کے لیکن ہے پاپ
ایک یہ کہتا ہے کہ میری چلے
دوسرا خواہاں کہ زک اس کو ملے
دیکھیے جس کو وہ ہے اس تاک میں
یاروں کے منصوبے ملیں خاک میں
قوم کی قوم آتی ہے بے کس نظر
جاتی ہیں جھاڑو کی سی سینکیں بکھر
عیب ہیں جو تجھ میں وہ مجھ میں نہیں
خوبیاں جو مجھ میں ہیں تجھ میں نہیں

پھوٹ نے **ایکے** سے سنا جب یہ لاف
بولی کہ تقصیر ہو میری معاف
نام ہے بدنام مقرّر مرا
ذکر بُرائی سے ہے گھر گھر مرا
پر کوئی انصاف سے دیکھے اگر
میں ہوں وہی جو کہ ہے تو سربسر
عیب ہیں کچھ مجھ میں تو تجھ میں بھی ہیں
خوبیاں تجھ میں بھی ہیں مجھ میں بھی ہیں
خلق کے ہم دونوں مددگار ہیں
دوست کا تو یار ہے، دشمن کی میں
اپنوں سے تو غیر کو کرتا ہے زیر
میں ہوں کہ دل غیروں کے رکھتی ہوں شیر
میں کروں تائید نہ تیری اگر
ہو کوئی خوبی نہ تری جلوہ گر

کام رہیں سارے ادھورے ترے
ہوں کبھی منصوبے نہ پورے ترے
میرے ہی بل چلتی ہے گاڑی تری
مجھ سے ہی سرسبز ہے باڑی تری
میں جو نہ ایراں کو دلاتی شکست
رومیوں کے حوصلے ہو جاتے پست
ڈالتی بغداد میں گر میں نہ جال
کرتی نہ عبّاسیوں کو پائمال
کام نہ آتا کوئی تیرا ہنر
فتح نہ پاتی کبھی فوجِ تتر
ہوتی بخارا میں نہ گر میں مخل
کرتی نہ ساسانیوں کو مضمحل
غزنوی اس طرح نہ پاتے فروغ
ٹھہرتے دعوے ترے سارے دروغ
ہند میں میں گل نہ کھلاتی اگر
رنگ نہ یاں اپنا جماتی اگر
غوریوں کو فتح دلاتا نہ تو
خلجیوں کے کام کچھ آتا نہ تو
لودیوں کے بڑھتے نہ آگے قدم
مغلوں کا یاں آ کے نہ گڑتا علم
ہند میں کرتی نہ اگر میں وطن
پھیلتے مغرب کے نہ یاں علم و فن

یہ تو لیا تو نے سن اے **اتفاق**
اب کہوں کچھ اور جو گزرے نہ شاق

تجھ سے سوا مجھ میں ہے سچ اس کو جان
جلوہ گر انصافِ الٰہی کی شان

تو جو کسی قوم کا بنتا ہے یار
چاہتا ہے بگڑے نہ وہ زینہار

اس کو نہ پیش آئے کبھی روزِ بد
بات رہے اس کی بنی تا ابد

حصے میں اُس کے رہے عزّ و شرف
رشک سے قومیں تکیں اس کی طرف

آئے نہ اقبال کو اس کے زوال
دوست رہیں شاد، عدو پائمال

تیرا تو یہ خاصّہ ٹھہرا مگر
عادتِ حق کی نہیں تجھ کو خبر

آج کسی کو جو چڑھاتا ہے وہ
دوسرے دن اس کو گراتا ہے وہ

جزر ہے دریا میں پس از مد ضرور
عزت و دولت کی ہے اک حد ضرور

ختم جب اقبال کا ہوتا ہے دور
سارے بگڑ جاتے ہیں قوموں کے طور

خصلتیں اُن کی نہیں رہتیں درست
فرض ادا کرنے میں رہتے ہیں سست

بھول کے بھی وہ نہیں لاتے بجا
بندوں کے حق اور حقوقِ خدا

ملتی ہے ہرچند کہ مہلت انہیں
پر کبھی ہوتی نہیں جرأت انہیں

جب نہیں غفلت کا اُترتا خمار
ہوش میں آتے نہیں وہ زینہار
کرتے سزا سے نہیں پھر درگزر
کارگزارانِ قضا و قدر

لیتے ہیں چھین اُن سے حکومت کبھی
کرتے ہیں سلب اُن کی لیاقت کبھی
علم کبھی دیتے ہیں ان کا مٹا
دیتے ہیں دولت کبھی ان کی لٹا!

اس پہ بھی ہوتے نہیں جب ہوشیار
بھیجتے ہیں قحط و وبا بار بار
کوڑے یہ کھا کھا کے گئے گر سنبھل
سر سے بلا قوم کے جاتی ہے ٹل

ورنہ مجھے کرتے ہیں مامور واں
تا کہ کروں قدرتِ باری عیاں
الحذر اس وقت سے اے **اتفاق**
آن کے جب کہتی ہوں میں الفراق

آ گئے اُس قوم کے بس دن برے
حق نے کیا جس پہ مسلط مجھے
کوہ کو کرتی ہوں پر کاہ میں
شیروں کو کر دیتی ہوں رُوباہ میں

قدر و بہا قوم کی لیتی ہوں چھین
کوڑی کے کر دیتی ہوں میں تین تین
کرتے نہیں غیر اُنھیں آ کے پست
پاتے ہیں وہ اپنے ہی ہاتھوں شکست

---

۱ - ''مٹا'' مثنویات، صفحہ ۱۴۴ و ۱۶۹ -

دیتے ہیں دھیان ان کا بد اندیش چھوڑ
آپ ہی مر جاتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ

آگ پہ گویا کہ ہوں بارود میں
قوموں کو کر دیتی ہوں نابود میں

ہو گیا جس ملک میں یاں[1] میرا راج
قحط و وبا کی نہیں واں احتیاج

قحط و وبا کرتے ہیں جانیں تلف
کھوتی ہوں میں قوم کا عزو شرف

دیتے ہیں وہ قوم کی گنتی گھٹا
کرتی ہوں میں قوم کو بالکل فنا

حکم یہی ہے مجھے اے **اتفاق**
ڈالتی ہوں اس لیے ان میں نفاق

ہے مری تحقیر خلافِ ادب
میں ہوں فرستادۂ درگاہِ رب

———

سلسلہ تقریر کا جب بڑھ گیا
پھوٹ کو یہ غیب سے آئی صدا

ڈال دیے تو نے دلوں میں شگاف
کب تلک اے **پھوٹ** یہ لاف و گزاف

حد سے سوا بڑھ گئی تو، شرم شرم!
جھوٹ میں اور اتنا غلو، شرم شرم!

چیز حقیقت میں کوئی تو نہیں
تجھ میں حقیقت کی کہیں بو نہیں

چیز وہی چیز حقیقت میں ہے
تعبیہ جو خلق کی فطرت میں ہے

---

۱ - ''یہاں'': مثنویات، صفحہ ۱۴۴ و ۱۷۹ -

فطرتِ انسان کے ہے جو کچھ خلاف
ہیچ ہے وہ اس میں نہیں اختلاف

طبعِ بشر میں ہے ودیعت وفاق
واں نہیں مطبوع بجز اتفاق

روم ہوں یا ترک ، عجم یا عرب
مہر و محبت پہ ہیں مجبول سب

ایک کو ہے ایک کی جانب جھکاؤ
ایک سے ہے ایک کے دل کو لگاؤ

ہوتی کچھ اے **پھوٹ** اگر تیری اصل
متحد انسان کی ہوتی نہ نسل

'تو وہ ہے سرچشمہ نہیں جس میں آب'[1]
تیری نمائش ہے برنگ سراب

ایسے بہت کرتی ہیں جلوے عیاں
آدمِ خاکی کی غلط فہمیاں

جیسے کہ بے اصل خبر گاہ گاہ
ملک کرا دیتی ہے دم میں تباہ

تجھ سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر بگاڑ
رائی کے ہو جاتے ہیں بن کر پہاڑ

ہے یہ نمائش تری اے خودنما
شعبدہ اک وہمِ غلط کار کا

سیکڑوں گھر جہل نے گھالے ہیں یاں
پردے بہت عقلوں پہ ڈالے ہیں یاں

---

۱ - ''تو وہ سر چشمہ نہیں جس میں ہو آب '' - (نسخہ شجاعت صفحہ ۱۴۵ و نسخہ فاضل صفحہ ۱۸۰)

جہل کا چھایا ہے اندھیرا جہاں
ملک کو ظلمت نے ہے گھیرا جہاں

ٹھیک نہیں سوجھتی واں کوئی چیز
نفع و ضرر میں نہیں ہوتی تمیز

قوم کی تعریف نہیں جانتے
اپنی حقیقت نہیں پہچانتے

کر نہیں سکتے وہ حقایق میں غور[1]
کہتے ہیں جڑ اور ہے ٹہنی ہے اور

جانتے دریا کو ہیں اک شے جدا
قطروں سے کہتے ہیں کہ وہ ہے جدا

پر یہ عزیزوں کو نہیں سوجھتا
ہے انھی قطروں سے وہ دریا بنا

بس یہی انساں کی غلط کاریاں
دیتی ہیں پہنچا اسے اکثر زیاں

ہوتا ہے بیٹھا ہؤا جس شاخ پر
تولنے لگتا ہے اسی پر تبر

چلنے کو جس راہ میں ہوتا ہے وہ
کانٹے اسی راہ میں بوتا ہے وہ

پینے کا جو اس کے ہے جاں بخش جام
زہر ملاتا ہے اسی میں وہ خام

حق کبھی ہونے نہیں دیتیں عیاں
جہل کی چھائی ہوئی تاریکیاں

ہوتی ہے پر ختم شبِ تار جب
پھیلتے ہیں علم کے انوار جب

---

۱ - "وہ حقایق وہ غور" مثنویات، صفحہ ۱۴۶ و ۱۸۰ -

شے نہیں رہتی کوئی پیش نظر
نورِ حقائق کے سوا جلوہ گر

سچ نظر آتا ہے سچ اور جھوٹ جھوٹ
تفرقہ رہتا ہے نہ رہتی ہے پھوٹ

وہمِ دوئی دل میں سماتا نہیں
اپنے سوا کچھ نظر آتا نہیں

بھائیوں پر پہلے کیے تھے جو وار
اپنا بدن پاتے ہیں اس سے فگار

ان پہ چلائے تھے جو تیر و سناں
اپنے بدن پر ہیں اب اُن کے نشاں

اُن کے سمجھ کر جو بگاڑے تھے کام
کام نکلتے ہیں وہ اپنے تمام

علم ہو جس قوم کا یاں راہبر
برکتیں اللہ کی اس قوم پر

جانتے ہیں وہ بُرکاتِ وفاق
اُن پہ ہیں روشن خطراتِ نفاق

فرق نہیں اُن کے زن و مرد میں
قوم کی طاقت ہے ہر اک فرد میں

رتبہ یہ ایکے نے ہے ان کو دیا
لاکھوں کروڑوں پہ ہیں فرماں روا

زور سے ہیں ان کے زبردست زیر
لومڑیاں سامنے اُن کے ہیں شیر

———

اے کہ تری ذات ہے عالم پناہ
اسود و احمر کا ہے تو بادشاہ

جوڑنا ٹوٹوں کا ترے ہات ہے
تیری صفت جامعِ اشتات ہے

منتجِ ادبار ہے جب تک نفاق
مثمرِ اقبال ہے جب تک وفاق

تلخ ہے جب تک ثمرِ اختلاف
ہے تر و تازہ شجرِ ایتلاف

بھیجیو نکبت نہ کسی قوم پر
رکھیو ہر اک[1] قوم کو شیر و شکر

ٹوٹے نہ آفاق میں سنگت کوئی
ہو نہ پراگندہ جماعت کوئی

بندے سے ہو بندہ نہ کوئی جدا
بکھرے نہ شیرازہ کسی قوم کا

پھوٹ کسی قوم میں پڑ جائے جب
ایک سے ایک اُن میں بچھڑ جائے تب

ورنہ اگر ہو نہ ملاپ اُن کو راس
اور نہ ہو سر جوڑنے کی اُن کے آس

وہ جیے تو کیا جیے بے آبرو
جلد اُٹھا لے اُنھیں دنیا سے تو

پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا
حق میں ہے اُس قوم کے بہتر فنا

★

---

۱ - "ایک" مثنویات، صفحہ ۱۴۷ و ۱۸۲ -

۱۰ - دولت اور وقت کا مناظرہ

(۱۸۸۷ع)

ایک دن **وقت** نے **دولت** سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا ؟

تو ہے سرمایۂ عزت ، یا میں ؟
تو ہے انسان کی دولت ، یا میں ؟

ہے زمانے میں بڑی بات تری
دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری

وقت سے ہنس کے یہ **دولت** نے کہا[1]
تجھ کو اے **وقت** نہیں عقل ذرا

ہے عجب جس کو خدائی مانے
اس کی تو خوبیوں میں شک جانے

سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے
لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے

نام اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے

مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما
علم بھی ایک طفیلی ہے مرا

لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال
لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر
میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر

۱- ''وقت نے ہنس کے یہ دولت سے کہا'' (مثنویات ، نسخۂ شجاعت صفحہ ۱۴۸ ، نسخۂ فاضل صفحہ ۱۸۳)

چند روز آ گئی میں جس کے کام
زندہ تا حشر رہا اُس کا نام

جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا
وہ سدا خوار و نگوں سار رہا

منہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں
اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

چاہتے ہیں مجھے سب خورد و کلاں
پھرتے ہیں دھن میں مری پیروجواں

گر نہ ہوں[1] میں تو کوئی کام نہ ہو
کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا
درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رُکھائی سے مری سب لرزاں
میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے وہ مری شان عظیم
کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا
جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

---

۱ - ''گر نہ لوں میں'' مثنویات ، صفحہ ۱۴۸ و ۱۸۳ -

وقت نے سن کے کہا اے **دولت**
شک نہیں اس میں ذرا اے **دولت**

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے ، مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجیے فرض تجھے گر چشمہ
تو ہوں اس چشمے کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں
پہلے دریا ہے کہ مچھلی ، ناداں

تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا گر عطر آگیں
میں ہوں اس عطر کی واللہ زمیں

ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن کے قبضے میں ہوں میں اے **دولت**
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت

لاکھ بار اُن سے اگر بھاگے تو
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُن کی مٹھی میں ہے تو اے **دولت**
طائرِ رشتہ بہ پا کی صورت

نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

ایک پل میری اگر دیجے گنوا
لیجے ہاتھ اس سے ہمیشہ کو اٹھا

تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
پل وہ ملتی نہیں پھر اے **دولت**

ہیں اسی واسطے جو اہل تمیز
میری ایک ایک پل اُن کو ہے عزیز[1]

میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
ہے مرا جاگتے سوتے انہیں پاس

جانتے ہیں حکما و عرفا
مجھ کو سرمایۂ دین و دنیا

دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں

نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام
نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام

نہ انہیں دین کی دولت ہاتھ آئے
اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیائے

نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلواۃ
نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکٰوۃ

نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے
نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے

---

۱ - مطابق دیوان حالی ، طبع اول (صفحہ ۲۱۷) - مثنویات (نسخۂ شجاعت ، صفحہ ۱۵۰ - نسخۂ فاضل ، صفحہ ۱۸۴) میں یہ مصرع یوں درج ہے :

"میری ایک ایک پل ہے اُن کو عزیز"

گن تو ہیں مجھ میں بہت اے **دولت**
ہے مگر تنگ مجالِ فرصت

بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو
بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اس میں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری اک اک آن

★

۱۱ - حقوق اولاد

(۱۸۸۸ع)

(لاڈلا بیٹا[۱])

لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا
جان ماں کی اور ایمان باپ کا

دیکھ اُسے ہوتے تھے دونوں باغ باغ
تھا وہی لے دے کے اُس گھر کا چراغ

بال بیکا اس کا ہوتا تھا اگر
دل کو رہ جاتے تھے دونوں تھام کر

ہر طرح اُس کی رضا مقصود تھی
جان تک اُس کے لیے موجود تھی

وقف تھی سب اُس پہ دولت اور مال
پر نہ تھا تعلیم کا اُس کی خیال

روک ٹوک اُس کی کسی نے کی نہ تھی
باپ نے جھڑکی تک اس کو دی نہ تھی

گھور سے واقف نہ تھا اُستاد کی
شکل دیکھی ہی نہ تھی جلاد کی

۱- اس مثنوی کی ذیلی سرخیاں مثنویات حالی (مرتبہ شجاعت علی) سے نقل کی گئی ہیں - (مرتب)

راہ سے مکتب کی کتراتا تھا وہ
نام سے پڑھنے کے گھبراتا تھا وہ

لکھنے پڑھنے کی نہ تھی ترغیب کچھ
گوشمالی تھی نہ تھی تادیب کچھ

تربیت کے بدلے لاڈ اور پیار تھا
لہو و بازی میں سدا سرشار تھا

کھیل میں کرتا تھا برباد آپ کو
اور کچھ پروا نہ تھی ماں باپ کو

جانتے تھے گھر میں ہے دولت بہت
لکھنے پڑھنے کی نہیں حاجت بہت

نوکری کرنی نہیں اس کو تلاش
ہے اسی کے واسطے ساری معاش

گو رہے بے علم اور نادان یہ
پر کسی صورت چڑھے پروان یہ

پیروی کی اک خیالِ خام کی
فکر دونوں نے نہ کی انجام کی

(اولاد کی باقاعدہ تربیت نہ کرنے کا انجام)

جب ہوا وہ ناز پروردہ جواں
رنگ لائیں اُن کی بے پروائیاں

آ پڑا اُس کا وہی آخر کو رنگ
لاڈلے بیٹوں کا جو ہوتا ہے ڈھنگ

سامنا ماں باپ کا کرنے لگا
ہم سری کا اُن کی دم بھرنے لگا

حق تو اُن کے اُس سے کیا ہوتے ادا
اور ناراض اُن کو وہ رکھنے لگا

تھیں ادائیں اس[1] کی اکثر ناپسند
کارگر اُس کو ملامت تھی نہ پند

جہل و نادانی کی تھیں طغیانیاں
رات دن کرتا تھا نافرمانیاں

اس کو صحبت تھی تو تھی اغیار سے
اُس کی ملت تھی تو تھی انفار سے

شہر میں آوارہ کہلاتا تھا وہ
چوک میں پاتا تھا جب پاتا تھا وہ[2]

پند سے ناصح کی نفرت تھی اُسے
سائے سے اچھوں کے وحشت تھی اُسے

گھر میں آ اک اک سے لڑ جاتا تھا وہ
باتوں باتوں میں بگڑ جاتا تھا وہ

نفس پر اپنے نہ کر سکتا تھا جبر
نام کو اس میں تحمل تھا نہ صبر

دل پہ قابو زینہار اس کو نہ تھا
اور زباں پر اختیار اس کو نہ تھا

---

۱ - ''اُن'' مثنویات حالی ، نسخہ فاضل صفحہ ۱۸۷ -

۲ - اس شعر کے بعد مثنویات کے نسخۂ فاضل (صفحہ ۱۸۷) میں مندرجہ ذیل شعر درج ہے جو نسخۂ شجاعت میں موجود نہیں بلکہ مثنویات کے لاہور ایڈیشن ، طبع سوم سے منقول ہے :

خوف ہوتا تھا نصیحت کا جہاں
رات دن کرتا تھا نا فرمانیاں

لیکن غالباً یہ شعر الحاقی ہے ، کیونکہ بے ربط ہونے کے علاوہ مصرع ثانی مکرر آ گیا ہے -

جو وہ کرتا تھا اُسے بھرتے تھے سب
اس سے چھوٹے اور بڑے ڈرتے تھے سب

اصل میں کچھ بد نہ تھی اس کی سرشت
کر دیے تھے جہل نے اطوار زشت

گو نہ مطلق آدمیت اس میں تھی
پر جھلکتی قابلیت اُس میں تھی

بد چلن تھا پر نہ تھی طینت بری
فطرت اچھی تھی ، مگر عادت بری

چڑھ رہا تھا اس پہ بد صحبت کا رنگ
لگ رہا تھا روشن آئینے کو زنگ

ذات میں اس کی شرارت تھی نہ شر
ہو گیا تھا بد ، بدوں میں بیٹھ کر

(باپ کی نصیحت)

جب گئی حالت بگڑ حد سے سوا
آ گیا دم ناک میں ماں باپ کا

باپ نے اک روز گھر میں بیٹھ کر
یوں کہاں بیٹے سے اے جانِ پدر!

یاد ہیں وہ دن بھی تم کو یا نہیں
جب کہ یہ رعنائیاں تم میں نہ تھیں

جب خبر اپنی نہ تھی کچھ آپ کو
جانتے تھے تم نہ ماں اور باپ کو

پاسباں تھے آپ کے ماں باپ جب
گوشت کا اک لوتھڑا تھے آپ جب

ہل نہ تم سکتے تھے بے امداد غیر
تھے نہ یہ اُڑنے کے پر ، چلنے کے پیر

ہاتھ اور بازو ، یہ سب بیکار تھے
سخت بے بس تھے اور تم لاچار تھے

آنکھ سے چیپڑ چھڑا سکتے نہ تھے
منہ سے مکھی تک اُڑا سکتے نہ تھے

آگ پانی میں نہ تھی تم کو تمیز
تھا تمھیں زہر اور امرت ایک چیز

رات دن یکساں سراسر تھا تمھیں
دھوپ اور سایہ برابر تھا تمھیں

بھوک میں بے چین ہوجاتے تھے، پر
اپنی بے چینی سے تھے تم بے خبر

پیاس لگتی تھی تو روتے تھے سدا
مانگنا پانی مگر آتا نہ تھا

کھا لیا جو کچھ دیا تم کو کھلا
پی لیا جو کچھ دیا تم کو پلا

تلخ و شیریں میں نہ تھا کچھ امتیاز
اس سے رغبت تھی نہ اُس سے احتراز

یہ زباں زوری کہیں اصلا نہ تھی
تھی زباں منہ میں مگر گویا نہ تھی

سب کو رو رو کر جگاتے تھے، مگر
اپنے رونے کی نہ تھی تم کو خبر

تھی نہ اپنے نفع و نقصاں کی سمجھ
درد کی سدھ تھی نہ درماں کی سمجھ

دیتے تھے بھر شفا دارو اگر
سر پہ رو رو تم اٹھا لیتے تھے گھر

گرمی اور سردی میں جب کپڑے تمھیں
ہم پنھاتے تھے تو کرتے تھے ضدیں

کیچڑ اور گارے سے نفرت کچھ نہ تھی
اور نجاست سے کراہت کچھ نہ تھی

واں اگر ہوتا نہ دم ماں باپ کا
کون رکھوالا تھا اس دم آپ کا

دل کا کہہ سکتے نہ تھے تم مدعا
بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا

بھوکے یا پیاسے اگر ہوتے تھے تم
کچھ نہ کہتے تھے مگر روتے تھے تم

ہم سمجھ لیتے تھے لیکن مدعا
بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا

پیاس میں مضطر جو پاتے تھے تمھیں
بن کہے پانی پلاتے تھے تمھیں

بھوک میں گر دیکھتے تھے بے قرار
دودھ تھے تم کو پلاتے بار بار

روپ تھے معلوم سارے آپ کے
سب سمجھتے تھے اشارے آپ کے

تم کو کچھ تکلیف ہوتی تھی اگر
خود بخود تھی دل کو ہو جاتی خبر

چین ہو جاتا تھا سارا برطرف
پھرتے تھے بیتاب دوڑے ہر طرف

حالتیں سب تھے تمھاری جانتے
آپ کے تیور تھے ہم پہچانتے

ہوتے تھے بیمار ، دور از حال ، جب
رات دن سہتی تھی ماں رنج و تعب

بارہا آنکھوں میں کٹ جاتی تھی رات
اک بلا آتی تھی جب آتی تھی رات

ڈرتے تھے تم غیر عورت سے سدا
ماں کی گودی سے نہ ہوتے تھے جدا

اوپری صورت سے تھے تم بھاگتے
دودھ ہرگز غیر کا پیتے نہ تھے

پر کبھی تم سے دریغ اس کو نہ تھی
گو تمھارے کام آتی جان بھی

آج بیماری سے فرصت تھی نہ کل
آج چیچک ، کل تھا پسلی کا خلل

کرتے تھے سیانوں کی جا جا منتیں
مانتے تھے نت ہزاروں منتیں

ناز اٹھاتے تھے طبیبوں کے سدا
ڈھونڈتے پھرتے تھے شربت اور دوا

عامل اور سیانوں نے جو مانگا دیا
منہ نہ پیسے کا کبھی ہم نے کیا

سخت بیماری کو جب پاتے تھے ہم
فکر کے مارے گھلے جاتے تھے ہم

رات اور دن ماں الگ تھی بےقرار
باپ پھرتا تھا الگ زار و نزار

اللہ آمیں کر کے ہم لیتے تھے نام
کرتے تھے دم تم پہ سورے صبح و شام

آنکھ پر آتا تھا گر میل آپ کے
دم پہ بن جاتی تھی ماں اور باپ کے

چاہتے تھے تم کو خوش آٹھوں پہر
تم بسورے اور بنی یاں جان پر

آپ کی خاطر اٹھائے دکھ پہ دکھ
دس برس تک ایک دن پایا نہ سکھ

ہم پہ گزریں کیسی کیسی سختیاں
گزریں دشمن پر نہ ایسی سختیاں

آئے گی خدمت ہماری یاد جب
ہوگے تم خود صاحبِ اولاد جب

کی چھٹی ہم نے تمھاری جس طرح
کی ہو شاید ہی کسی نے اس طرح

مونڈن اور ختنہ کیا کس دھوم سے
شہر کو کھانا دیا کس دھوم سے

ہوچکی جب رسم بسم اللہ کی
رائے تھی اس وقت ایک اک کی یہی

تم کو مکتب میں بٹھانا چاہیے
پڑھنے لکھنے پر لگانا چاہیے

پر نہ مانا دل نے اپنے زینہار
ڈالتے اس عمر میں تم پر یہ بار

ایک دو بار امتحاں کے طور پر
تم کو مکتب میں جو دیکھا بھیج کر

سارا دن بے کل تمہاری ماں رہی
اور پڑی تم میں ہماری جان رہی

پھر تمہارا ہم نے جب دیکھا یہ حال
تم کو ہے جانے سے مکتب کے ملال

جاتے ہو جب بے مزا ہوتے ہو تم
گھڑیوں ضد کرتے ہو اور روتے ہو تم

جلد مکتب سے اٹھا ہم نے لیا
آپ کے دل پر نہ میل آنے دیا

دل میں سمجھا ہو نہ جب بچے کو شوق
لطف آسے پڑھنے میں آئے اور نہ ذوق

بھیجنا مکتب میں ہے اس کو ستم
باز آئے ایسے پڑھوانے سے ہم

اپنی رُت پر آپ بڑھ چڑھ لوگے تم
وقت جب آئے گا خود پڑھ لوگے تم

دوستوں نے ہم کو سمجھایا بہت
اپنے بیگانوں نے پُھسلایا بہت

کھیل کی جب لگ گئی بچے کو چاٹ
ہو گیا جی پڑھنے لکھنے سے اچاٹ

کارگر ہو اس کو پند اور قید کیا
اس کے پڑھنے کی ہے پھر امید کیا

یوں سنورنے کا نہیں زنہار یہ
حق میں ہے زہر اس کے لاڈ اور پیار یہ

پیار سے سمجھے تو یوں سمجھاؤ تم
ورنہ اٹھتے بیٹھتے دھمکاؤ تم

وقت یہ اغماض کرنے کا نہیں
اب کا بگڑا پھر سنورنے کا نہیں

کہتے تھے اپنے پرائے سب یہی
آتی تھی آواز روز و شب یہی

تم کو لیکن ہم نے جھڑکی تک نہ دی
جبر کرنے کو کبھی چاہا نہ جی

سن تمھارا جب زیادہ کچھ ہوا
پھر پڑھانے کا ارادہ کچھ ہوا

اک معلم رکھا اور اک خوش نویس
یاد ہوگی تم کو ان دونوں کی فیس

ایک کو پانچ ایک کو ملتے تھے دس
یہ رہے نوکر برابر دو برس

اپنے اپنے فن میں تھے ہشیار یہ
پر رہے دونوں سدا بےکار یہ

گرچہ تھی تاکید دونوں کی شدید
پر نہ دی تم نے کبھی ان کو رسید

تم کو کب فرصت تھی کود اور پھاند سے
بھاگتے تھے تم نوشت اور خواند سے

مفت کی تنخواہ وہ پاتے رہے
نام کو ہر روز یاں آتے رہے

تم نے آخر جب نہ کچھ پڑھ کر دیا
دے کے کچھ، دونوں کو رخصت کردیا

ہم نے یہ سمجھا کہ کوشش ہے فضول
ساری تدبیریں ہیں اپنی بے اصول

لکھنا اور پڑھنا ہے سب تقدیر کا
تنگ ہے یاں[1] قافیہ تدبیر کا

جب ہوئے فضلِ الٰہی سے جواں
سر پہ شادی کا چڑھا بارِ گراں

منگنیاں ہوتی ہیں اکثر قوم میں
بیاہ ہوتے ہیں برابر قوم میں

کچھ بہت درکار زیور ہے نہ نقد
ہوتے اک شربت کے پیالے پر ہیں عقد

گر کفایت سوچتے کچھ خرچ میں
بیاہ دیتے بس یونہی ہم بھی تمھیں

اپنے دل میں پر یہی ہم نے کہا
ایک بیٹا اور وہ بھی لاڈلا

گو تمام املاک بک جائے مگر
خرچ کیجے بیاہ میں دل کھول کر

کی اگر یاں بھی کفایت پر نگاہ
اور ہم کو کون سے کرنے ہیں بیاہ

وقت یہ آتے نہیں پھر بار بار
کل خزاں ہے آج اگر یاں ہے بہار

ہے فراغت اور عسرت ساتھ ساتھ
کر لیں کچھ ہم بھی کہ اب چلتا ہے ہاتھ

ٹھان کر یہ جی میں دی شادی رچا
اپنے سے جو ہو سکا سب کچھ کیا

گر نہ یاد اپنا رہا تم کو بیاہ
شہر کے چھوٹے بڑے ہیں سب گواہ

---

۱ - "یہاں" (نسخۂ شجاعت، صفحہ ۱۵۶ - نسخۂ فاضل، صفحہ ۱۹۱) -

رات دن جلسہ تھا ناچ اور رنگ کا
غلغلہ تھا ڈھولک اور مردنگ کا

دیکھنے آتی تھی خلقت جھوم جھوم
دور تک اس بیاہ کی پہنچی تھی دھوم

دور سب کے دل سے رنج و غم رہا
بیس دن تک یاں یہی عالم رہا

جانتے ہیں قوم کے برنا و پیر
آج تک دیتے ہیں سب اس کی نظیر

کی نہ دینے میں کفایت پر نظر
جس کو دینا تھا دیا دل کھول کر

اگلی اور پچھلی، پرانی اور نئی
شہر کی املاک ساری بک گئی

قرضہ تھا نقدی کا باقی جس قدر
گو ہوئی اس سے سبکدوشی مگر

رہن تھے جو گاؤں شادی میں کیے
آج تک بے چین ہوں اُن کے لیے

ہے بہت اُن کے چھٹانے کا خیال
پر بظاہر اُن کا چھٹنا ہے محال

اب بہت نازک ہے حالت باپ کی
پہنچی یہ نوبت بدولت آپ کی

مال اور جاں سے زیادہ کوئی چیز
آدمی کو یاں نہیں ہوتی عزیز

جان سے بھی ہم رہے خدمت گزار
مال بھی ہم نے کیا تم پر نثار

تم نے جو چاہا کھلایا وہ تمھیں
تم نے جو مانگا پنہایا وہ تمھیں

گھوڑے چڑھنے کے لیے تم کو دے
رکھے خدمت گار خدمت کے لیے

شوق جو اچھا برا تم نے کیا
ہم نے بھی تائید کی اس کی سدا

خوب تم نے قدر کی ماں باپ کی
خوب خدمت کی ہماری داد دی

تھا نتیجہ جاں فشانی کا یہی ؟
تھا صلہ سوز نہانی کا یہی ؟

باپ کا تم کو ادب اصلا نہیں
ماں کی خدمت کی تمھیں پروا نہیں

گھر میں دو دو دن نہیں آتے ہو تم
آتے ہو اک اک سے لڑ جاتے ہو تم

لوگ شاکی ہیں تمھارے جا بجا
خود برا کہہ کہہ کے سنتے ہو برا

ہیں تمھارے سارے اوباشوں کے ڈھنگ
تم سے خوردوں اور بزرگوں کو ہے ننگ

ملنے والے ہیں تمھارے بادہ خوار
اور جواری ہیں تمھارے دوست دار

مرغ ہم نے بھی لڑائے ہیں بہت
اور کبوتر بھی اڑائے ہیں بہت

پر ہمارا حال تم جیسا نہ تھا
خبط تھا ہم کو بھی پر ایسا نہ تھا

اپنے سب کاموں کو جب بھگتا لیا
دو گھڑی اس میں بھی دل بہلا لیا

تم تو دنیا اور دیں سب چھوڑ کر
ہو انھی دھندوں میں غرق آٹھوں پہر

ہے غرض ایسی ہی جو ہے تم کو دھت
فکرِ دنیا ہے نہ فکر آخرت

ہم پہ سب ہنستے ہیں اشراف اور رذیل
کر دیا تم نے بھی ہم کو اب ذلیل

کر چکا تھا قرض پہلے ہی زبوں
اور تم نے کر دیا عزت کا خوں

منہ نہیں ہوتا کسی کے رو بہ رو
خاک میں تم نے ملا دی آبرو

بہتر اپنا یاں سے اٹھ جانا ہے اب
رہ گیا پھر کیا، گئی عزت ہی جب

باپ کا تم جانتے ہو اپنے حال
قرض میں جکڑا ہوا ہے بال بال

ہاتھ میں زر ہے نہ بازو میں ہے زور
مار کر فکروں نے کر ڈالا ہے بھور

کام کی باقی نہیں اپنے میں تاب
مدتوں سے دے چکی ہمت جواب

گور میں لٹکائے بیٹھے پاؤں ہیں
جا کے اب بن میں بساتے گاؤں ہیں

آپ میں ہوتا اگر کچھ حوصلا
آدمیت کا تھا اب یہ مقتضا

سر پہ لیتے اپنے گھر کا بوجھ ٹک
باپ کو فکروں سے کر دیتے سبک

ہم رہے جیسے فدا تم پر مدام
تم بڑھاپے میں ہمارے آتے کام

ہم رہے اب تک تمھارے سربراہ
اب ہمارے بنتے تم پشت و پناہ

ہم بھی یاں سکھ پاتے کچھ اولاد کا
نام چلتا دیکھتے اجداد کا

پر خدا کو تھا یہی منظور آہ
ہوتے وارث کے ہو گھر اپنا تباہ

جب کریں دنیا سے آہنگِ سفر
ہم بھرا گھر جائیں ویراں چھوڑ کر

خیر اب ہم کو تو یاں رہنا ہے کم
کوئی دن کے اور ہیں مہماں ہم

پر تمھیں ہے کاٹنی اک عمر یاں
ہو ابھی فضلِ الٰہی سے جواں

اب بھی اپنی حرکتوں سے باز آؤ
ڈھیل پر بازیِ دوراں کی نہ جاؤ

بس گئیں حد سے گزر رسوائیاں
کب تلک آخر یہ بے پروائیاں

ناز و نعمت کا زمانہ ہو چکا
خوابِ غفلت کا زمانہ ہو چکا

گردشِ گردوں ہے ہردم گھات میں
شاطرِ دوراں ہے فکرِ مات میں

ہاتھ سے جا کر نہیں آتا ہے وقت
دیکھو بھائی ہاتھ سے جاتا ہے وقت

گر رہے اب بھی یوں ہی تم نادرست
خود زمانہ تم کو کر دے گا درست

گردشیں دیں گی نکال ایک ایک بل
ٹھوکریں کھا کھا کے جاؤ گے سنبھل

پھر سنبھلنا واں یہ کس کام آئے گا
جب سنبھلنے سے نہ سنبھلا جائے گا

ہو گی اڑنے کی ہوس تم کو مگر
ہوں گے اڑنے کے نہ اس دم بال و پر

عقل ہو گی پر نہ ہو گا اقتدار
عزم ہو گا پر نہ ہو گا اختیار

جب کہ گیتی رنگ یہ دکھلائے گی
تب ملامت باپ کی یاد آئے گی

(بیٹے کا جواب)

باپ یہ سب کر چکا تقریر جب
سر جھکا کر از رہِ شرم و ادب

عرض کی بیٹے نے ارشاد آپ کا
قبلۂ عالم ! سراسر ہے بجا

باپ کی اور والدہ کی شفقتیں
آخری دم تک نہ بھولیں گی ہمیں

حق ہیں سب سینے میں مضمر آپ کے
نقش ہیں احسان دل پر آپ کے

میری جو دل‌جوئیاں کیں آپ نے
وہ نہ کی ہوں گی کسی ماں باپ نے

اچھے سے اچھا کھلایا آپ نے
اچھے سے اچھا پنہایا آپ نے

جان و دل ہم پر فدا کرتے رہے
ناز برداری سدا کرتے رہے

ہے بڑے افسوس کا لیکن مقام
شفقتیں کچھ آپ کی آئیں نہ کام

وہ محبت اور نوازش آپ کی
حق میں اپنے زہرِ قاتل ہو گئی

خدمتِ عالی میں، گستاخی معاف
عرض کر سکتا نہیں میں صاف صاف

پر جہاں ہو بات کہنے کا محل
واں نہیں خاموش رہنے کا محل

گو کہ ہوں میں سربسر تقصیروار
مجھ سے ہے نوعِ بشر کو ننگ و عار

دھوم ہے میری بدی کی جابجا
عیب ہے مجھ سے بزرگوں کو لگا

کو بکو آوارہ صبح و شام ہوں
شہر میں رسوا ہوں اور بدنام ہوں

بے ہنر مجھ سے نہیں ہوتے کہیں
پر مری تقصیر کچھ اس میں نہیں

اٹھے ہم جیسے اٹھایا آپ نے
بن گئے جیسے بنایا آپ نے

کہتے ہیں 'اخبار' میں آیا ہے یہ
مخبرِ صادقؐ نے فرمایا ہے یہ

اصل فطرت میں ہیں سب بچے رشید
غیب سے آتے ہیں سب بن کر سعید

پھر اسی رستے پہ پڑ جاتے ہیں وہ
رخ جدھر ماں باپ کا پاتے ہیں وہ

آئے تھے ہم جستجو میں راہ کی
تھی فقط درکار ہم کو رہبری

آپ نے جو راہ دی ہم کو بتا
ہم نے لی وہ راہ بے چون و چرا

آپ کے انعام اور احسان سب
یوں اگر کہیے تو لوں میں مان سب

پر اگر انصاف کچھ فرمائیں آپ
اس طرح مجھ کو نہ پھر شرمائیں آپ

ذکر بچپن کا جو فرماتے ہیں آپ
اپنے احسانوں سے شرماتے ہیں آپ

ہاں مقرر مامتا ماں باپ کی
حق میں بچوں کے ہے اک نعمت بڑی

گر نہ ہو ماں باپ کو آن کا خیال
پرورش پانا ہو بچوں کا محال

پر نہیں دخل اس میں کچھ انسان کا
اس میں ہے ماں باپ کا احسان کیا

جان دے پانی اگر کھیتی میں ڈال
یا وہ کر دے خشک پودوں کو نہال

اس میں پانی کا نہیں کچھ اختیار
ہے یہ خاصیت عطاے کردگار

کچھ نہیں تخصیص یاں انسان کی
ہے یہی خصلت ہر اک حیوان کی

جانور بھی جو نہیں رکھتے تمیز
سب کو بچے اپنے ہوتے ہیں عزیز

بھوک میں لیتے ہیں سب اُن کی خبر
پیاس میں کرتے ہیں سب حلق ان کا تر

زد میں جب دشمن کی پاتے ہیں انھیں
زد سے دشمن کی بچاتے ہیں انھیں

آنکھ سے اوجھل وہ ہو جاتے ہیں جب
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہر سو مضطرب

ہے غرض اُلفت وہی حیوان کو
لاگ جو بچوں سے ہے انسان کو

دی ہے آگ اک دل میں قدرت نے لگا
جس سے دل بس میں نہیں ماں باپ کا

جب کہ قابو میں نہیں رہتا ہے دل
مانتے ہیں دل کی جو کہتا ہے دل

فکر میں گھُٹنا سدا اولاد کے
جھیلنے دکھ برملا اولاد کے

کچھ خوشی ماں باپ کے دل کی نہیں
پر کریں کیا، مانتا دل ہی نہیں

وہ تو کرتے لاکھ بار اُن سے گریز
کیا کریں، ہے آتما کی آنچ تیز

اُس خدا نے، ذات ہے جس کی حکیم
جس کی حکمت اور حکومت ہے قدیم

ہوش خوردوں کو نہیں جب تک دیا
ان کا ضامن ہے بزرگوں کو کیا

تا کہ بے ہوشی میں لیں اُن کی خبر
چوکسی اُن کی کریں آٹھوں پہر

ہوں اگر بھوکے تو کچھ اُن کو کھلائیں
ہوں اگر پیاسے تو کچھ اُن کو پلائیں

جاگتے سوتے ہوں اُن کے پاسباں
بیٹھتے اُٹھتے ہوں اُن پر جاں فشاں

ان کو بے کل دیکھ کر ہوں بے قرار
اُن کی بیماری میں ہوں تیماردار

بے بسی کے دن نکلواتا ہے یوں
اپنے مدہوشوں کو پلواتا ہے یوں

ہر بشر کو دی ہے مہر اولاد کی
اس طرح دنیا ہے یہ آباد کی

گر نہ ہو یہ مامتا انسان میں
خانماں ویراں ہو سب اک آن میں

اس سے بچ سکتا کوئی انساں نہیں
اس میں کچھ اولاد پر احساں نہیں

جب کہ دُکھتا ہے کوئی عضوِ بدن
سارے ہو جاتے ہیں بے کل مرد و زن

کرتے ہیں تدبیر، ہو سکتی ہے جو
درد کی تکلیف کھو سکتی ہے جو

درد کی جب تک کسک جاتی نہیں
کچھ کیے بن اِن کو بن آتی نہیں

ہے یہی بالکل مثال اولاد کی
کیوں کہ ہے جزوِ بدن اولاد بھی

کل سے ان کی کل سدا پاتے ہیں دل
دکھ سے اُن کے سب کے دکھ جاتے ہیں دل

پیاس میں بچوں کو روتا دیکھ کر
کیا کریں پانی نہ دیں ان کو اگر

بھوک میں جب روئیں بچے زار زار
چھوڑ دیں کس طرح ان کو بے قرار

ان پہ گر سختی گزرتی ہے ذرا
ان سے یاں دوچند ہوتی ہے سوا

ان کا خوش جس بات سے ہوتا ہے جی
حصر ہے اس بات پر اُن کی خوشی

اُن کی کلفت ہے بلا ان کے لیے
اُن کی فرحت[1] ہے غذا ان کے لیے

طبع انساں کا ہے یہ جب اقتضا
کیا کرے گر ہو نہ بچوں پر فدا

اپنی راحت خوش نہیں آتی کسے
اپنی آسائش نہیں بھاتی کسے

---

۱ - ''اُن کی فرصت'' (نسخۂ شجاعت صفحہ ۱۶۳، نسخۂ فاضل صفحہ ۱۹۷) تصحیح قیاسی ہے -

جب کہ مصرف دودھ کا کوئی نہ پائیں
کیوں نہ مائیں اپنے بچوں کو پلائیں

ان کو بن بچوں کے نیند آئے نہ جب
کیوں نہ چھاتی سے لگا کر سوئیں سب

کس طرح غافل ہوں پھر اولاد سے
جب نہ بن دیکھے ہو چین اولاد کے

کہتے ہیں بچوں کو ہم کرتے ہیں پیار
اور دل کو اپنے دیتے ہیں قرار

ظاہرا اُن کی خوشی کرتے ہیں یہ
اور ٹھنڈا اپنا جی کرتے ہیں یہ

مار پر ہاتھ اُن کی اُٹھتا ہے اگر
دل کو رہتا ہے قلق دو دو پہر

اس لیے رکھتے ہیں اُن کو پیار سے
کیوں کہ دل دکھتا ہے اُن کی مار سے

پیار انھیں کرتے ہیں سب اپنے لیے
اُن کا دم بھرتے ہیں سب اپنے لیے

ایک شفقت میں ہے دُہری منفعت
پرورش اُن کی اور اپنی مصلحت

چین پر اُن کے بھی ہو شاید نظر
ان سے چین اپنا مقدم ہے مگر

بھول کر بھی نام وہ ان کا نہ لے[1]
پر طبیعت چین یاں لینے بھی دے

شفقتیں ایسی ہی سمجھیں آپ سب
کرتے ہیں بچوں پہ جو ماں باپ سب

---

۱ - ''بھول کر بھی نام اُن کا نہ لے'' (مثنویات صفحہ ۱۶۳ و ۱۹۸) تصحیح قیاسی ہے۔

اب رہی شادی ، چھٹی اور بیاہ کی
رسم مونڈن اور بسم‌اللہ کی
گو ہے یاں دم مارنا بے غیرتی
نا سپاسی اور کافر نعمتی
بات لیکن بے کہے بنتی نہیں
خواہ نفریں کیجیے خواہ آفریں
شادیوں میں آپ نے جو کچھ کیا
میری تقریبوں میں جو جو کچھ دیا
تھا وہ سب کچھ اپنی عزت کے لیے
نیک نامی اور شہرت کے لیے

تھا بہانا یہ کہ ہے عقدِ پسر
تھی مگر اپنی نمائش پر نظر

ہر طرف مدح و ثنا تھی آپ کی
ہر زباں پر واہ وا تھی آپ کی

چپ تھے سارے خردہ‌گیر اور نکتہ‌چیں
سب یہ کہتے تھے کہ حضرت آفریں!

دوست ہی کرتے نہ تھے بس واہ وا
دشمنوں نے بھی لیے تھے سر جھکا

معترف بیگانے اور اپنے تھے سب
تھا جہاں چرچا یہی تھا روز و شب

تھا ہمارا کام ، اور نام آپ کا
بلکہ تھا سب نام اور کام آپ کا

یاں نہ ہم کو دھیان تک شادی کا تھا
اور نہ ارماں گھر کی آبادی کا تھا

بیاہ یا شادی کا جب سنتے تھے نام
تھا ہمیں ایک اک کا منہ تکنے سے کام

ہم کو تھا شادی سے ایسا ہی لگاؤ
بیاہ کا ہو جیسے اک گڈے کو چاؤ

آپ کے دل میں تھے کچھ ارماں بھرے
بیاہ اٹھا کر وہ ہمارے سر دھرے

مفت ہم شرمندۂ احساں ہوئے
اور پورے آپ کے ارماں ہوئے

گھر میں جو نقدی تھی یا اسباب تھا
یا سہارا تھا کچھ اک جاداد کا

کی نہ حضرت نے نظر انجام پر
کردیا قربان سب اک نام پر

آپ کی تو نبھ گئی عزت کے ساتھ
سو سے بہتر عیش اور عشرت کے ساتھ

پر ہماری کس طرح ہو گی بسر
گھر میں دولت ہے نہ ہاتھوں میں ہنر

ہے ہمیں اب آفتوں کا سامنا
ہو گیا عزت کا مشکل تھامنا

کردیا خوں زور و زر کا آپ نے
گھاٹ کا رکھا نہ گھر کا آپ نے

آپ کو ہوتا اگر منظور یہ
کاہشیں ہم سے رہیں سب دور یہ

جورِ گردوں سے نہ ہوں پامال ہم
بعد حضرت کے رہیں خوش حال ہم

شادیوں میں رائگاں کھوتے نہ مال
اپنی شہرت کا نہ کرتے کچھ خیال
کھولتے ہم پر نہ در افلاس کے
چھوڑ جاتے کچھ ہمارے واسطے

ہم پہ احساں آپ یاں کرتے اگر
علم کی دولت سے کرتے بہرہ ور
کھول کر تعلیم میں دل کرتے خرچ
ہوتا کچھ ہوتا اگر کاموں میں حرج

علم کا تھا ہم کو بے شک شوق کم
کانپتے تھے نام سے پڑھنے کے ہم
بے خبر تقدیر کی گھاتوں سے تھے
بھاگتے ہم کام کی باتوں سے تھے

تھے نصیحت سے بزرگوں کی نفور
رہتے تھے سائے سے ان کے دور دور
پاس عزت کا نہ ڈر ذلت کا تھا
پردہ آنکھوں پر پڑا غفلت کا تھا

تھے مگر ہر طرح بس میں آپ کے
حکم سے باہر نہ تھے ماں باپ کے
ہم سے سرزد جب خطا ہوتی کوئی
یا کہ حرکت ناسزا ہوتی کوئی

گو کہ دل کڑھتا سزا سے آپ کا
دل پہ کرتے جبر، پر دیتے سزا
آپ کی خفگی کا ڈر ہوتا اگر
تربیت کا کچھ نہ کچھ ہوتا اثر

گر وطن میں تربیت آساں نہ تھی
کچھ جدائی خارج از امکاں نہ تھی

سوچتے انجام کی بدبختیاں
کرتے فرقت کی گوارا سختیاں

بھیج دیتے گھر سے باہر چند روز
لیتے دھر چھاتی پہ پتھر چند روز

مصلحت پر کرتے الفت کو فدا
کچھ دنوں اپنے سے کر دیتے جدا

یاد سے اپنی بھلا دیتے ہمیں
پر کسی قابل بنا دیتے ہمیں

گر جدائی آپ کو آتی نہ راس
دل ہماری یاد میں رہتا اداس

دردِ فرقت سے نہ کچھ گھبراتے آپ
دل بہلتا جس طرح بہلاتے آپ

شادیوں میں خرچ جو اٹھا فضول
ہم کو آخر کیا ہوا اس سے حصول

تربیت میں اپنی وہ اٹھتا اگر
ہم نہ ہوتے خوار شاید اس قدر

گھر میں کچھ باقی نہ رہتا اپنے جب
چار سُو پاتے کھلی راہِ طلب

ہاتھ میں ہوتا اگر کچھ بھی ہنر
رہتے عزت سے نکل جاتے جدھر

اپنے حق جتنے بتائے آپ نے
ہم پہ جو احساں جتائے آپ نے

یوں تو ہیں وہ قابلِ تسلیم سب
کیوں کہ ہے ہم کو یہی حکمِ ادب

کرتے ہیں جب دل میں لیکن غور ہم
اپنا حصہ ان میں کچھ پاتے ہیں کم

یاد ہیں سب ہم کو احساں آپ کے
کچھ امیدیں تھیں، کچھ ارماں آپ کے

اپنی خوشیاں کرتے تھے پوری مگر
تھی مصالح پر ہماری، کم نظر

ایسے احسانوں سے ہو دل شاد کیا
ہم بزرگوں کو کریں گے یاد کیا

(بیٹے کی ندامت)

باپ سے جوشِ جوانی میں پسر
باتیں یہ کہتے تو کہہ گزرا مگر

کہہ کے جی میں اپنے شرمایا بہت
جرأتِ بے جا سے پچھتایا بہت

گو دیے الزام سب اپنے مٹا
پر نہ مٹ سکتا تھا حق ماں باپ کا

دے رہا تھا باپ کو زک صاف صاف
کہہ رہا تھا دل مگر اس کے خلاف

دعوے احساں سے سبکدوشی کے تھے
پر دبی جاتی تھی گردن بوجھ سے

گو زباں بس میں نہ تھی نادان کی
پر گلے میں تھی کمند احسان کی

کر کے عذرِ شوخ چشمی باپ سے
گر پڑا قدموں پہ آ کر باپ کے
دل جو اُمڈا دیر تک روتا رہا
متصل اشکوں سے منہ دھوتا رہا

(باپ کی دوبارہ نصیحت)

گو ہوئی تھی باپ کو خفت کمال
پر یہ دیکھا اُس نے جب بیٹے کا حال
جلد قدموں پر سے سر اس کا اٹھا
اپنی چھاتی سے لیا اُس کو لگا
پھر کہا بیٹے سے اے لختِ جگر !
کیوں ہوئی تم کو ندامت اس قدر
تم نے جو الزام ہیں مجھ کو دیے
اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوگی مجھے
شکر ہے اتنی تو ہے تم کو خبر
باپ نے رکھا ہے تم کو بے ہنر
سب برے تم سے سلوک اس نے کیے
جو بھلائی کی ، وہ کی اپنے لیے
باپ تو کہتا ہی تھا تم کو برا
تم نے کر دی باپ کی ثابت خطا
چاہیے اس کے سوا کیا باپ کو
باپ کے تم رہنما پیری میں ہو
پر مری جاں ہم تو ہیں پا در رکاب
آنے والی ہے اجل سر پر شتاب
فی الحقیقت گر ہوئی ہم سے خطا
حاصل اب اس کے جتانے سے ہے کیا

عمر رفتہ پھر ملے جب باپ کو
اس نصیحت پر عمل تب ہو تو ہو

جب کہیں بیٹا ہو پیدا دوسرا
عمر بھی خالق کرے اس کو عطا

اور رہے سر پر سلامت باپ بھی
بات بھی بگڑی نہ ہو پھر باپ کی

تب نصیحت ہو تمھاری سودمند
ہوسکے تب باپ اس پر کاربند

جب کہ یہ ممکن نہیں اے جانِ جاں
ہے ہمیں الزام دینا رائگاں

سرزنش کا وقت ہی جب ہو چکا
سرزنش اب تم نے کی ہم کو تو کیا

رُت بہاری تو گئی ساری گزر
ہو ابھی تم جوہرِ قابل مگر

غلطیاں سب باپ کی ہو جانتے
اپنے نیک و بد کو ہو پہچانتے

راہ پر چاہو تو آسکتے ہو تم
ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم

ہوگئی پا لغز جو کچھ باپ سے
ہے تلافی اس کی ممکن آپ سے

تربیت بے جا کریں ہم، یا بجا
تربیت ماں باپ کی ہے چیز کیا

نوجوانی کا نشہ چڑھتا ہے جب
سب دھری رہتی ہے تعلیم اور ادب

ہاں مگر جو عقل خود رکھتے ہیں یاں
ٹھیک رہتے ہیں وہی ہو کر جواں

ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب
کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب

پہلے اپنا سوچ لو انجام تم
دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم

ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے، مگر
اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور

اب بھی گر حالت نہ بدلی آپ کی
آپ کی بھی پھر مثل ہوگی وہی

باپ نے بیٹے کو نالائق کہا
بیٹا نالائق ہی سچ مچ بن گیا

تاکہ کہنا باپ کا جھوٹا نہ ہو
نسبت نالائقی بے جا نہ ہو

ہے پسندیدہ اطاعت باپ کی
پر نہ ایسی جیسی اس لڑکے نے کی

ہے اگر بیٹا! اطاعت اس کا نام
ایسی ناواجب اطاعت کو سلام

★

۹ - ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جن میں کچھ قدرِ قلیل
اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل

ان کو ایسوں سے نہیں ملنا روا
جو لیاقت رکھتے ہیں ان سے سوا

۵۰۹

اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں
دیکھنا لازم پہاڑ اس کو نہیں

سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر
شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر

چاہیے دن کو نہ نکلے زینہار
ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرم سار

★ ★ ★

فصل ششم

بچوں کی نظمیں

۱ - خدا کی شان

اے زمین آسمان کے مالک
ساری دنیا جہان کے مالک

تیرے قبضے میں سب خدائی ہے
تیرے ہی واسطے بڑائی ہے

تو ہی ہے سب کا پالنے والا
کام سب کا نکالنے والا

بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے
پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لیے
کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے

بات کے سننے کو دیے دو کان
بات کہنے کو تو نے بخشی زبان

دن بنایا کمائی کرنے کو
رات دی تو نے نیند بھرنے کو

آئی موسم سے تنگ جب خلقت
تو نے موسم کی دی بدل صورت

گرمیاں ہو گئیں اجیرن جب
تو نے برسات بھیج دی یا رب

سب کے گرمی سے تھے خطا اوسان
مینہ برسنے سے آئی جان میں جان

گئے جب مینہ سے لوگ سب گھبرا
حکم سے تیرے چل پڑی پچھوا
یا تو تھیں ساری چیزیں سیل رہیں
یا رہا سیل کا نہ نام کہیں
جاڑا آ پہنچا اور گئی برسات
دم کے دم میں پلٹ گئے دن رات
پھر لگی پڑنے جب بہت سردی
مشکل آسان تو نے پھر کر دی
جاڑا آخر ہوا اور آئی بہار
جنگل اور ٹیلے ہو گئے گلزار
تو یوں ہی رت پہ رت بدلتا رہا
یوں ہی دنیا کا کام چلتا رہا
کیں سدا تو نے مشکلیں آساں
تیری مشکل کشائی کے قرباں

★

۲ - بڑوں کا حکم مانو

اے بھولے بھالے بچو ، نادانو ، ناتوانو[۱]
سر پر بڑوں کا سایہ ، سایہ خدا کا جانو!
حکم اُن کا ماننے میں برکت ہے میری جانو!
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو
ماں باپ اور اُستاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک اُن کی حق میں تمھارے نعمت

---

۱ - جواہرات حالی میں یہ مصرع یوں ہے :
"اے بھولے بھالو یانو نادانو ناتوانو"
(جواہرات حالی ، صفحہ ۱) تصحیح قیاسی ہے -

کڑوی نصیحتوں میں اُن کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ کا عزیزو! مانا نہ جس نے کہنا
دشوار ہے جہاں میں عزت سے اُس کا رہنا
ڈر ہے پڑے نہ صدمہ ذلت کا اُس کو سہنا
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

دنیا میں کی جنھوں نے ماں باپ کی اطاعت
دنیا میں پائی عزت ، عقبیٰ میں پائی راحت
ماں باپ کی اطاعت ہے دو جہاں کی دولت
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

سیکھو گے علم و حکمت ، ان کی ہدایتوں سے
پاؤ گے مال و دولت اُن کی نصیحتوں سے
پھولو گے اور پھلو گے ، اُن کی ملامتوں سے
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

تم کو نہیں خبر کچھ اپنے برے بھلے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی ، اتنی ہے عقل چھوٹی
ہے بہتری اُسی میں جو ہے بڑوں کی مرضی
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں
اُس بات سے بچو تم جس بات پر وہ ٹوکیں
جھنک جاؤ دوڑ کر تم گر آگ میں وہ جھونکیں
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

جو دیں تمھیں وہ کھا لو نعمت سمجھ کے اس کو
دیں زہر بھی تو پی لو امرت سمجھ کے اُس کو

اور خاک دیں تو لے لو دولت سمجھ کے اس کو
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو
ہے کوئی دن میں پیارو وہ وقت آنے والا
دنیا کی مشکلوں سے تم کو پڑے گا پالا
مانے گا جو بڑوں کی جیتے گا وہ ہی پالا[۱]
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

★

۳ - مرغی اور اس کے بچے

شام ہے اور اندھیرے کا وقت
ہے پرندوں کے بسیرے کا وقت
اب ہے پانی کی نہ دانے کی تلاش
جس کو ہے اپنے ٹھکانے کی تلاش
رات بھر جب کہ گزر جائے گی
اور اُجالے کی گھڑی آئے گی
سنیو تم اُٹھ کے اندھیرے سے ذرا
یہ جو ہے گھر میں تمھارے مرغا
پھڑپھڑاتا ہے پر و بال کو کیا
جھاڑ دیتا ہے وہ سستی گویا
اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
چیختا[۱] زور سے ہے ''ککڑوں کوں،،
دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی
فوج بچوں کی لیے نکلے گی
تاکہ وہ صبح کا کھائیں کھانا
رات بھر کے ہیں بے آب و دانہ

---

۱ - جواہرات حالی (صفحہ ۳) ''جیتے گا وہی پالا'' درج ہے - ''وہی پالا'' مفاعیلن کا ہم وزن ہے - یہ نظم ، بحر مضارع مثمن اخرب میں ہے جس کا آخری رکن 'فاعلاتن' ہے -

چونچ سے دے گی وہ منہ میں ان کے
جو پڑے پائے گی دانے دُنکے
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ
ہے غذا ان کی یہی روزانہ
مینہ برستا ہے تو بچے سارے
آ دبکتے ہیں پروں میں ماں کے
چین سے ان میں چھپے رہتے ہیں
ماں کی چھاتی سے لگے رہتے ہیں
مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی
کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا
ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

★

۴ - بلی اور چوہا

سچ پوچھیے تو چوہوں کا بھی دم ہے ناک میں
دیکھا نا ، بلی آ ہی گئی ان کی تاک میں
چوہے ہمیں ستاتے ہیں اور بلّیاں انھیں
دم اِن سے اُن کا ، اُن سے ہمارا ہے ناک میں
دیکھا تو جا بہ جا سے وہ کترا ہوا ہے آج
آیا تھا اک لفافہ بڑا کل کی ڈاک میں
ان کے سوا تھا چور کہو اس کا اور کون ؟
تھا شہد کچھ لگا ہوا بوتل کی کاک میں
گر بلیاں نہ ہوں تو بِلیں کھود کھود کر
چوہے ملا کے چھوڑیں مکانوں کو خاک میں

بلی ادھر ہٹی اور ادھر آئے سب نکل
وہ ان کی تاک میں ہے تو یہ اس کی تاک میں

۵ - شیر کا شکار

سامنے دیکھو ہے وہ جنگل
وحشی جانوروں کا دنگل
پھرتے ہیں یاں سب توڑتے کل کل
شیر ، بگیلا ، چیتا ، چیتل
بعضے بے آزار ہیں ان میں
اور بعضے خوں خوار ہیں ان میں
دیکھنا وہ اک کھری ناہر[1]
نکلا اپنی بنی سے باہر[2]
پکڑے گا ظالم داؤں لگا کر
کوئی نہ کوئی صید مقرر
بھوک میں ہے سب کچھ کھا لیتا
بھیڑوں پہ لیکن جان ہے دیتا
بیٹھ کے ہاتھی پر بے کھٹکے
ہم بھی اب اس کے پیچھے پیچھے
آہستہ آہستہ ہیں چلتے
ہم سے کہاں جائے گا یہ بچ کے
یہ بھی شکاری ، ہم بھی شکاری
دید کے قابل ہے یہ سواری

---

۱ - کھری ناہر : نہایت زبردست شیر (ناہر ہندی میں شیر کو کہتے ہیں) - (بحوالہ Platts)

"بنی" : بن کی تصغیر کے طور پر یہ لفظ چھوٹے جنگل یا کچھار کے معنی میں ، کہیں کہیں مستعمل ہے - بحوالہ (Plattes)

لو دیکھو وہ دبکا دبکا
بھیڑوں کے ریوڑ میں جا پہنچا
شیر اور اس پر بھوک میں جھلا
کر ہی گیا اک بھیڑ کو لقما
ٹوک کے اور للکار کے اس کو
جائیں گے ہم بھی مار کے اس کو
دیکھو دیکھو غل نہ مچاؤ
چھتیا کر بندوق لگاؤ
خوب نشانہ بیٹھا ہے آؤ
گرتے ہی اس کو جا منگواؤ
کھال ہم اس کی لے کے چلیں گے
دوستوں کو سوغات یہ دیں گے

★

۶ - پیشے

(ماں سے بیٹوں کی گفتگو)

۱

میں بڑا ہوں گا جب تو اماں جان
اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان
کام جو کرنا چاہو ہے آسان
ہیں یہ آخر کسان بھی انسان
نہیں محنت سے ہوں میں گھبراتا
خالی پھرنا نہیں مجھے بھاتا
ہل چلاؤں گا بیج بوؤں گا
شوق میں کھاؤں گا نہ سوؤں گا

وقت پر جب کہ غلہ کاٹوں گا
بھائی بہنوں کا حصہ باٹوں گا

ناج سے گھر تمھارا بھر دوں گا
ان سے تم کو نچنت کر دوں گا

چھکڑے بھر بھر کے شہر جاؤں گا
ناج کے بدلے چاندی لاؤں گا

بھس کے انبار یاں لگا دوں گا
گائے بیلوں کو میں چھکا دوں گا

اتنی لایا کروں گا ترکاری
کہ نہ آئے گی پکنے کی باری

الغرض خوب سا کماؤں گا
جو کماؤں گا گھر میں لاؤں گا

کام کوئی نہ پھر رہے گا بند
میں بنا دوں گا تم کو دولت مند

۲

میں جواں ہوں گا جب تو اماں جان
اپنے جی میں یہ میں نے لی ہے ٹھان

تم نے مجھ کو اگر اجازت دی
فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

ہے بہت ہی یہ میرے جی میں امنگ
سیکھ لوں میں کہیں قواعدِ جنگ

میں نے سیکھی ہے مدرسوں میں ڈرل
ایسی ہوگی کہاں کی وہ مشکل

گو نہیں ہوں سپاہی زادہ میں
ہوں سپاہی سے پر زیادہ میں
جنگ کی ہے مہم سے کیا ڈرنا
آدمی کو ہے ایک دن مرنا
مشق بندوق کے لگانے کی
رسم ہے آج کل زمانے کی
روزمرہ کا ہے یہ خاصا کھیل
ہوئی تو کیا کبھی کبھی کی جھمیل
کام اپنا کیا کروں گا خوب
فرض اپنا ادا کروں گا خوب
حکم کی وہ کروں گا میں تعمیل
کہ نہ ہوگی ذرا بھی اس میں ڈھیل
کیا عجب ہے رسالدار بنوں
اور سواروں میں شہ سوار بنوں
فوج میں ہو کچھ آبرو میری
ہے یہ مدت سے آرزو میری
ملک میں جبکہ ہوگی میری دھاک
اونچی ہو جائے گی تمہاری ناک
پھر تو تم کو بھی اے مری اماں
سب کہیں گے رسالدار کی ماں

۳

میری جاں اور میری اماں جی
میں بڑا ہوں تو چاہتا ہے جی
گھر میں بیٹھا رہوں نہ یوں خالی
آپ کے باغ کا بنوں مالی

خود ہی اس کام سے مجھے ہے لگاؤ
کوئی مجھ کو بتاؤ یا نہ بتاؤ

کیاریاں ہر طرح کی کھودوں گا
خوب ان کی زمیں کو گودوں گا

ایسا رکھوں گا رستہ صاف ان کا
کہیں ڈھونڈا نہ پائے گا تنکا

نت نئے پھول میں اگاؤں گا
دیکھنا کیسے گل کھلاؤں گا

باغ میں اپنے نہر لوں گا میں
سر درختی میں پانی دوں گا میں

جو لگاؤں گا پود جائے گی لگ
اور پودے لگاؤں گا سو الگ

موتیا اور چنبیلی اور جوہی
روز کے روز ڈھیروں اترے گی

ہے بہت شوق تم کو پھولوں سے
روز لاؤں گا جھولیاں بھر کے

کیوں نہ آئے گی آئے دن ڈالی
جب خدا اپنے گھر کا دے مالی

کس طرح ہوگی پھر نہ خوش حالی
آپ کا باغ ، آپ کا مالی

۴

میری تو یہ خوشی ہے اماں جی
کہ بڑا ہو کے میں بنوں دھوبی

صبح اٹھتے ہی ہاتھ اور منہ دھو
فارغ اپنی ضرورتوں سے ہو

روز جایا کروں میں دریا پر
لادی کپڑوں کی بیل پر لے کر

چھوڑ دوں بیل کو وہاں چرنے
اور کام اپنا پھر لگوں کرنے

اونچے کر کر کے دست و بازو میں
کپڑے دھویا کروں چھوا چھو میں

لاؤں دھو دھو کے ایسے میں کپڑے
اُجلے ، برّاق ، صاف اور ستھرے

برف شرمائے دیکھ کر جن کو
آنکھ میں میل ہو اور ان میں نہ ہو

محنت اس طرح کر کے میں دن بھر
گھاٹ سے آؤں شام کو گھر پر

ٹھیک کر کے کلپ سے کندی[1] سے
مالکوں کو دے آؤں جلدی سے

پھر یوں ہی میلے کپڑے لا لا کر
از سر نو چڑھاؤں بھٹی پر

گھاٹ کی آج ، گھر کی کل باری
رہے یہ سلسلہ یوں ہی جاری

الغرض خوب کپڑے دھوؤں گا
نہ چراؤں گا اور نہ کھوؤں گا

نہ کبھی کام سے تھکوں گا میں
کام یہ خوب کرسکوں گا میں

کھاؤں گا اور کھلاؤں گا اماں
تم کو میں حق حلال کا لقما

---

۱ - کندی : موگری جس سے دھوبی کپڑوں کو درست کرتے ہیں ۔

۵

جب کہ ہوں گا بڑا تو اے حضرت
لوں گا کوئی پولس کی میں خدمت

کنسٹیبل[1] بنوں گا اول بار
اور پھر رفتہ رفتہ تھانے دار

پھر ہوا سامنے نصیب اگر
کوتوالی کا آئے گا نمبر

گشت کرتا پھروں گا راتوں کو
دیکھتا چوٹّوں کی گھاتوں کو

چور، اُچکے، اُٹھائی گیرے جو
پاؤں گا، باندھ لاؤں گا سب کو

میرے دل پر رہے گا چور کا داغ
جب تک اس کا لگا نہ لوں گا سراغ

بدمعاشوں کو تنگ کر دوں گا
جیل خانوں کو ان سے بھر دوں گا

جو کروں گا تو میں دل و جاں سے
راست بازی سے اور ایماں سے

نہیں کرنے کا تیرا میرا خوف
دل میں رکھوں گا بس خدا کا خوف

ہو گر اس نوکری میں خوف خدا
تو نہیں کام کوئی اس سے بھلا

۱- کنسٹیبل : سپاہی - یہ لفظ انگریزی تلفظ کے مطابق (Constable) باندھا گیا ہے -

۶

میں بڑا ہوں گا جب کہ بی اماں
ہو سکا تو بنوں گا چٹھی رساں

ڈاک خانے سے ڈاک لاؤں گا
پھرتی سے جاؤں گا اور آؤں گا

لے کے سب چٹھیوں کا میں طومار
اور لگا کر انھیں محلے وار

بانٹ آیا کروں گا نام بنام
صبح کی صبح اور شام کی شام

کارڈ ہوں یا لفافے یا پیکٹ
پارسل اور سارے پیمفلٹ[1]

لاؤں گا اپنی ذمہ داری سے
اور دوں گا بھی ہوشیاری سے

حقِ خدمت ادا کروں گا میں
غفلتوں سے بچا کروں گا میں

کام اپنا کروں گا چستی سے
نہ کہ کاہلی اور سستی سے

خط کسی کا نہ میں کروں گا تلف
نہ بنوں گا ملامتوں کا ہدف

کھاؤں گا اور کھلاؤں گا ایسی
تم کو اماں حلال کی روزی

---

۱ - پیمفلٹ : رسالہ ، کتابچہ - (Pamphlet)

۷

جب کہ اماں جوان ہوں گا میں
اک بڑھئی مستری بنوں گا میں

نہ بڑھئی وہ ، ہے جن کا نام بڑھئی
جو کہ پھرتے ہیں کہتے ''کام بڑھئی،،

بلکہ ایسا بنوں گا کاری گر
خود غرض مند آئیں جس کے گھر

آرزو یہ مری برآئے کاش
دیکھنا پھر مری تراش خراش

میں نہانی[1] سے اور بسولے سے
ایسے کتروں گا پھول اور پتے

کہ کروں گا مصوروں کو مات
رہوں مات ان کو کر کے تو ہے بات

اس ہنر میں بنوں گا میں استاد
اور کروں گا نئے نئے ایجاد

لکڑی برتا کروں گا میں نگّر[2]
آئے ، لاگت زیادہ آئے اگر

چیز گھٹیل کبھی نہ بیچوں گا
نفع سے ایسے ہاتھ کھینچوں گا

میرا سامان ہوگا سب اچھا
عمدہ سے عمدہ تحفہ سے تحفہ

کارخانہ خود اک بنا لوں گا
بیسیوں کاریگر بٹھا لوں گا

---

۱ - نہانی : کاٹنے اور چھیلنے کا ایک اوزار - (بحوالہ Platts)
۲ - نگر : ٹھوس ، بھاری ، وزنی - (Platts)

ہوگی جب ہر طرف مری شہرت
دیکھنا گاہکوں کی پھر کثرت

مستری ایک ہو اگر ہشیار
ہر جگہ اس کے مشتری ہیں ہزار

★

۷ - گھڑیاں اور گھنٹے

ہوں جس قدر آفاق میں گھڑیاں ہوں کہ گھنٹے
ہے سب کا عمل ایک، بڑے یا کہ ہوں چھوٹے

چھوٹے بھی کسی طرح بڑوں سے نہیں ہیٹے
دراصل یہ سب ایک ہی تھیلی کے ہیں بٹے

گو ایک سے آن کے نہیں ہوتے قد و قامت
طے کرتے ہیں پر سب کے سب اک ساتھ مسافت

دوپہر ہو یا رات ہو یا صبح ہو یا شام
جب دیکھیے چلنے سے سدا اپنے انھیں کام

لیتے کسی ساعت کسی لحظہ نہیں آرام
ہو جاتے اسی میں ہیں بسر عمر کے ایام

نقل و حرکت سے انھیں فرصت نہیں دم بھر
گویا انھیں جانا ہے کہیں دور مہم پر

ہر چند کہ رفتار میں اپنی نہیں مختار
پر ٹھہرنے کو اپنے سمجھتے ہیں یہ بے کار

رہتے ہیں سفر ہی میں، ہو دن یا کہ شب تار
ہٹتے نہیں پیچھے قدم ان کے دم رفتار

جب دیکھیے پاتے ہیں یہ سرگرم روانی
عمر گزراں کی کہو ایک ان کو نشانی

دم رکھتے ہیں گو جان نہیں رکھتے بدن میں
گویا ہیں، زباں گرچہ نہیں ان کے دہن میں
عادت میں نرالے ہیں انوکھے ہیں چلن میں
دیکھا یہ انھی کو کہ مسافر ہیں وطن میں
ہے جیسے کہ گردش میں زمانہ سحر و شام
ان کا وہ سفر ہے نہیں جس کا کہیں انجام

خشکی ہو گزرگاہ میں ان کی کہ سمندر
کھاڑی ہو کہ ہو جھیل، جزیرہ ہو کہ بندر
مینار کے اوپر ہوں کہ تہہ خانے کے اندر
رکھے انھیں پاس اپنے سکندر کہ قلندر
ان کو نہیں یاں اونچ کا یا نیچ کا کچھ غم
اپنی اسی 'ٹِک ٹِک' سے سروکار ہے ہر دم

کھٹکا انھیں آندھی کا نہ بارش کا خطر کچھ
نقصاں انھیں جاڑے سے نہ گرمی سے ضرر کچھ
طوفان کا کچھ خوف نہ بھونچال کا ڈر کچھ
ہوں لاکھ تغیر، نہیں پر ان کو خبر کچھ
کچھ موسم گل کی نہ خزاں کی انھیں پروا
ہیں دونوں برابر انھیں پچھوا ہو کہ پُروا

سُننا کے کھٹاکے سے کم ان کا نہیں کھٹکا
خارص ہے یہ اک یادِ خدا کے لیے لٹکا
کوڑا ہے یہ اس کے لیے جو راہ سے بھٹکا
کانٹوں میں دیا دامن دل جس نے کہ اٹکا

دیتے ہیں، سنو غور سے، ہر دم یہ دہائی
لو وقت چلا ہاتھ سے، کچھ کر لو کمائی

کیا ان کی بساط اور کہو کیا ان کی ہے اوقات
جانے دو نہیں ان میں اگر کوئی کرامات
انصاف کرو تو ہے یہی کتنی بڑی بات
جس کام کے ہیں اس میں لگے رہتے ہیں دن رات
ہیں چلنے میں تھکتے نہ ٹھٹکتے نہ مچلتے
جس راہ پہ دو ڈال اسی راہ میں چلتے

✶

۸ - دھان بونا

بوتے ہیں بتاؤ دھان کیوں کر ؟
ہم سے سنو آؤ دھیان دے کر

ہے یہ بھی سمجھ لو کام انھی کا
جو کرتے ہیں یاں زمیں کی سیوا

پہلے وہ زمیں پہ ہل چلا کر
اور مٹی تلے کی کرکے اوپر

دیتے ہیں سہاگا پھیر اس پر
کرتے ہیں زمیں کو یہ برابر

پھر دیتے ہیں چھوڑ اس میں پانی
جو دھان کی کاشت کے ہیں گیانی

پانی ہیں جب اس پہ پھیر دیتے
ہیں بیج وہاں بکھیر دیتے

ہے سہل اگرچہ دھان بونا
آسان نہیں پر اس کا ہونا

یہ دھان ہوئے کہ پان اے یار
دونوں کا ہے رکھ رکھاؤ دشوار
بس دھان کو نازک ایسا ہی جان
ہو جیسے کہ دھان پان انسان

۹ - روٹی کیوں کر میسر آتی ہے

یہ کھاتے ہو جو تم ہر روز روٹی
بتاؤ کیوں کہ ہے تیار ہوتی
اگر آٹے کی پکتی ہے تو آٹا
بتاؤ ہے کہاں سے روز آتا؟

اگر آٹا یہ گیہوں کا ہے پستا
تو پھر یہ پیسنا ہے کام کس کا
گیہوں کس طرح ہوتے ہیں میسر؟
اور آتے ہیں کہاں سے اور کیوں کر؟

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر
کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسر
یہی پہنچاتے ہیں بندوں کو روزی
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی[1]

انھی کا کام ہے ہر فصل کی کاشت
انھی کا کام ہے محنت کی برداشت
یہی بو کر بہم پہنچاتے ہیں ناج
ہے اس میں ساری خلقت ان کی محتاج

کساں اکثر ادھر کے اور ادھر کے
گیہوں لے آتے ہیں چھکڑوں میں بھر کے
جو بازاروں میں بنیے ہیں دکاں دار
وہ ان چھکڑوں کے ہوتے ہیں خریدار

گیہوں کا بھاؤ اک کر کے مقرر
دکانوں میں وہ اپنی لیتے ہیں بھر

---

۱ - مودی : غلے کا سوداگر، بنیا، بقال۔

پٹا رہتا ہے سب غلے سے بازار
جدھر دیکھو ادھر غلے کا انبار

گیہوں ہم لوگ لیتے ہیں انھی سے
روپے کے ، دو روپے کے ، دس روپے کے

تمھارا باپ ہے جو کچھ کماتا
اناج اس کا ہے وہ بھی مول لاتا

تمھاری ماں کو دے دیتا ہے لا کر
وہ ان کو چن پھٹک کر اور بنا کر

خود اپنے ہاتھ سے ہے پیس لیتی
لگا رکھی ہے اس نے گھر میں چکی

اسی چکی کا پیسا تھا وہ آٹا
چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا

وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے
کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے

جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے
عجب بندی خدا کی محنتی ہے

وہ ہے اس ہاتھ سے چکی چلاتی
اور اس سے غلہ پیہم ڈالے جاتی

جب اس کا ہاتھ تھک جاتا ہے دایاں
بدل لیتی ہے تب وہ ہاتھ بایاں

کبھی گھبرا کے دل ہی دل میں اپنے
خدا کا نام وہ لگتی ہے جپنے

کبھی دل کو خدا سے لو لگا کر
تسلی دیتی ہے وہ گیت گا کر

جب آٹا پیس چکتی ہے تو گویا
سمجھتی ہے بڑا گڑھ میں نے جیتا

پھر آٹا چھان کر بھوسی جدا کر
اسے بھرتی ہے مٹکے میں اٹھا کر

لگی پھر گوندھنے آٹا جھپاجھپ
اور اس میں مارنے مُکّی شپاشپ

وہ یوں آٹے کو ہے دیتی ٹُچکتی[1]
کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی

جب آٹا گوندھ چکتی ہے تو لے کر
توا ، دیتی ہے رکھ چولھے کے اوپر

بناتی ہے گندھے آٹے کے پیڑے
کہ ہو جس طرح سے جلدی نبیڑے

وہ جھپ جھپ پھر پکا لیتی ہے روٹی
چپاتی خواہ ہلکی خواہ موٹی

ذرا دیکھو تو کوئی اس کی پھرتی
توے پر دم میں ڈالی اور الٹی

پکا کر ، ریندھ کر ، کھا کر ، کھلا کر
ہوئے جھوٹے جو باسن ، دھو دھلا کر

لیا کچھ اور گھر کا کام دھندا
یہی ہے اس کا صبح و شام دھندا

---

۱ - جواہرات حالی اور مثنویات حالی (نسخۂ فاضل) میں اسی طرح چھپا ہے -

کبھی ایندھن نہیں ہوتا میسر
تو لے کر وہ طباق آٹے کا سر پر

پہنچتی ہے بچاری سیدھی تندور[1]
نہیں جو اس کے گھر سے کچھ بہت دور

وہ بھٹیارا جو ہے تندور والا
سب آٹا اس سے پکواتے ہیں لا لا

لگا رہتا ہے صبح و شام تانتا
اک آتا ہے دکاں پر ایک جاتا

وہ باندھے بیٹھا رہتا ہے لنگوٹی
لگاتا ہے بہت پھرتی سے روٹی

گھڑی، ہاتھوں پہ پھیلائی، بڑھائی
رفیدے[2] پر دھری اور چٹ لگائی

دکھاتا ہے وہ یوں ہاتھوں کے انداز
کہ جیسے کوئی پھرتیلا پٹے باز

وہ ہے یوں پیٹتا پیڑوں کو پیہم
کہ گویا ٹھونکتا ہے پہلواں خم

اترتی روٹیاں ہیں باری باری
وہ گرما گرم سوندھی اور کراری

اتر سب روٹیاں جب آئیں پک کر
تو دسترخوان سے لاتی ہے ڈھک کر

---

۱ - تنور کو عام بول چال کے مطابق ''تندور'' باندھا گیا ہے۔

۲ - رفیدہ : گول گدی جس پر روٹی رکھ کر تنور میں لگاتے ہیں۔

ادھر تم ساری بہنیں اور بھائی
ہو اس دھن میں کہ آئی ماں اب آئی

تکا کرتے ہو بھوکے راہ ماں کی
سمجھتے کچھ نہیں پر چاہ ماں کی

وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت
نہیں ملتی اسے مرنے کی فرصت

یہی رہتا ہے دن رات اس کو رونا
پکانا ، ریندھنا ، سینا ، پرونا

رندھی رہتی ہے تم بچوں میں دن رات
کرے بھی تو کسی سے کیا کرے بات

نہ ہوش اچھے کا اس کو اور برے کا
نہ ہدڑا پہننے اور اوڑھنے کا

کہیں پڑ رہنا ، فارغ جب کہ ہونا
کوئی سونے میں داخل ہے یہ سونا ؟

ڈھلا دن اور چڑھا سر کھانے کا فکر
تمھارے باپ کے گھر آنے کا فکر

سویرے کا وہ نکلا نکلا گھر سے
پھرے گا شام کو جب کام پر سے

تو اس کو دیکھتے ہی آپ سے آپ
بڑے اور چھوٹے ہو جائیں گے چپ چاپ

قدم رکھے گا جوں ہی گھر کے اندر
سنبھل بیٹھو گے تم سب اس سے ڈر کر

اور اماں چھوڑ کر پھر سوئی تاگا
لگے گی لینے اس کا آگا تاگا

وہ سستانے نہیں پاتا کہ لا کے
بچھا دیتی ہے دسترخوان آ گے[1]
گھڑی تم کو کھڑی جھلتی ہے پنکھا
گھڑی پانی پلاتی ہے وہ لا لا
دیے جاتی ہے تم سب کو وہ سالن
رہے اپنے لیے گو کچھ نہ لاون[2]
جو بچ رہتی ہے پیچھے ہڈی بوٹی
لگا کر اس سے کھا لیتی ہے روٹی
اسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب
نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہے مطلب
اگر کھانے میں آئی تم کو لذت
تو سمجھو لگ گئی نیگ اس کی محنت
نہ پکّا گر مزے کا تو نگوڑی
ہوئی جاتی ہے دل میں تھوڑی تھوڑی
بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے ؟
نہ کھائے آپ اور تم کو کھلائے
تمھیں کیا فکر ان جھگڑوں کا بھائی
کہ ملتی ہے تمھیں پکی پکائی
پکانے سے نہ پکوانے سے مطلب
اگر ہے تم کو تو کھانے سے مطلب
ذرا سی دیر کھانے میں اگر ہو
تو تم رو رو کے گھر سر پر اٹھا لو

---

۱ - جواہرات اور مثنویات (نسخہ فاضل) میں "آکے" درج ہے - تصحیح قیاسی ہے -
۲ - لاون : کوئی چیز جو ذائقے کے لیے سالن کے طور پر استعمال ہو - (بحوالہ Platts)

نہ الفت باپ کی تم جانتے ہو
نہ ماں کی مامتا پہچانتے ہو
نہ ان کی محنتوں کی ہے خبر کچھ
نہ ان کی جاں فشانی پر نظر کچھ
نہیں کر سکتے حق ان کا ادا تم
کرو ان پر سے گر جاں بھی فدا تم
دل و جاں سے کرو تم ان کی عظمت
بجا لاؤ ادب سے ان کی خدمت
سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت
کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت
تمھیں محنت سے پالا اور پوسا
ستایا تم نے پر اس نے نہ کوسا
سبق ماں باپ سے یہ سیکھ رکھو
بڑے ہو کر یہی کرنا ہے تم کو
مزا جب ہے کہ ہاتھ ان کا بٹاؤ
بڑے ہو کر تم ان کے کام آؤ
کبھی ہونا نہ تم سست اور کاہل
لگانا اپنے اپنے کام میں دل
نہ ڈھیلی چھوڑنا تم اپنی ڈوری
سمجھنا جی چرانے کو بھی چوری

★

۱۰ - موچی

چمڑا مول منگاتا ہوں دھو کے اسے سکھلاتا ہوں
مل کر نرم بناتا ہوں یوں چمڑے کو کماتا ہوں
میں موچی کہلاتا ہوں

ہنّے ونّے کاٹ کٹا کرتا ہوں خوب اُن کو صفا
پھر لے پنا اور تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
یوں کام اپنا بناتا ہوں

پھر جوتی قالب پہ چڑھا ٹھوک ٹھکا اور کوٹ کٹا
رانپی[1] سے بُرشا کے تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
پھر کام اور لگاتا ہوں

چاہیے گر اندھا گھوڑا میری دکاں کا لو جوڑا
پھر درکار نہیں کوڑا جتنا چلاؤ ہے تھوڑا
مضبوط ایسا بناتا ہوں

اوروں کی سی یاں نہیں لوٹ جانیو میری بات نہ جھوٹ
سال کے اندر میرا بوٹ میں ضامن جو جائے ٹوٹ
اس کی شرط لگاتا ہوں

بابو ہو یا ہو لالہ گورا ہو یا ہو کالا
بوڑھا ہو یا ہو بالا ادنٰی ہو یا ہو اعلٰی
سب کا حکم بجاتا ہوں

★

۱۱ - چٹھی رساں

لو وہ دیکھو آ رہا ہے ڈاکیا
منتظر تھا جس کا ہر چھوٹا بڑا
ہے اسی جانب کو سیدھا اس کا رخ
خط تمھارا ہوگا یا شاید مرا
پوچھتا ہے اس سے ہر اک اپنا خط
نام بتلاتا ہے اپنا اور پتا

---

۱ - ایک اوزار جس سے موچی چمڑے کو تراشتے اور صاف کرتے ہیں - (بحوالہ Platts)

دیکھتا ہے وہ لفافہ غور سے
دیتا ہے پڑھ پڑھ کے، ہے لکّھا پڑھا

یہ تو بتلاؤ خطوں کا اتنا ڈھیر
اس کو کیوں کر اور کہاں سے مل گیا؟

دیکھتے ہو روز کیفیت یہ تم
پر نہیں رکھتے خبر اس کی ذرا

رات کو سوتے تھے جب ہم، ایک شخص
جا رہا تھا اس طرف سے دوڑتا

تھے کمر سے اس کی کچھ گھنگھرو بندھے
تا کہ سب جانیں کہ ہے یہ ڈاکیا

ہر قدم پر دوڑتا تھا جب کہ وہ
گھنگھروؤں کی اس کے آتی تھی صدا

کہتے ہیں ہرکارہ جس کو تھا وہی
تم نے بھی یہ نام شاید ہو سنا

وہ چلا تھا لے کے ڈاک اس شہر کی
آ کے دم یاں ڈاک خانے میں لیا

تھیلیاں تھیں ایک تھیلے میں کئی
جن سے تھا وہ ڈاک کا تھیلا بھرا

تھیلیوں میں تھے بھرے پیکٹ تمام
تھا کوئی دھولا تو کوئی زرد تھا

تھا غرض جو بوجھ اس کے پاس سب
ڈاک منشی کے حوالے کر دیا

شام تک اب اس کو ہوش آئے تو آئے
وہ تو ایسا ہو کے بے دم جا پڑا

اور ادھر وہ تھیلیاں جھٹ پٹ سنبھال
ڈاک منشی نے سنو اب کیا کیا

کھول کر سب کر لیے پیکٹ الگ
اور خط بھی رکھ لیے کر کے جدا

بانٹنے کو ڈاک پھر دے دی تمام
ڈاک کے چٹھی رسانوں کو بلا

ڈاک میں میرا بھی اک آیا ہے خط
اوہو! یہ تو خط ہے میرے دوست کا

پڑھ کے خط تو ہوگی جو ہوگی خوشی
پہلے آنکھوں سے تو لوں اس کو لگا

دوست کے پاس آئے نامہ دوست کا
اس خوشی سے ہے زیادہ اور کیا

اب پڑھوں گا جا کے اطمینان سے
گھر میں اپنے بیٹھ کر سب سے جدا

★

۱۲ - سپاہی

سنا بھی یہ آواز کیا آ رہی ہے؟
بگل کی برابر صدا آ رہی ہے

چلو اٹھو بندوق کندھے پہ رکھو
کہ وقت آ گیا دور جانا ہے تم کو

ہلے ہاتھ ہرگز تمھارا، نہ شانہ
جہاں چاہو واں جا کے بیٹھے نشانہ

نظر چاہیے تیز ایسی تمھاری
ہو گویا کہ اس وقت تم اک شکاری

قدم ہو جنچا ایسا جیسے ہرن کا
سمجھ لو کہ ہے بس یہی وقت رن کا
کبھی فتح مندی کا دعویٰ نہ کیجے
کہ چلتے نہیں اس میں دعوے کسی کے
جو ذکر ایسی باتوں کا کرتے ہیں اکثر
ظفر مند انھیں ہوتے دیکھا ہے کم تر
بڑی بات یہ ہے تم اس کو سمجھ لو
کہ فرض اپنا جو ہے بجا لاؤ اس کو

★

۱۳ - ایک چھوٹی بچی کے خصائل[۱]

سیّدہ کیسی پیاری بچی ہے
صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ذرا دیکھو تو اس کی صورت کو
سچی چینی کی جیسی مورت ہو
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان
پر سب اچھے برے کی ہے پہچان
ماں نے جو کچھ اُسے سکھایا ہے
جو ادب قاعدہ بتایا ہے
وہ سبق سارے اُس کو ہیں از بر
نقش ایک ایک بات ہے دل پر
ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام
سب کو کرتی ہے ہاتھ اُٹھا کے سلام

---

۱ - ''ممتاز فاطمہ عرف 'سیدہ خاتون' جو آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی بچی ہے، اُس سے مولانا کو بہت محبت تھی - مولانا نے اس پر ۱۹۰۹ع میں جب کہ سیدہ کی عمر ڈھائی سال کی تھی، یہ نظم لکھی تھی -'' (جواہرات حالی، صفحہ ۱۹)

پھر ادب سے وہیں سلام کے ساتھ
پوچھتی ہے مزاج جوڑ کے ہاتھ

جھوٹ موٹ اس کو گر ڈراتے ہیں
بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں

پکے پن سے یقیں نہیں کرتی
دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

وہ کسی بات پر مچلتی نہیں
اپنی عادت کبھی بدلتی نہیں

ایک بیماری سے تو ہے لاچار
ورنہ روتی نہیں کبھی زنہار

ایسی کم عمر بے سمجھ ہو کر
دودھ بھی مانگتی نہیں رو کر

بے پیے دودھ جب نہیں سرتی[1]
ہے وہ ماں کی خوشامدیں کرتی

کبھی کہتی ہے پیار سے ''اماں!،،
اور کبھی ڈالتی ہے گل بیّاں

کوٹ کوٹ اس میں ہے بھری غیرت
اس کو کوئی گھرک دے کیا طاقت

ماں نے جھوٹوں کبھی جو گھور دیا
اس نے سچ مچ وہیں بسور دیا

ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی
اس کے تیور ہے دیکھتی رہتی

جب ذرا دیکھتی ہے چپ ماں کو
بار بار اس کو کہتی ہے ''بولو!،،

---

۱ - جواہرات حالی میں یہ مصرع اسی طرح چھپا ہے - (مرتب)

ماں یہ سن کر اگر ذرا ہنس دی
پھر کوئی دیکھے اُس کی آ کے خوشی

ہنستی ہے اور کِھل کھلاتی ہے
بچی پھولی نہیں سماتی ہے

چاہنے والے اُس کے ہیں جو جو
خوب پہچانتی ہے ایک اک کو

پھوپھیوں سے تو ہے لگاؤ بہت
گھر کا خالاؤں کے ہے چاؤ بہت

ہے چچاؤں کے نام کی عاشق
اُن کے کلمے کلام کی عاشق

غور سے اُن کا پڑھنا سنتی ہے
اور سن سن کے سر کو دھنتی ہے

ختم ہو چکتے ہیں جب اُن کے بول
کہتی ہے بار بار "ابا اول"

آرزو تو بہت ہے بولنے کی
پر نہیں اٹھتی ہے زبان ابھی

یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زباں
جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوں غاں

پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار
ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار

نہیں مُنہ سے نکلتے پورے بول
بولتی ہے سدا ادھورے بول

لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب
زرگری اپنی بولتی ہے جب

ننھے آتے ہیں گھر میں جب مہماں
دیکھ دیکھ اُن کو ہوتی ہے خنداں

پا کے بیٹھا ادھر اُدھر سب کو
دیکھتی ہے مٹر مٹر سب کو

اوپری شکل سے ہے گھبراتی
ہے مگر جلد سب سے ہِل جاتی

ہیں جو ماں جائے بھائی اور بہن
یوں تو ہے سب کی اس کے دل میں لگن

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو
کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں

پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا
اور وہیں اُس نے ہاتھ پھیلایا

جا لپٹتی ہے دوڑ کے ماں سے
بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

عمر اس کی خدا دراز کرے
علم سے اُس کو سرفراز کرے

چڑھیں ماں باپ کی سلامتی میں
سارے پروان بھائی اور بہنیں

۱۴ - نیک بنو ، نیکی پھیلاؤ[۱]

سچ بولو سچے کہلاؤ
سچ کی سب کو رِیس دلاؤ

---

۱ - یہ نظم اب تک کلام حالی کے کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی - ''بچوں کا اخبار'' لاہور، شمارہ ماہ جولائی ۱۹۰۵ع میں یہ نظم ''ریس'' کے عنوان سے چھپی تھی ، اُس پرچے سے یہاں نقل کی گئی ہے -
(مرتب)

جب اوروں کو راہ بتاؤ
خود رستے پر تم آ جاؤ
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو ، نیکی پھیلاؤ

ہو گی تم میں گر ستھرائی
سب سیکھیں گے تم سے صفائی
ہمسائے کی دیکھ بھلائی
چھوڑتے ہیں ہمسائے برائی
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو ، نیکی پھیلاؤ

ہے جس گھر میں ایک بھی اچھا
واں نہ رہے گا نام برے کا
تم بھی چلن دکھلاؤ کچھ ایسا
جس سے ہو سارے جگ میں اجالا
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو ، نیکی پھیلاؤ

گاؤں میں آیا ایک جواری
اس نے بگاڑی بستی ساری
کام میں عزت ہو یا خواری
لوگ کریں گے ریس تمہاری
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو ، نیکی پھیلاؤ

جو پڑھنے میں کرتے ہیں محنت
سیکھتی ہے شوق ان سے جماعت
ہوتی ہے جن کو کھیل کی عادت
دیتے ہیں سب کو کھیل کی رغبت

قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

محنت کرکے جو ہیں کماتے
سب کو محنت وہ ہیں سکھاتے
جو نہیں ہاتھ اور پاؤں ہلاتے
سب کو اپاہج وہ ہیں بناتے

قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

رحم ہے سب کو رحم سکھاتا
ظلم ہے سب کو ظلم سجھاتا
نیک ہے نیکی سب کو بتاتا
بد اوروں کو بد ہے بناتا

قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

★ ★ ★

صحت نامۂ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۶ (مقدمہ)	۱۶	خیال	خیالات
۱ (حاشیہ)	آخری	اولاد سے	اولاد میں سے
۷	۶	'بھلے'	مجھلے
۱۱ (حاشیہ پہلی)		ماہورا	ماہوار۔
۱۸	۱۰	نظر	نذر
۲۵	۸	سب کر	سب کو
۳۹	۱۳	مل نشیں	محمل نشیں
۵۳	۲۰	احباب سے	احباب نے
۷۵	۳	کیجیے کی قدر	کی قدر
۸۰	۶	کے مسجد سے	آکے مسجد سے
۸۷	۶	چھا رہا	چھا رہا ہے
۹۷	۶	ے عندلیب	اے عندلیب
۹۹	۶	نھی باتوں	انھی باتوں
۱۰۹	۱۱	نکلتے تھے	آ نکلتے تھے
۱۱۲	آخری	رنگیں تھی پس بیانوں	رنگیں بیانوں
۱۱۴	۲۴	دل نہیں بھلا	دل نہیں ملتا
۱۴۹	۹	ہاں رام ہوتا ہے	جہاں رام ہوتا ہے
۱۶۹	۸	پانڈے	پانڈے (۱)
۱۷۳	۸	آے	آپے
۱۷۴	۶	نشب	نشیب
۱۷۶	۱۰	ے ہاتھ لگاے	بے ہاتھ لگائے
۱۷۸	۲	سخن کو	سخن کو (۱)
۱۷۸ (حاشیہ)	۷	ز ن	رکان :
۱۸۵	۷	بد چای	بد چلنی
۱۸۶	۸	گد گری	گداگری
۱۸۹	۱۵	کہار کے	کہا روکے
۱۹۲	۱۰	چھا کیا	اچھا کیا

۲۰۰	۲۲	طعنہ و تشنیح	طعنہ و تشنیع
۲۱۵	۲۰	حق	ناحق
۲۱۶	۲	۱۸۷۲ء	۱۸۷۴ء
۲۱۶	۶	گلی میں جا	گلی میں جانا
۲۱۸	۱	۱۸۷۲ء	۱۸۷۴ء
۲۳۵	۱۴	اے قوت	اے وقت
۲۳۹	۱۹	سد	سدا
۲۴۵	۷	مکتب اطفال	مکتب اطفال
۲۵۹	۵	شچمہ	چشمہ
۲۸۶	۱۵	۱۸۷۴ء	۱۸۷۷ء
۲۸۵	۱۴	پر کہ و	کہ ہو
۳۱۹	۱۴	بڑھانا	پڑھانا
۳۳۷	۱۰	یہ ٹاؤ	یہ ناؤ
۳۷۰	۱۳	ی	جی
۳۸۲	۹	تنے میں	اتنے میں
۳۸۴	۲۰	میری تکیہ گاہ	مری تکیہ گاہ
۳۹۱	۴	نکل ئیے	نکل جائیے
۳۹۶	۴	سید بطحی کے ہمم راہی	سیدابطحی کے ہم راہی
۴۲۴	۱	نشو و	نشو و نما
۴۳۱	۱	رہتے	رکھتے
۴۵۰	۱۴	صد	صدا
۴۸۳	۴	بے بس تھے اور	بے بس اور
۵۰۸	۱۹	۹ -	۱۲ -
۵۱۴	۱۹	مانوں	مانو
۵۲۳	۱۲	ہاٹ	گھاٹ
۵۲۸	۱۹	سمن ا	سمرن
۵۲۸	۲۰	خار ص	خاصا
۵۳۶	۸	دمت	خدمت
۵۳۶	۱۲	کسو	کوسا